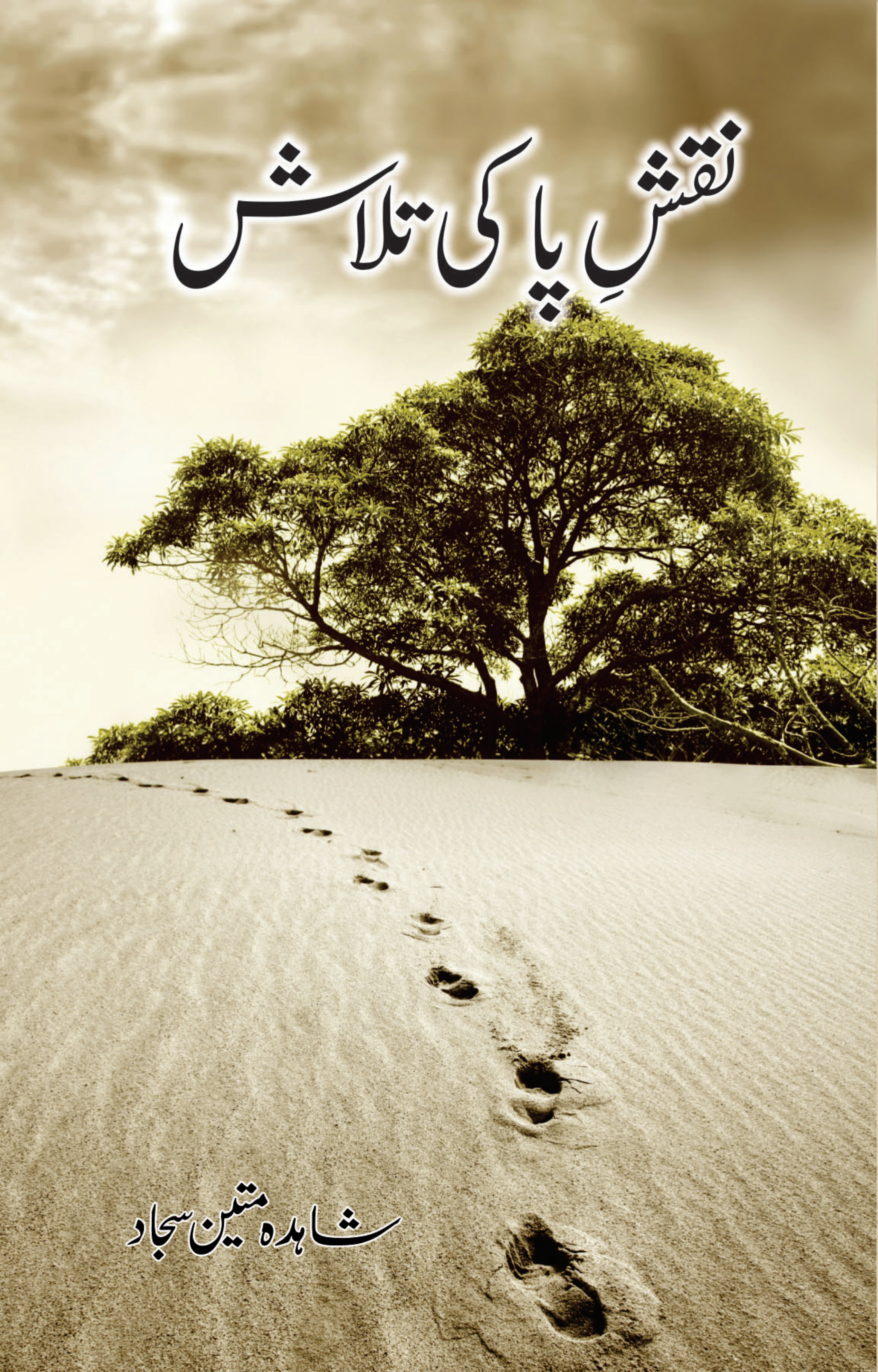
نقشِ پا کی تلاش



شاہدہ متین سجاد

نقشِ پا کی تلاش

شاہدہ متین سجاد

نام کتاب	:	نقشِ پا کی تلاش
ادیبہ	:	شاہدہ متین سجاد۔سویڈن
سنِ اشاعت	:	2012ء
تعداد	:	1000
پتہ	:	Nattviols Gatan 3 417 20 Gothenburg, Sweden

Printed in India by
Krishan Enterprises
00-91-9815617814 , 9872341117
khursheedkhadim4@gmail.com

انتساب

❁

''ہمیشہ چاہنے والی پیاری ماں اور بے حد پیار کرنے والے ابّا جی کے نام''

جن کے ان گنت احسانات ہم کبھی نہ بُھلا سکیں گے

جنہوں نے ہمیشہ ہمیں لکھنے کی اور خدمت دین کی تلقین کی

رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

❁❁

پیش لفظ

اپنی تربیت اور آئندہ نسلوں کی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اپنے آباء کے حالات کا علم ہو۔ جو قومیں اپنے آباء کا شاندار ماضی یاد رکھتی ہیں وہ اپنی آئندہ نسلوں کو نیکیوں پر قائم رکھتی ہیں۔

محترمہ شاہدہ متین صاحبہ اہلیہ مکرم سجاد احمد صاحب نے ''نقشِ پا کی تلاش'' کے نام سے کتاب مرتب کی ہے۔ خاکسار نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں محترمہ نے اپنے آباء کا ذکر کیا ہے جنہوں نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی اور صحابہؓ کا مقام پایا۔ یہ بزرگ سیالکوٹ شہر کے رہنے والے تھے اور جس محلہ میں وہ رہتے تھے اس کا نام ''صحابیوں کا محلہ'' پڑ گیا۔ اس کتاب میں محترمہ نے مولانا نذیر احمد مبشر مبلغ سلسلہ افریقہ کا بھی ذکر خیر کیا ہے جو ان کے ماموں تھے۔ حضرت مولانا صاحب غانا میں مبلغ رہے۔ بڑے مشکل حالات میں انہوں نے تبلیغِ دین کا فریضہ ادا کیا۔ بڑے ایمان افروز واقعات درج کئے ہیں۔

محترمہ نے اپنے والدین کا بھی ذکر کیا ہے یعنی محترم ڈاکٹر بشیر احمد صاحب اور محترمہ مبارکہ قمر صاحبہ کا۔ محترم ڈاکٹر صاحب اوّلین درویشوں میں سے تھے۔ بیوی بچوں کو پاکستان میں چھوڑ کر قادیان میں بطور درویش رہے۔ بعد ازاں ربوہ منتقل ہو گئے۔ ان کی والدہ محترمہ بھی جماعت کی بڑی فعّال رکن تھیں۔ درویشی کے زمانہ میں یہ صدر لجنہ اماءاللہ بھارت رہیں۔ قادیان میں رہائش کے دوران اور پھر ربوہ میں بھی جماعت کی بھرپور خدمت کی توفیق پائی۔ بڑی اچھی مقررہ تھیں۔

کتاب میں مکرم عبدالحق رامہ صاحب سابق ناظر بیت المال کا بھی ذکر خیر کیا گیا ہے۔ باقی اقرباء کے علاوہ اپنے نوجوان چچا مکرم نذیر احمد صاحب واقف زندگی (جو تحریک جدید کے پہلے شہید تھے) نیز محترم محمد احمد صاحب واقف زندگی کے حالات بھی لکھے ہیں۔

کتاب کے آخر پر اُنہوں نے اپنے بہنوئی مکرم رفیق احمد فوزی صاحب مرحوم اور دوسرے بہنوئی مکرم رشید احمد صاحب مرحوم سابق پریس سیکرٹری یو کے کی یادوں کو سمیٹا ہے اور اس کے

علاوہ محترم مکرم حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی محبت بھری یادوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

محترمہ نے ہر بات مستند ذرائع کے حوالہ سے لکھی ہے۔ کتابوں، رسالوں اوراخباروں کے حوالہ جات سے واقعات لکھے ہیں۔ تحقیق کی غرض سے انڈیا اور پاکستان کا سفر بھی اختیار کیا اور انٹرویو لئے ۔ ماشاء اللہ بڑی اچھی تحقیق ہے ۔ بڑی محنت سے مواد اکٹھا کیا گیا ہے ۔ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔

اللہ تعالیٰ محترمہ شاہدہ متین صاحبہ کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے ہمارے لئے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ایک بے بہا خزانہ تیار کیا ہے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

خاکسار

محمود احمد شمس واقف زندگی

سابق امیر جماعت احمدیہ سویڈن

۲۸ جون ۲۰۱۱ء

فہرست مضامین

عرضِ حال

یہ مضمون لکھنے کی غرض اپنے والدین اور بزرگوں کی یادیں تازہ کرنا اوران کی باتوں کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کو پڑھنے کی توفیق عطا کرے۔

مجھے اپنے بزرگوں سے ہمیشہ سے ہی بہت لگاؤ رہا ہے۔ بچپن سے ہی مجھے امی اور ابا جی سے حد سے زیادہ تعلق رہا جس کا اظہار کبھی تو مَیں نے ان کی چھوٹی چھوٹی خدمات کر کے کیا اور کبھی خاموش دعا سے۔ امی اور ابا جی ہمیں لکھنے کی تلقین کیا کرتے تھے لیکن سُستی غالب آتی رہی۔ ابا جی کی وفات کے بعد میرے دل میں شدّت سے یہ تحریک پیدا ہوئی کہ میں ان کے حالاتِ زندگی لکھوں لیکن جذبات غالب آجاتے اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ مدت دراز تک مجھے ان کے ذکرِ خیر تحریر کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔

امی کی زندگی میں مَیں ان سے اکثر درخواست کیا کرتی تھی کہ وہ ابا جی کے حالات لکھ دیں مگر وہ لکھنے سے قاصر رہیں۔ 1991ء کی بات ہے کہ امی جان میرے ہاں سویڈن تشریف لائیں۔ یہاں چند ہفتے ان کا قیام تھا۔ اس دوران مجھے ایک ترکیب سوجھی کہ کیوں نہ ان کی آواز ٹیپ کر لی جائے۔ ایسے کام کے لئے وقت اور صبر چاہیئے چنانچہ اس کام کو میرے میاں محترم سجاد احمد صاحب نے سرانجام دیا۔ وہ امی سے مختلف سوال پوچھتے اور ان کی آواز ٹیپ کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

پھر ایک طویل عرصہ گزرا میں نے چچا مکرم ظہور احمد صاحب کی خدمت میں متعدد سوالات لکھ کر بھیجے اور ان سے اپنے آباء کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ چچا جان میرے سوالات کا مکمل جواب نہ دے پائے مگر ان کے خطوط سے کسی قدر آگہی ضرور ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزاء دے۔

ایک نصیحت، جو اُنہوں نے مجھے لکھی وہ، قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے مجھے یوں لکھا:

”یہ خط یونہی ایک دفعہ پڑھ کر رکھ نہ دینا۔ تم اپنے ابا جی پر ریسرچ پیپر لکھ رہی

ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری محبت کا رنگ اس میں بھر دے۔''

اس نصیحت نے مجھے مزید طاقت عطا کی اور مَیں نے اپنے بزرگوں کے حالاتِ زندگی لکھنے کا بھرپور عزم کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہمارے تقریباً تمام بزرگ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ایک دو بزرگ جو زندہ تھے ان کی یادداشت اس قابل نہ تھی کہ ان سے مَیں اپنے آباءواجداد کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھی کر سکتی۔ اس سلسلہ میں مَیں نے اپنے عزیز و اقارب کی مدد چاہی مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ میرے لئے بڑی مشکل یہ تھی کہ مَیں وطن سے بہت دور تھی۔ امی کی ہم عصر خواتین اس وقت تک یا تو بہت بوڑھی ہو چکی تھیں یا پھر ربوہ سے نقل مکانی کر چکی تھیں۔ ان تک پہنچنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ ان کے بارے میں کسی کا بیان لینا بہت مشکل مرحلہ تھا۔ ہمارے والدین کی وفات ہو چکی تھی۔ اپنے آبائی گھر کے ایک حصّہ کے علاوہ باقی کرایہ پر دے دیا گیا تھا اور جو کتابیں یا تحریریں ہمارے والدین کی وہاں تھیں وہ نہ جانے کہاں محفوظ کر دی گئی تھیں جن کا ڈھونڈنا بہت مشکل امر تھا۔ مَیں نے تھوڑا سا لکھا پھر ہمت ٹوٹ گئی اور دو سال یونہی گذر گئے۔ پھر ایک دن میری بہن نبیلہ کے ہمت بندھانے پر مَیں نے یہ کام ازسرِنو شروع کیا۔

سوائے ایک بہن کے تمام بہن بھائی ملک سے باہر آباد ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی ربوہ کی بستی میں نہ رہتا تھا۔ خلافت لائبریری یا کسی اور طریقہ سے حوالے ڈھونڈنا آسان نہ تھا۔ مَیں نے حوالہ جات ڈھونڈنے کے لئے مختلف احباب کو خطوط لکھے۔ اکثریت نے جواب ہی نہ دیا مگر بھلا ہو ان کا بھی جنہوں نے معذرت کا مکتوب بھیج دیا۔ پھر مَیں نے قادیان کا سفر اختیار کیا۔ میرے والد ابتدائی درویش تھے اور انہوں نے اس کٹھن وقت کی سختیاں سہہ کر ہمارے لئے مشعل روشن کی تھی۔ پھر امی نے بھی وہاں درویشی کی زندگی گذار کر اور خدمتِ دین کر کے خلیفۂ وقت کی دعائیں لی تھیں۔ جب مَیں قادیان گئی تو میری ملاقات کئی درویشوں سے ہوئی مگر افسوس مَیں تمام درویشوں سے نہ مل سکی۔ محترم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب اور ان کی بیگم کے تعاون کا شکریہ نیز ان تمام درویش بھائیوں اور بہنوں کا شکریہ

جنہوں نے میرے ساتھ میرے والدین کی یادوں کو دوہرایا۔ان کے علاوہ جماعت کے احباب اور خواتین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میرے بزرگوں کے لئے قلم اٹھایا۔عزیزم شیخ مظہر، جس کو خدمتِ خلق کی بہت توفیق ملتی ہے، کے تعاون کا بھی بہت بہت شکریہ۔

میری چھوٹی بہن امۃ الآخر اور بہنوئی محترم حلیم بھائی کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ وہ نہایت گرمی کے موسم میں اسلام آباد سے ربوہ گئے۔ امۃ الآخر نے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد دفتر مصباح سے امی اور ابا جی کے مختلف مضامین اور حوالے نکال لئے۔خالد بھائی، ثمینہ خالد کے خاص تعاون کے لئے ممنون ہوں نیز ان کے بیٹے عزیزم خالد ولید کو اور اس کے مربی دوست کو اللہ تعالیٰ بہت جزاء دے جنہوں نے خلافت لائبریری سے چند حوالے تلاش کر کے مجھے بھیجے۔نبیلہ رفیق فوزی ناروے، طاہرہ بشریٰ کینیڈا، محترم خالد اختر صاحب وخالد منیر لندن، عزیزہ مہرین ولید لندن، محترم سفیر الحق رامہ، رفیعہ کریم واشنگٹن، نادرہ یاسمین، عبدالحمید رامہ اور ماہم رامہ جرمنی، ناصرہ رشید لندن، چوہدری رحمت علی صاحب کیلیگری، محترمہ سلیمہ اہلیہ عبدالسلام صاحب قادیان، محترم سجاد صاحب، محترم داؤد بھائی کینیڈا، محترم منیر احمد مبشر ربوہ، نیز اپنے تینوں بچوں عزیزم رمیز شافی، عزیزہ رافعہ اور عزیزم باسط رحمان کے صبر وحوصلے اور معصومانہ تعاون کا بہت شکریہ۔اس کتاب کی کتابت مَیں نے خود کی ہے۔مَیں جو کہ طفلِ مکتب ہوں اپنی تمام خطاؤں اور غلطیوں کے لئے معذرت چاہوں گی۔آخر میں مکرم فضل الٰہی انوری صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے کمال شفقت سے مجھے چند واقعات بھجوائے۔فَجَزَاھُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنَ الۡجَزَاء۔

آپ سب قارئین کی دُعاؤں کی متمنی ہوں۔اللہ تعالیٰ میرے اس کام میں برکت عطا فرمائے اور ہمارے بزرگوں کے درجات بلند فرمائے نیز ہمیں ان کی نیکیاں اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام طالبہ دُعا

شاہدہ متین سجاد، سویڈن

اظہارِ تشکر خاص

مجھ جیسی نالائق، کم علم، کم تجربہ اور طفلِ مکتب کے لئے یہ مضمون لکھنا بہت مشکل تھا۔ جب یہ مضمون لکھا جا چکا تو درستی کے لئے اس وقت کے امیر سویڈن محترم محمود احمد شمس صاحب کو درخواست کی گئی۔ انہوں نے بہت محنت سے تصحیح فرمائی اور عاجزہ کو کہا:

''اس کتاب کو لکھ کر آپ نے آئندہ نسلوں کی خدمت کی ہے اور تاریخ محفوظ کی ہے۔ مَیں کتاب کو پڑھنے کے دوران کئی مرتبہ اشکبار ہو گیا۔ بعض واقعات بہت ایمان افروز ہیں۔ اس کتاب کو ضرور چھپوائیں اور جماعت کے مختلف اداروں کو بھیجیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزا دے گا۔''

اس مضمون کو مَیں نے مزید لکھا۔ کافی طویل ہو گیا۔ اب مجھے شمس صاحب کو دوبارہ دیتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوئی۔

ایک دن مجھ پر اللہ تعالیٰ کا عجب فضل ہوا۔ محترم مکرم فضل الٰہی انوری صاحب (جرمنی)، جو کہ بہت بڑے ادیب ہیں اور کئی کتب تصنیف کر چکے ہیں، نے میرے مضمون کی نظر ثانی کے لئے پیشکش کر دی۔ مجھ غریب کو اور کیا چاہئے تھا۔ مَیں نے فوراً ان کو اپنا مضمون بذریعہ ای میل بھیجا۔ صحت کی کمزوری اور بڑھاپے کے باوجود نہایت محنت سے انہوں نے درستی کی اور مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کیا نیز قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔ کتاب کے بارے میں فضل الٰہی صاحب نے مندرجہ ذیل رائے تحریر کی:

'' خاکسار کے خیال میں اس کی افادیت کے پیش نظر اس کو جلد شائع ہونا چاہئے۔ آپ نے یہ مضمون لکھنے میں بڑی محنت کی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔''

اللہ تعالیٰ ہر دو بزرگ بھائیوں کو جزائے خیر دے۔ ان کے علم و صحت میں برکت دے اور انجام بخیر کرے۔ آمین۔

دعا گو

شاہدہ متین سجاد

ارشادات حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ

''جو لوگ اپنے آباء و اجداد کا ذکر زندہ رکھتے ہیں ان کے آباء و اجداد کی عظیم قربانیاں، خوبیاں نسلاً بعد نسلٍ قوموں میں زندہ رہتی ہیں''

(چند اقتباسات از خطبہ فرمودہ 30 ر اپریل 1999ء)

''نیک لوگ جو خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ خود ایمان لاتے ہیں اور سچائی کو قبول کرتے ہیں وہ شاذو نادر کے طور پر ضائع ہوتے ہیں۔ کبھی بھی آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ انبیاء کی جماعتیں خود ضائع ہوگئی ہوں ہاں جب ان کی جگہ نئی نسلیں آتی ہیں تو وہاں سے خطرات شروع ہوتے ہیں۔ ہمیں یعنی اس صدی کے سر پر کھڑے ہوئے لوگوں کو ایک نئے زمانہ کے چیلنج کا سامنا ہے۔ ہم ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جہاں ایک نسل ہی نہیں بلکہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل بھی گذر چکی ہے۔ صحابہ کا زمانہ بھی ختم ہوگیا اور اب وہ شاذ کے طور پر برکت کے لئے دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ وہ کبار تابعین جو صحابہ کے تربیت یافتہ تھے وہ بھی اکثر گذر چکے ہیں البتہ تابعین کا وہ گروہ باقی ہے جو چھوٹی عمر کا تھا اور ابھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کا ایک طبقہ دنیا کی تمام جماعتوں میں نہ سہی مگر بہت سی جماعتوں میں پھیلا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور ان سے بڑی توقع اور امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ نیکی کی اعلیٰ روایات کو اگلی نسلوں میں جاری کریں گے۔ آمین۔ یہ وہ خطرناک جوڑ ہے جو دو صدیوں کا بھی جوڑ ہے اور نسلاً بعد نسلٍ تیسرا جوڑ بنتا ہے اور اس جوڑ کی اگر ہم نے حفاظت کی اور اپنی آئندہ نسلوں کے نگران ہوئے تو انشاء اللہ تعالیٰ پھر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔

قرآن کریم نے اسلاف کے کارناموں کو زندہ رکھنے کے لئے جو بہت سے ذرائع بیان فرمائے ہیں ان میں ایک ذریعہ ذکر کا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے آباء و اجداد کا ذکر زندہ رکھتے ہیں ان کے آباء و اجداد کی عظیم خوبیاں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہیں اور تربیت کی جان صفاتِ الٰہیہ

ہیں۔ پس اس پہلو سے اگر ہم اپنی آئندہ نسلوں کی ویسی ہی تربیت کرنا چاہتے ہیں جیسی پہلی نسلوں کی ہم نے دیکھی اور پہلی نسلوں نے ہماری تربیت کرنے کی کوشش کی تو ایک مرکزی نصیحت کا نکتہ جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے اس کو پلّے باندھ لیں اور اس پر دل و جان سے عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: (البقرہ:۲۰۱)

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا

کہ جب تم مناسکِ حج سے فارغ ہو جایا کرو تو "فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ" پھر تم اللہ کا ویسے ذکر کیا کرو جیسے تم اپنے آباء کا ذکر کرتے ہو۔ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا بلکہ اس سے بھی بہت بڑھ کر ذکر کرو۔ حج کے وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انسان خدا کی گود میں آ گیا ہے اور ہر طرف سے نیکیوں نے اس کو گھیرا ہوتا ہے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد وہ پھر دنیا میں واپس لوٹتا ہے اور اس وقت خطرات درپیش ہوتے ہیں ان خطرات سے بچنے کے لئے خدا تعالیٰ نے یہ نصیحت فرمائی ہے کہ ذکرِ الٰہی پر زور دو اور اس طرح ذکر کرو جس طرح تم اپنے آباء کا ذکر کرتے ہو۔ اس طرح پر گویا جب ایک نسل جو صحابہ کی نسل ہے وہ گذر جاتی ہے تو اگلی نسل میں ایک قسم کا ویسا ہی ماحول پیدا ہو جاتا ہے جیسے حج سے باہر آ گئے ہوں۔ جیسے دوبارہ زمانے کے خطرات کے سامنے ان نسلوں کو پیش کر دیا گیا ہو۔ اس وقت بھی یہی مضمون کارفرما ہوگا۔ اگلی نسلوں کی حفاظت کا یہی ایک طریق ہے جو کارآمد ثابت ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ ذکر میں پناہ لو۔ یہاں جو كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ فرمایا ہے، یہ مضمون سمجھنے کے لائق ہے۔ دنیا میں جتنی قومیں ہیں وہ اپنی اعلیٰ روایات کی حفاظت اپنے قومی جانبازوں اور بزرگوں کا ذکر کر کے کیا کرتی ہیں۔ اگر قوموں کی تاریخ سے ان کے آباء کا ذکر مٹا دیا جائے اور فراموش کر دیا جائے تو وہ قومیں اپنی ان تمام روایات کو بھول کر ان راستوں کو کھو دیں گی جن روایات پر چلتے ہوئے ان کے آباء نے بعض راستوں پر ترقیات پر قدم مارے تھے اور ترقیات ان کو نصیب ہوئی تھیں۔ پس ذکر کا مضمون آئندہ نسل کی تربیت کے ساتھ ایک بہت گہرا تعلق رکھتا ہے یہاں جو كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ فرمایا گیا ہے اس میں مثال تو دنیا

کے ذکر کی دی تھی لیکن مذہبی تعلق میں نصیحت ہے اس لئے ہمیں کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ کی بھی وہ تشریح کرنی پڑے گی جو قرآنی آیات کے مطابق ہو۔ اگر دنیا کی قوموں سے کہا جائے کہ تم اس طرح ذکر کرو جس طرح تم اپنے اٰبآء کا ذکر کرتے ہو تو ان کے ذہن میں مختلف قومی ہیرو اُبھریں گے مگر جب مذہبی دنیا میں گفتگو ہوگی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مخاطب فرمایا گیا ہو تو کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ کا مضمون ایک اور رنگ اختیار کر جاتا ہے۔ یہ ذکر اس کا پتہ ہمیں قرآن کریم میں ملتا ہے۔ وہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آباء کا ذکر ملتا ہے۔ یعنی ابراہیم کا ذکر ملتا ہے۔ نوح کا ذکر ملتا ہے آدم کا ذکر ملتا ہے اور ابراہیم کے بعد نسلاً بعد نسلاً ان اولادوں کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے اپنے آباء کے ذکر کی حفاظت کی تھی۔ پس یہ ذکر اللہ کے ذکر کے ساتھ اس طرح مل جاتا ہے جیسے دو چیزیں ایک دوسرے میں پیوستہ ہو کر یک جان ہو جائیں اور ایک کا دوسرے میں فرق نہ رہے تو فرمایا اپنے بزرگ آباء کے حوالے سے اپنی اعلیٰ روایات کو زندہ رکھو اور ذکرِ الٰہی میں اور بھی زیادہ شدّت اختیار کرو۔ چنانچہ حضرت اقدس محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نصیحت کا یہی طریق تھا کہ بزرگوں کے حوالے سے نیک لوگوں کے حوالے سے نصیحت فرمایا کرتے تھے اور بزرگ آباء کے ذکر کو تفاخر میں شمار کے طور پر نہیں فرماتے تھے بلکہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ مومنوں کو یہی زیب دیتا ہے کہ ایسا ہی ذکر کیا کریں اور وہ ذکر خود بخود خدا کی طرف لے جاتا ہے۔

ایسے بزرگ آباء و اجداد جنہوں نے غیر معمولی دینی ترقیات حاصل کیں اور غیر معمولی قربانیاں دیں ان کا ذکر اگلی نسلیں بُھول رہی ہیں اور ان کے ماں باپ بھی اس ذکر کو زندہ نہیں رکھتے نتیجتاً وہ کتابوں کے پھول بنتے جا رہے ہیں اور کتابیں بھی ایسی جن کو کم لوگ پڑھتے ہیں پس یہ انداز جو ہے یہ زندہ رہنے کا انداز نہیں۔‘‘

پھر حضورؒ نے فرمایا:

’’بعض دوسرے ممالک میں دین کے لئے عظیم الشان قربانی دینے والے وجود تھے لیکن آگے اولادیں یا ٹھنڈی پڑ گئیں یا کسی وجہ سے پیچھے ہٹ گئیں اور بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے

جماعت سے تعلق کُلیۃً توڑ لیا۔لیکن جب بھی ان سے رابطہ ہوا ہے اوران کے آباء واجداد کے ذکر سے ان کو مَیں نے واپس آنے کی نصیحت کی ہے تو خدا کے فضل سے نیک اثر پیدا ہوا ہے۔

نجی (پرائیویٹ) مجالس میں بھی ذکر کریں۔وہی راستہ اختیار کرنا چاہئے جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔یعنی آباء کے ذکر سے خدا کے ذکر کی طرف ان کو منتقل کر دیں۔آباء کا ذکر کرتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھیں اور ذکر اللہ میں جا کر اپنی آخری منزل تک پہنچیں اور وہاں اپنے سفر کا اختتام کریں۔ یہ وہ طریق ہے جس سے ہم بہت سی کھوئی ہوئی اعلیٰ اقدار کو واپس لا سکتے ہیں اور انہیں دوبارہ اختیار کر سکتے ہیں قوموں کی زندگی کا راز بھی اسی میں ہے۔گویا قرآن کریم کی اس آیت نے ایک ایسا گہرا نفسیاتی نکتہ بیان فرمایا ہے جس کا قوموں کے عروج اور زوال سے بڑا گہرا تعلق ہے۔سب سے زیادہ زور اس بات پر ہونا چاہئے کہ آنے والی نسلوں کو اپنے بزرگ آباء واجداد کے اعلیٰ کردار اور اعلیٰ اخلاق کا علم ہو۔ان کی قربانیوں کا علم ہو۔ان کا ذکر کریں تو ان کے دل اِس سے پگھلیں اور ان کی محبت پھر اللہ کی محبت میں تبدیل ہونے لگے۔‘‘

آرزو

یہ آرزو ہے محبت بھرا اِک فسانہ لکھوں
جو مِری قلم کو زباں ملے تو بے پناہ لکھوں
عشق میں ڈوبی ہوئی داستانِ ذکر لکھوں
صدائے جرس پہ گذرا ہوا کارواں لکھوں

خدایا مجھے توفیق دے قلم رہے میرا رواں
کِرنوں سے پِھر سجا دوں یادوں کی کہکشاں
آبِ ذکر سے زندہ ہوں اپنے آباء کے نشاں
قبول ہو کاوش میری تُو ہے مجیب و رحماں

حضرت میاں مہر غلام حسن صاحب رضی اللہ عنہ

عاجزہ اپنے مضمون کا آغاز نانا جان کے حالاتِ زندگی سے کر رہی ہے کیونکہ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے سب سے پہلے احمدیت قبول کی اور پھر ان کی تبلیغ سے دادا جان اور دوسرے بزرگ احمدیت کی آغوش میں آنے لگے۔ الحمدللہ۔ دنیاوی رسم و رواج کے مطابق مجھے دادا جان کے ذکر سے اس کتاب کو شروع کرنا چاہیئے تھا مگر مَیں قبولیتِ احمدیت کو مقدم رکھوں گی اور اس اعزاز کو حاصل کرنے میں نانا جان سبقت لے گئے۔

عمر قریباً 70 سال۔ سن بیعت قریباً 1899۔1898 (بحوالہ رجسٹر روایات نمبر 3۔10) ہمارے نانا جان کا نام حضرت مہر غلام حسن رضی اللہ عنہ تھا۔ آپ سیالکوٹ کے محلہ اراضی یعقوب کے رہنے والے تھے۔ آپ کے آباء واجداد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کئی سو برس پہلے دو افراد افغانستان کی سرحد سے ملحق پاکستانی قبائلی علاقہ سے آ کر سیالکوٹ میں آباد ہوئے ان کے نام یعقوب خان اور ایوب خان تھے اور وہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ افغانستان ایک ایسا خطہ ہے جس پر پے در پے حملہ آوروں کی یلغار رہی مگر اس دشوار گذار پہاڑی علاقے میں بڑی سے بڑی طاقتور فوج کو بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یہ بدنصیب خطّہ زمین صدیوں سے جنگ کی لپیٹ میں رہا۔ ان پُرخطر حالات کو دیکھ کر لوگ افغانستان کو چھوڑ کر پُرامن وادیوں کا رُخ کرتے رہے اور جن کے پاس مال تھا وہ ہجرت کرنے کے باوجود جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور آسودہ حالی سے زندگی بسر کی۔

یہی حال ہمارے آباء واجداد کا ہوا۔ مہاجر ہونے کے باوجود انہوں نے سیالکوٹ شہر میں وسیع اراضی خرید کر ایک محلّہ اپنے نام پر بسایا اور اس کا نام ''محلہ اراضی یعقوب خان'' پڑ گیا۔ اس نسبت سے آج تک یہی نام چلا آتا ہے حالانکہ اس بات کو کئی صدیاں بیت گئیں۔ نیز انہوں نے شہر سے تھوڑا ہٹ کر نالہ ''اَیک'' کے دوسری طرف وسیع اراضی لے کر کاشت کاری شروع کی۔

ہمارے آباء واجداد کی تاریخ کے بارے میں محترمہ آمنہ بیگم صاحبہ اہلیہ مولانا نذیر احمد

صاحب مبشر بیان فرماتی ہیں:

''چونکہ ہمارے بزرگ محترم یعقوب خان اور محترم ایوب خان کا پیشہ بھی کاشتکاری تھا لہٰذا اپنے ہم پیشہ یعنی دوسرے کاشتکاروں میں مِل جُل کر رہنے سے محبت بڑھی، ان کے خاندانوں میں ان کے رشتے طے ہو گئے۔ سیالکوٹ کے وہ لوگ جن کے ساتھ ان کے رشتہ داری کے تعلقات قائم ہوئے ''مہر یا ارائیں'' کہلاتے تھے۔ پھر آپس کی رشتہ داریوں کی وجہ سے ان کو بھی مہر یا ارائیں کہا جانے لگا۔ ان کے بعض قریبی عزیز اپنے آپ کو بھٹی کہلاتے ہیں اور بعض راجپوت کہلاتے ہیں۔''

اس حقیقت کو جھُٹلایا نہیں جا سکتا کہ پٹھان قوم سے تعلق رکھنے والے خان، آغا، اور پٹھان کے لقب کو بھلا دیا گیا۔ ان کی اپنی تہذیب، کلچر، اور زبان کو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ دو اجنبی افراد اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے جن کی تہذیب وہاں کی اکثریت پر غالب نہ آسکی چنانچہ وہ وہیں کے ہو رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کو بھی مہر یا ارائیں کہا جانے لگا۔ ان دونوں بھائیوں کی قوم تو کسی کو یاد نہیں۔ ذات بھولی بسری ہو گئی۔

سیالکوٹ میں ہمارے بزرگوں کو زرعی اراضی تک پہنچنے کے لئے مذکورہ بالا نالہ جس کا نام ''اَیک'' تھا پار کرنا پڑتا تھا۔ اس نالے سے دھوبی گھاٹ، کیمیا گر اور ماہی گیروں کی روزیاں وابستہ تھیں۔ جب نالے کی شوریدہ لہریں اپنا رنگ دکھاتیں تو اس علاقے میں خوب تباہی مچتی اور زندگی معطل ہو کر رہ جاتی۔

ہمارے بزرگوں نے اپنی آمدنی کے لئے آڑو اور امرود کے باغات لگا رکھے تھے۔ نانا جان کے باغوں کا امرود بہت مشہور تھا۔ اس کے علاوہ بعض فصلیں گندم، چاول اور سبزیاں بھی بوئی جاتی تھیں۔ یہ باغات آج بھی قائم ہیں مگر اب ان کی نسلیں خود کھیتی باڑی کرنے کے بجائے مزارعوں سے کام لیتی ہیں۔

نانا جان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آسودہ حال تھے۔ محلے کے وسط میں ان کا گھر تھا۔ ان کا

گھر تقریباً 1700ء میں تعمیر ہوا تھا۔ پرانے وقتوں کے اس گھر کی بنیادیں کئی فٹ چوڑی تھیں۔ اس کی تعمیر کے تقریباً 200 برس کے بعد اس پر چوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس وقت شہر سیالکوٹ میں دو چوبارے ہوتے تھے۔ ہمارے نانا جی کا چوبارہ علمی محفلوں اور تبلیغی نشست گاہوں کے لئے مشہور تھا۔ جہاں رات گئے مختلف علماء کے ساتھ بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ اس وقت حضرت مولانا راجیکی صاحبؓ سیالکوٹ میں مربی ہوا کرتے تھے۔ وہ ان تبلیغی محفلوں کے رُوحِ رواں تھے۔

حق کی تلاش وقبول احمدیت

حضرت غلام حسن صاحب مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ تین بھائی تھے جن کے نام غلام حسین، غلام حسن اور غلام علی تھے۔ جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے پہلے یہ لوگ شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو جوانی میں حق کی تلاش کی جستجو پیدا ہوئی۔ حضرت میاں مہر غلام حسن صاحب اور ان کے بھائیوں نے بعد میں (اہل حدیث) وہابی فرقہ سے تعلق پیدا کیا۔ شرک سے بہت دور تھے۔ نماز روزہ کی پابندی کرنے والے تھے۔ تہجد گذار تھے، صاحب کشف تھے۔ ان کو سچی رویاء آیا کرتی تھیں۔ وہ اس انتظار میں رہتے کہ کب ان کو اشارہ ملے اور وہ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں شامل ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مہدی کو سلام پہنچائیں۔ اس وقت ہمارے بزرگوں کو مہدی کا انتظار تھا۔ وہ پرات میں پانی ڈال کر ساری ساری رات انتظار کرتے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ جب یہ پانی دودھ بنے گا تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ امام مہدی کا ظہور ہو گیا۔ مگر جب حضرت مسیح موعودؑ نے دعویٰ فرمایا تو کوئی بھی ان کو ماننے کو تیار نہ ہوا۔ نانا جان مخالفت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ طبیعت بھی جوشیلی تھی۔ مسلمانوں کے پرانے عقیدہ کے مطابق مہدی نے آسمان سے اترنا تھا۔ سادہ لوح لوگ کن خوابوں کے منتظر تھے۔ حیاتِ عیسیٰ پر یقین بہت پختہ تھا۔ اس وقت سیالکوٹ کے احمدیوں میں تبلیغ کا خاص جوش پایا جاتا تھا۔

محترم غلام باری صاحب سیف ''رسالہ تحریک جدید'' میں آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محترم مولانا نذیر احمد صاحب مبشرؓ کے والد مہر غلام حسن صاحبؓ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ احمدیت کے قریب انہیں مسیح کی حیات و وفات کے مسئلہ نے کیا۔ وہ کہتے تھے کہ حیاتِ مسیح کا عقیدہ رکھنا شرک ہے اور توحید کے خلاف ہے چنانچہ وہ غیر احمدی مولویوں سے اس مسئلہ کے بارے میں تبادلۂ خیالات کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ قرآن شریف حیات مسیح کے عقیدہ کی تائید نہیں کرتا۔ اس کے بعد ان پر رؤیا کے ذریعہ احمدیت کی صداقت کا انکشاف ہوا۔''

(تحریک جدید صفحہ ۱۶۔ حالات زندگی مولانا نذیر احمد مبشر سابق مبلغ گھانا۔)

نانا جان کی قبولیت احمدیت کے بارہ میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ ذیل میں ان کو درج کیا جاتا ہے۔ ہماری بہن امۃ الآخر نے امی جان سے سن کر نانا جان کے حالات قلم بند کئے۔ وہ لکھتی ہے:

''ہم خدا تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کریں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے خاندان میں احمدیت کا بیج ہمارے نانا جان کے ذریعہ بویا۔ خاندان کے زیادہ تر بزرگ مخالف تھے۔ سیالکوٹ میں حضرت مولوی عبد الکریم صاحب سیالکوٹیؓ نے تبلیغ کے ذریعہ ایک دنیا بسا لی تھی۔ حضرت مولوی عبدالکریم صاحب کا احمدیت کے لئے جوش اور طریق تبلیغ انوکھا ہی تھا۔ آپ کے پیغامِ حق کو سُن کر کچھ لوگ احمدیت کے جھنڈے تلے آ جمع ہوئے جس سے اس سارے علاقے میں مخالفت مزید بڑھ گئی۔ میاں مہر غلام حسنؓ صاحب جوشیلے جوان تھے۔ امام وقت کے بارے میں کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ مان لینا تو دور کی بات تھی۔ حضرت مولوی عبدالکریم صاحب سیالکوٹیؓ ان کی نیکی اور علمی قابلیت سے خوب واقف تھے۔ نانا جان نہ صرف پڑھے لکھے تھے بلکہ قرآن کریم کی خوب سمجھ رکھتے تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ وتفسیر کیا کرتے تھے اور مسجد میں فجر کے بعد درس القرآن بھی دیا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ نے ان کو باغ میں جالیا اور ان کو نہایت دوستانہ انداز میں سمجھانے لگے اور ان کے سامنے قرآن پاک کی یہ آیت رکھی فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ اور فرمایا:

’مہر جی مجھے اس آیت کے معنے سمجھایئے‘

نانا جان نے مطلب بتایا۔اس پر مولوی صاحب نے فرمایا:

’لیکن عیسائی حضرت عیسیٰ اور اس کی ماں کو خدا کا شریک بنا چکے۔مگر حضرت عیسیٰ اب تک آسمانوں پر زندہ ہیں۔اس آیت کے مطابق تو یہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد ہونا تھا۔اب دونوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی۔یا تو آپ حضرت عیسیٰ کی وفات کا اقرار کرلیں۔یا پھر آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ عیسائیوں نے ابھی تک حضرت عیسیٰ کو خدا کا شریک نہیں بنایا۔‘

بس یہی ایک نقطہ تھا جو نانا جان کو سمجھ آ گیا۔وہ سرپٹ گھر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔تیز دوڑتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:’لوگو! عیسیٰ مر گیا۔لوگو! عیسیٰ مر گیا۔‘

بیعت کے بارے میں مندرجہ ذیل خوابوں کا ذکر رجسٹر روایات میں ملتا ہے:

سیالکوٹ میں احمدیوں کے خلاف نفرت بہت زیادہ تھی۔انہی دنوں میں نانا جان حضرت غلام حسن صاحبؓ کے محلہ میں ایک شخص جو احمدی تھا، آ گیا۔اہلِ محلہ نے اس کا مسجد میں نماز پڑھنا اور کنوئیں سے پانی بھرنا بند کر دیا تھا۔اس لئے کہ وہ اسے دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔

’’حضرت مہر غلام حسن صاحب سیالکوٹ محلہ اراضی یعقوب نے بیان کیا کہ بیعت سے ایک سال قبل مَیں نے خواب میں دیکھا کہ ہمارے کنوئیں کے مغرب کی طرف امریکن پادریوں کی ایک کوٹھی ہے۔مَیں نے دیکھا کہ مغرب کی طرف ایک راستہ ہے۔راستہ میں ایک آدمی کھڑا ہے۔اس نے ایک پتنگ اڑائی ہے۔مَیں اس آدمی کی طرف بھی دیکھ رہا ہوں۔اور اُس آدمی (یعنی جو نو وارد احمدی مہمان کے طور پر) کو بھی۔اسی اثنا میں مَیں نے دیکھا کہ اس کوٹھی میں ایک مُرصعّ تخت بچھا ہے۔اس پر ایک خوبصورت لڑکا بیٹھا بنسری بجا رہا ہے۔اور تخت ہوا میں لہرا رہا ہے۔وہ بوڑھا آدمی جو پتنگ اڑا رہا تھا، اس نے پتنگ اس لڑکے کی طرف اُڑائی یہاں تک کہ پتنگ لڑکے کے سر کے ساتھ لگی۔اس کا لگنا ہی تھا کہ دھواں پیدا ہو گیا۔نہ وہ تخت رہا نہ لڑکا۔سب کچھ دھواں ہو گیا۔پہلے لڑکے کی شکل سیاہ ہوئی پھر دھواں ہو گیا مگر پتنگ کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔

پھر مَیں نے مولوی فیض دین صاحب کو اسی مسجد کبوتراں والی میں آ کر وہ خواب سُنائی مگر انہوں نے کہا۔ یہ یونہی خیال ہے، جانے دو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک اور رؤیا کے ذریعہ مدد فرمائی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اور آپ کے بڑے بھائی بازار میں جا رہے تھے۔ خواب میں دکھائی گئی تمام بستی ہندوؤں کی تھی۔ ایک بوڑھے شخص کو آپ نے قرآن پڑھتے سُنا۔ جب آپ واپس آئے تو پھر بھی وہ بوڑھا شخص قرآن پڑھ رہا تھا۔ نانا جان نے دل میں خیال کیا کہ یہ شخص پکا مسلمان اور بے دھڑک آدمی ہے جو ہندوؤں کی بستی میں قرآن پڑھ رہا ہے۔ بیعت کے بعد جب حضرت صاحب کا فوٹو دیکھا تو ان پر واضح ہوا کہ پہلی خواب میں پتنگ اُڑانے والا اور دوسری خواب میں قرآن پڑھنے والا شخص حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی تھے۔

حضرت نانا جان نے بیان کیا کہ ایک دن سیالکوٹ کی جامع مسجد، جو مسجد کبوتراں والی کہلاتی ہے، میں حضرت نانا جان اور مولوی فیض دین صاحب بیٹھے تھے۔ ایک شخص بنام رحیم قوم درزی ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب آج طبیعت بہت پریشان ہے۔ آپ نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بیان کرنے لگا کہ حامد شاہ ایک فرشتہ اور باخُدا آدمی ہے۔ ہندو اور مسلمان ان کی تعریف کرتے ہیں۔ آج ان سے بہت غلطی ہوئی ہے۔ آج انہوں نے اپنے ماموں عمر شاہ صاحب کو کہا ہے کہ ماموں جان آپ کا حضرت ابنِ مریم کے متعلق کیا خیال ہے؟ عمر شاہ صاحب نے بیان کیا کہ 'بیٹا میرا تو یہی خیال ہے کہ وہ زندہ آسمان پر ہیں کسی زمانہ میں اُمّتِ محمدیہ کے لئے آئیں گے' حامد شاہ صاحب نے کہا 'کہ ماموں صاحب آج سے آپ میرے امام نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ عقیدہ مُشرکانہ ہے کہ ایک انسان کو حیٌ وقیّوم اور لازوال مانا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سیدنا و مولانا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس عقیدہ سے بڑی ہتک ہوتی ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم زمین میں مدفون ہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اُٹھائے جائیں'۔ عمر شاہ صاحب نے اس پر کہا ''اچھا بیٹا آپ آگے کھڑا ہوا کریں اور مَیں پیچھے پڑھا کروں گا''

نانا جان نے یہ باتیں سُنتے ہی کہا کہ مولوی صاحب مَیں نے مان لیا ہے کہ مسیح مر گیا ہے۔

اگر مسیح زندہ رہیں تو توحید میں بڑا فرق آتا ہے۔آپ یہ مت خیال کریں کہ مَیں احمدی ہو گیا ہوں۔مَیں ابھی تک احمدی نہیں ہوں مگر مرزا صاحب کی یہ بات ضرور سچی ہے مَیں کبھی گوارا نہیں کرسکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتک کی جائے۔مولوی فیض صاحب نے میرے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دیا۔مَیں نے کہا مولوی صاحب کیوں روکتے ہیں؟ مولوی فیض صاحب نے کہا کہ اگر آپ کا اب یہ عقیدہ ہے کہ مسیح مر گیا ہے تو اتنا جوش وخروش دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔مَیں نے کہا مولوی صاحب مسجد سے نکلتے ہی منادی کرتا جاؤں گا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر ہیں تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتک ہے۔یہ میری جان گوارا نہیں کرسکتی۔مَیں نے جاتے ہی اپنے والد صاحب کو سمجھایا۔میرا بڑا بھائی غلام حسین (جو عارف والہ کا امیر جماعت ہے) اور والد صاحب دونوں جل کر آگ بگولا ہو گئے اور میرا نام دجّال،ملعون وغیرہ رکھا۔

مجھے یہ خیال آیا کہ کل مجھ پر مولویوں کا حملہ ہوگا۔چنانچہ مَیں نے رات کے وقت اس احمدی کو جس کو ہم نے مسجد میں آنے سے روکا تھا ایک نوکر کے ذریعہ بُلایا۔مَیں نے اس سے پوچھا کہ کیا مرزا صاحب نے وفاتِ مسیح پر کوئی دلیل بھی دی ہے یا یوں ہی کہہ دیا ہے؟

اس نے کہا انہوں نے تیس آیات پیش کی ہیں۔مَیں نے حیران ہو کر کہا کہ ہم دن رات قرآن پڑھتے ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں یہ کیا بات ہے۔ایک ہی آیت ہمیں بتادو۔اس نے ساتویں پارہ کی آیت ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط (المائدہ:۱۱۸)'' بتادی۔ مَیں نے کہا کہ اب میری تسلی ہوگئی۔اب کوئی مولوی میرا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔اگلے دن فجر کے وقت میرے بڑے بھائی محترم غلام حسین ؓ صاحب،مولوی فیض دین صاحب اور دو تین دوسرے آدمی آئے۔مَیں مسجد کے دروازہ میں کھڑا تھا کہ وہ سب آپہنچے۔مولوی صاحب نے کہا کہ مسیح کے آپ کیوں دشمن ہو گئے ہیں؟ مَیں نے پوچھا کہ مَیں نے کیا دشمنی کی ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کا بھائی کہتا ہے کہ آپ مسیح کی موت کے قائل ہو گئے ہیں۔مَیں نے جواب دیا مولوی صاحب کیا کریں کیونکہ وہ تو خود اپنی موت کا اقرار کرتا ہے۔مگر آپ کی مثال مُدعی سُست اور گواہ

چُست کی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہاں لکھا ہے؟ مَیں نے کہا قرآن میں۔ وہ کہنے لگے کونسا قرآن؟ جو مرزا صاحب نے بنا دیا۔ مَیں نے کہا مولوی صاحب ذرا ہوش سے بولیں آپ خدا پر حملہ کر رہے ہیں کیونکہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خدا تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ پھر مَیں نے مندرجہ بالا ساتویں پارہ کی آیت پڑھی۔ اس پر وہ کہنے لگے ہم تمہیں ایک ہی گُر بتاتے ہیں کہ ان بے ایمانوں کے ساتھ بات نہ کی جائے کیونکہ اگر ان کی نظر کے ساتھ نظر ملائی جائے تو بھی ان کا اثر ہو جاتا ہے۔ مَیں نے کہا سچائی کا اثر خود بخود ہوا کرتا ہے۔ مولوی فیض دین صاحب خاموش ہو کر واپس چلے گئے۔ میرا بھائی جو مخالف تھا وہ نیروبی چلا گیا۔ مَیں نے بیعت کر لی۔ پھر والد صاحب اور بیوی کو بھی سمجھا لیا گو یا سب کو سمجھا لیا۔ بھائی کو نیروبی جا کر سمجھ آئی۔ وہ دس ماہ کے بعد واپس ہوئے اور آتے ہی بیعت کر لی۔ اب خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارے محلّہ میں سوڈیڑھ سو احمدی ہیں۔

بھائی صاحب کی واپسی پر والد صاحب، میر حامد شاہ صاحب، اور بھائی صاحب قادیان گئے۔ وہ جب واپس آئے تو ہم چار آدمی تبلیغ کرتے کرتے پیدل چل پڑے اور دستی بیعت کی۔''

(بحوالہ رجسٹر روایات 3۔10)

حضرت غلام حسن صاحبؓ کا خاندان میں اثر ورسوخ بھی تھا کیونکہ وہ مدلّل جوابات سے قائل کرنا جانتے تھے۔ فنِ خطابت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی اور علمِ دین بھی تھا۔ اس دوران آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام رؤیا میں دکھائے گئے اور آپ کے دل کو تسلی ہوئی۔

جس کی فطرت نیک ہے آئے گا وہ انجام کار

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے 1894ء میں امام وقت کے قدموں میں سر جھکا دیا اور پورے انشراحِ صدر سے بیعت کر کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں شامل ہوئے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھے۔ ان کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت پہلے سے ہی رچی ہوئی تھی۔ امامِ وقت نے جو پانی چھڑکا تو اس سے روح کی پیاس مٹنے لگی۔ دل کی حالت تبدیل ہو گئی۔ اسلام کے محاسن کھلنے لگے۔ اور آپ پوری

دل جمعی سے تبلیغ میں لگ گئے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اپنے پرائے سب کو مہدی دوراں کی آمد کی خبر دیتے۔ اس سے ان کی مخالفت بھی بہت ہوتی تھی۔

خاندان کے چالیس نفوس کی بیعتیں اور صحابیوں کا محلہ

اب ہماری برادری میں سب سے زیادہ مخالفت کرنے والے کو خدا تعالیٰ نے حق کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائی تھی۔ پھر ایک دن برادری کے لوگ اکٹھے بیٹھے اور سوچنے لگے۔ مہدی کا انتظار بھی تھا حق کی تلاش بھی تھی۔ ہمارے بزرگوں میں خوفِ خدا، دین کی محبت اور مساجد سے لگاؤ کی صفات نمایاں تھیں۔ وفاتِ عیسیٰ کا نقطہ سمجھ آ گیا۔ یہ عقدہ حل ہوا۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سچا کیسے مانا جائے؟ کیونکر ثابت ہو کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں۔ یہی مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مہدی ہیں۔

چنانچہ سب کی رائے تھی کہ ہر کوئی اپنے طریق سے دعا کرے۔ چالیس دن دعا کرنے کے بعد ہم سب دوبارہ اکٹھے ہوں گے۔ ان بزرگوں میں نانا جان ان کے دو بھائی اور ان سب کی بیویاں بھی شامِل تھیں۔ چالیس دن خلوص سے دعائیں کرنے کے بعد سب خاندان والے دوبارہ اکٹھے ہوئے۔ دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی بشارتوں اور رؤیا کا ذکر کیا۔ نانا جان کو بھی اس دوران بذریعہ خواب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت ہو چکی تھی۔ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے۔ وہ جس کو چاہے ہدایت دے جیسے چاہے رہنمائی کرے، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عادت ہے۔ ہمارے کئی بزرگوں نے خواب میں حضرت مسیح موعودؑ کی زیارت کی۔ پھر حضرت مسیح موعودؑ کی تصویر منگوا کر دیکھی گئی تو وہ احباب جنہوں نے اُن کو اِن 40 دنوں کی عبادت کے دوران رؤیا میں دیکھا تھا، کہنے لگے یہی وہ بزرگ تھے جو ہمیں خواب میں دکھائے گئے تھے۔ یوں ایک ہی دن میں سیالکوٹ میں ہمارے خاندان کے چالیس افراد نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق چودھویں صدی میں آنے والے

امام مہدی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔الحمدللہ اس واقعہ کے بعد ''محلہ اراضی یعقوب'' صحابیوں کا محلہ کہلانے لگا۔

اس اجتماعی بیعت سے پہلے نانا جان نے نانی اماں کو بیعت کرنے کی تحریک کی۔اس پر انہوں نے کہا کہ مَیں نے پہلے ہی خفیہ بیعت کر لی تھی۔

حضرت غلام حسن (نانا جان) کو تبلیغ کا ایسا شوق ہوا کہ پہلے اہل محلہ اور جاننے والوں کو تبلیغ کرتے رہے۔ پھر دوسرے عزیز و اقرباء کو بھی خطوط لکھنے شروع کئے۔آپ کی کوشش سے خاندان میں کئی افراد احمدیت کے جھنڈے تلے آ جمع ہوئے۔اپنے پرائے، واقف کار، نیز اجنبی لوگوں کو بھی تبلیغ کیا کرتے۔اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ نتائج کیا ہوں گے۔شام کے وقت آپ کا چوبارہ لوگوں سے بھر جاتا۔ ہر شام تبلیغی محفلوں کے لئے لوگ جمع ہوتے۔ان تبلیغی محفلوں میں حضرت مولانا غلام رسول راجیکی صاحبؓ، جو ان دنوں سیالکوٹ میں بطور مربّی تعینات تھے اور آپ کے مخلص دوست تھے،بھی مدعو کئے جاتے۔آپ مخالفین کے سوالات کا مدلّل جواب دیتے۔کبھی کبھی ناخوش گوار واقعات بھی پیش آ جاتے۔

حضرت مولانا راجیکی صاحبؓ حضرت غلام حسن کے گھر کی چھت پر تبلیغی بحث کے دوران ہونے والے ایک واقعہ کا ذکر اپنی کتاب ''حیات قدسی'' میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علماء کی طرف سے افسوسناک تحریف

''غیر احمدی علماء نے علماء نصاریٰ کی تائید میں حیات مسیح کو ثابت کرنے کے لئے تحریف لفظی و معنوی کے افسوسناک نمونے دکھائے ہیں۔

سیالکوٹ کے محلہ ''یعقوب اراضی'' کے مہر غلام حسین اور مہر غلام حسن جو باغبان قوم کے معزّز رکن تھے، جب اہل حدیث سے احمدی ہوئے تو مولوی محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کو جو خود بھی اہل حدیث تھے، اس اطلاع سے بہت دکھ ہوا۔ وہ ان دونوں بھائیوں کے پاس گئے۔

اور انہیں مرتد کرنے کے لئے ان کے مکان کی چھت پر چڑھ کر آیت يٰعِيسٰى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ کی تلاوت کرتے ہوئے بجائے رَافِعُكَ إِلَيَّ کے، رَافِعُكَ إِلَى السَّمَاءِ پڑھنے لگے۔ جب ان دونوں بھائیوں نے کہا کہ مولوی صاحب! تحریف کا نمونہ نہ دکھاؤ اور إِلَيَّ کو إِلَى السَّمَاءِ نہ پڑھو تو مولوی صاحب نے کہا کہ مجھے آپ کے مرزائی ہونے سے بے حد صدمہ ہوا ہے۔ آپ میرے پرانے دوست اور محب تھے۔ بے شک إِلَيَّ کی جگہ إِلَى السَّمَاءِ پڑھنا تحریف ہے۔ لیکن میں نے صحیح معنوں کو واضح کرنے کے لئے ایسا کیا ہے تاکہ آپ مرزائیت سے تائب ہو کر واپس فرقہ اہل حدیث میں آجائیں۔'' (بحوالہ حیات قدسی)

حضرت غلام حسن صاحبؓ کو مطالعہ کا بھی شوق تھا۔ جب موقعہ ملتا قرآن پاک اور حضرت مسیح موعودؑ کی کتب کا مطالعہ کرتے۔ نماز باجماعت مسجد میں پڑھنے کی عادت تھی۔ تہجد بھی اکثر مسجد میں ہی پڑھا کرتے تھے۔ جماعت کے لئے خوب غیرت رکھتے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متعدد بار زیارت کی۔ ہر سال جلسہ سالانہ پر حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ابتداء میں قادیان پیدل تشریف لے جایا کرتے تھے پھر سفر کی سہولیات ہو گئیں اور آپ گاڑی سے سفر کرنے لگے۔ آپ کو لکھنے کا شوق تھا۔ اردو اور پنجابی میں شاعری کرتے۔ آپ نے بیاض لکھی۔ افسوس کہ آپ کی شاعری کی کتاب چھپ نہ پائی۔ وہ ضائع ہو گئی۔ افسوس کہ ہم نے یہ ورثہ کھو دیا۔

محترم بھائی داؤد صاحب حال کینیڈا آپ کی شاعری کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

''نانا جان تمام عمر جلسہ، مشاورت کے علاوہ ذاتی ملاقاتوں کے لئے سال میں کئی مرتبہ قادیان تشریف لاتے رہے۔ محترم نانا جان پنجابی میں بھی شاعری فرمایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میری عمر قریباً بارہ سال ہو گی۔ نانا جان قادیان تشریف لائے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے ملاقات کے وقت مجھے بھی ہمراہ لے گئے۔ جب ملاقات کا وقت ختم ہو گیا آپ کھڑے ہو گئے اور جانے کی اجازت چاہی اور حضورؓ بھی کھڑے ہو گئے۔ اس وقت حضور کو ایک دم یاد آ گیا

اوران سے پوچھا کہ کیا آپ نے کوئی نیا کلام لکھا ہے تو نانا جان نے اپنی نئی نظم کا ذکر فرمایا اور حضور کو کھڑے کھڑے پنجابی میں اپنی پوری نظم سنائی جو حضور نے بڑی شفقت اور شوق سے سماعت فرمائی اور جب تک آپ نظم پڑھتے رہے حضور کھڑے رہے اور سُنتے رہے حالانکہ ملاقات کا وقت ختم ہو چُکا تھا۔

نانا جان کی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے چند ملاقاتوں کا حال رجسٹر روایات میں یوں ملتا ہے:

حضرت مہر غلام حسن صاحب ولد میاں مہر نتھو نمبر دار سیالکوٹ محلہ اراضی یعقوب
عمر قریباً 70 سال۔سن بیعت قریباً 1899 ـ 1898 (بحوالہ رجسٹر روایات نمبر 3 ـ 10)
حضرت نانا جان مہر غلام حسن صاحب نے فرمایا:

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مَیں، میری بیوی، بڑا بھائی اور ان کی بیوی قادیان گئے۔ہم نے ایک مکان کرایہ پر لیا ہوا تھا۔رات کو ہم اس مکان میں رہتے تھے۔دن کو ہماری مستورات اور بچے حضرت صاحب کے مکان میں رہتے تھے اور ہم مہمان خانہ میں۔میرے بھائی کی لڑکی کی آنکھیں بچپن سے ہی بیمار رہتی تھیں۔چونکہ وہ لڑکی حضرت صاحب کے ہاں رہتی تھی۔حضرت صاحب نے اپنے ایک خادم کے ساتھ اس لڑکی کو بھیجا اور فرمایا کہ مولوی صاحب کو جا کر کہو کہ کچھ اس لڑکی کی آنکھوں میں ڈال دیں۔چنانچہ مولوی حکیم نور الدین صاحب نے کوئی چیز ڈال دی۔پھر عمر بھر اس لڑکی کی نظر خراب نہ ہوئی۔

میری لڑکی (مریم) مولوی نذیر احمد مبشر کی ہمشیرہ چھوٹی سی تھی۔وہ بیت الذکر میں گئی اور حضرت صاحب کی جھجر (صراحی) سے آب خورہ لے کر پانی پینے لگ گئی۔حضرت صاحب نے فرمایا کہ لڑکی یہ آب خورہ تُو ہی لے جا''

پھر ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں:

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مَیں قادیان گیا۔حضرت صاحب فرمانے لگے کہ بتاؤ سیالکوٹ میں

طاعون کا کیا حال ہے۔ مَیں نے وارداتوں کا ذکر کیا ساتھ ہی مَیں نے ایک خواب بیان کیا کہ یا حضرت مَیں نے دیکھا ہے کہ ہمارے مکان پر پولیس کے آدمی بندوقوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حضرت صاحب نے فرمایا کہ ’’آپ کا گھر طاعون سے محفوظ رہے گا۔آپ کا خدا حافظ ہے‘‘

ایک دفعہ مَیں اور میرا بڑا بھائی حضرت صاحب کے ساتھ سیر کو جا رہے تھے تو میرے بھائی نے سوال کیا کہ یا حضرت ،عقیقہ کے بکرے یہاں بھیج دیئے جائیں یا قیمت یہاں بھیج دی جائے اور بکرے یہاں ہی ذبح کئے جائیں۔فرمایا نہیں وہاں ہی ذبح کرو۔نانا جان (حضرت میر ناصر نواب) کہنے لگے کہ اگر دو بکرے ذبح کرنے ہوں تو ایک یہاں بھیج دیا جائے ۔مگر حضرت صاحب نے فرمایا کہ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے ہاں کھالیں یہاں آنی چاہئیں۔

حضور نے فرمایا: بعض غریب ہمسایے ہوتے ہیں ان کے دل میں آرزو ہوتی ہے کہ ہمیں گوشت دیا جائے تو ایسا کرنے سے ان کی بھی حق تلفی ہوتی ہے۔

انہی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہم دو دو گھنٹے حضرت صاحب کو دبایا کرتے تھے۔

پھر طاعون کے دنوں کا واقعہ ہے آپ حضور کی ملاقات کو تشریف لے گئے ۔آپ ان دنوں کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ طاعون پڑی ہم قادیان گئے۔قادیان گئے سات آٹھ دن ہوئے تھے کہ مخالفین نے کوشش کی کہ سیالکوٹ کے آدمی یہاں آئے ہوئے ہیں اور وہاں طاعون پڑی ہوئی ہے۔ان کو نکلوا دیا جائے۔لیکن خدا کی حکمت ہم نے عشاء کی نماز کے بعد حضرت صاحب سے اجازت لے لی اور سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سیالکوٹ میں ہونے والی ملاقات کے بارے میں رجسٹر روایات میں بیان کیا گیا ہے:

’’جب حضرت صاحب 1904ء میں یہاں (سیالکوٹ) تشریف لائے تو ایک فٹن پر حضور خود سوار تھے اور ایک پر حضرت اُمُّ المومنین سوار تھیں۔فٹن کی حفاظت حضرت نانا صاحب

(حضرت میر ناصر نواب صاحب) اور ایک دو اور آدمی کر رہے تھے۔ حضرت اقدس کی فٹن پہلے مکان پر پہنچ گئی اور حضور اوپر تشریف لے گئے۔ دوسرے لوگ ابھی پیچھے تھے۔ حضور نے جب دیکھا کہ پیچھے ساتھ فٹن نہیں ہے تو اوپر سے نیچے اتر آئے اور فرمایا: ہمارے گھر کے لوگ کہاں ہیں؟ اتنے میں نانا جان حضرت غلام حسن پہنچ گئے۔''

(بحوالہ رجسٹر روایات نمبر 3۔10۔الراقم عبدالقادر 16.06.1939)

آپ کے بارے میں رجسٹر روایات نمبر 15 میں بھی مندرجہ ذیل روایات درج ہیں:

حضرت مہر غلام حسن صاحب، مولوی ابراہیم سیالکوٹی، سید حامد شاہ صاحب، مولوی برہان الدین اور حکیم حسّام الدین صاحب کے واقف کاروں بلکہ دوستوں میں سے تھے۔ انہوں نے خوابوں کی بناء پر قریباً 1894ء میں بیعت کی لیکن قادیان 1900 میں پہلی دفعہ گئے تھے۔

آپ کا بیان ہے کہ:

1۔ ایک دفعہ سیر کو جاتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کسی نے عقیقہ کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا ''قادیان میں صرف کھالیں بھیج دو''

2۔ سیر سے واپس آتے ہوئے ایک آدمی جو کہ مُلّا بھی تھا اور شاعر بھی اس نے منظوم کلام حضور کے خلاف لکھا تھا۔ معافی مانگنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ حضور نے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا خلوصِ دل سے معافی مانگو''

3۔ راوی بیان کرتا ہے کہ ان کی ایک لڑکی کی آنکھیں خراب تھیں۔ حضور نے فرمایا: ''نوردین کو کہو کہ کچھ ڈال دے'' اس کے بعد وہ لڑکی جتنے سال زندہ رہی اس کی آنکھیں کبھی خراب نہ ہوئیں۔

4۔ ایک دفعہ حضور نے دریافت کیا'' کہ سیالکوٹ میں طاعون کا کیا حال ہے؟ مَیں نے عرض کیا کہ بہت زوروں پر ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا ''مَیں نے خواب میں ایک ہاتھی دیکھا جو بہت حلیم تھا۔ جو ہڈیاں چباتا تھا مَیں نے پوچھا کون ہو؟ جواب دیا۔ طاعون کا فرشتہ''

5۔ ایک دفعہ حضرت مریم کا ذکر چل نکلا۔ ایک لفظ ''علیسہ'' آ گیا۔ مولوی محمد علی صاحب

سے دریافت کیا گیا وہ خاموش رہے۔حضور نے فرمایا۔’’کہ اس میں حضرت مریم علیہا السلام کی جوانی کی علامتیں ہیں اور یہ عبرانی لفظ ہے‘‘

(رجسٹر روایات نمبر 15)

آپ کے نواسے محترم داؤد بھائی کا بیان ہے کہ:

’’میرے دادا جان حضرت بابو ابراہیم رفیق حضرت مسیح موعودؑ(جو کہ نانا جان کے قریبی عزیز تھے اور نانا جان کی تبلیغ اور ان کی نیکی سے متأثر ہو کر انہوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا تھا) اپنے ایک عزیز کی شادی میں آپ کو ساتھ لے گئے۔لڑکی کی طرف سے شان وشوکت اور ڈھول باجے کے مطالبے کے باوجود نانا جی اور ان کے عزیزوں نے کوئی بری رسم نہ کرنے دی۔لڑکی والوں کو اتنا رنج پہنچا کہ وہ غصّے سے دیوانے ہو گئے۔انہوں نے دکھ سے اور احساس ندامت سے پاگل ہو کر شربت کے مٹکے توڑ دیئے جو انہوں نے مہمانوں کے لئے تیار کر کے رکھے ہوئے تھے۔جھگڑا طول اختیار کر گیا۔آخر کار بزرگوں کی مداخلت کرنے سے ان کا جوش ٹھنڈا پڑا اور رخصتی عمل میں آئی۔ہمارے بزرگ اپنے عقائد پر قائم رہے اور اس شادی میں کوئی بُری رسم نہ ہوئی۔

تقسیم ملک کے بعد نانا جان لمبا عرصہ بقید حیات رہے۔چلتے پھرتے،کام کرتے، پھول بوٹے لگاتے، کھیتی باڑی میں مصروف رہتے۔اپنے حلقۂ احباب میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پیغام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔تہجد گذار تھے، خدا تعالیٰ پر کامل یقین تھا۔جماعت سے بہت اخلاص اور غیرت رکھتے تھے۔جماعت کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتے تھے بلکہ کوئی مخالفت کی بات سُن لیتے تو ان کی طبیعت جوش سے بھر جاتی تھی۔مگر جب احرار کا زور تھا ان لوگوں نے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ایک طریقہ احمدیوں کو آزار پہنچانے کا یہ بھی تھا کہ ان کی خواتین نانا جان کی ڈیوڑھی میں آ جمع ہوتیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بُرے الفاظ میں یاد کرتے ہوئے سینہ کوبی کرتیں۔حضرت

نانا جان ان خواتین کی جاہلانہ حرکتوں پر کچھ نہ کہتے اور صبر سے ان کے طعنے اور ماتمی مکالمے سُنتے رہتے ۔آپ وَ اَعرِضْ عَنِ الجاھلین یعنی جاہلوں سے اعراض کرنے کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے خاموش رہتے۔

بچوں کی تربیت کرنے میں نانا جان کا بہت ہاتھ تھا۔ بچوں کو نماز کی عادت کے لئے ہر روز صبح سویرے جگانا ان کا معمول تھا۔ جماعت کے ساتھ تمام عمر خلوص کا تعلق رکھا۔قرآن پاک کا آخری عمر تک مطالعہ کرتے رہے۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

چندے باقاعدگی سے ادا کرنا آپ کا معمول تھا۔حضرت مصلح موعودؓ سے نہائت درجہ عقیدت تھی ۔خلافت کا احترام دل سے کیا کرتے تھے ۔ایک مرتبہ جب خلیفة المسیح الثانیؓ سیالکوٹ تشریف لائے ۔ان کی تقریر کے بعد مخالفین نے فساد کر دیا۔احمدی احباب نے حضرت مصلح موعودؓ کو بچانے کے لئے ایک دوسرے کے بازو پکڑ کر حصار بنالیا۔اس دوران لاٹھی لگنے سے نانا جان کا بازو ٹوٹ گیا۔مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت مصلح موعودؓ کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔''

محترم چوہدری میجر رحمت علی صاحب (حال ۔کیلیگری کینیڈا) ہمارے پیارے بزرگوں میں سے ہیں ۔اللہ تعالی ان کو صحت وتندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ان کا قیمتی وجود ہمارے لئے سلامت رکھے۔ان کے والد اور میرے نانا جان عم زاد تھے۔ایک ہی محلہ یعنی محلہ اراضی یعقوب میں رہتے تھے۔چوہدری رحمت علی صاحب نے نانا جان کو دیکھا ہے۔ان کے ساتھ ایک ہی گلی میں زندگی کا ایک لمبا عرصہ گزارا ہے۔آپ ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''حضرت مہر غلام حسن صاحب میرے نہایت پیارے بزرگ تھے جن کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات دلکش یادیں بن گئیں۔آپ بہت نیک اور شریف الطبع انسان تھے۔آس پاس کے لوگوں پر ان کا اثر و رسوخ ،ان کی نیکی اور شرافت کے رعب کی وجہ سے تھا۔نماز باجماعت اور تہجد کے پابند تھے ان کے ساتھ محلے کے کچھ اور بزرگ بھی باقاعدگی سے قریبی مسجد میں نماز تہجد

پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ یہ وہ مسجد ہے جس کو اہل محلہ یعنی احمدی احباب نے مل کر بنایا تھا۔ گھروں میں عام طور پر جگہ نہ ہوتی تھی۔مل کر تہجد پڑھنا مشکل تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ مسجدوں میں قیامِ نماز اس وقت کی تہذیب کا حصّہ بن چکی تھی مسجد کا احساس اور ماحول خدا تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے۔یہیں ہمارے بزرگ خدا کے حضور آنسو بہایا کرتے تھے۔نہ صرف نماز بلکہ آپ کبھی اعتکاف بیٹھ کر بھی اس مسجد کو سجاتے۔اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرمائے اور ہمیں ان دعاؤں کے پھل عطا فرمائے،آمین۔

اس زمانے میں سیالکوٹ شہر میں احمدیوں کی تین مساجد تھیں:نمبر ایک جامعہ مسجد احمدیہ۔یہ مسجد کبوتروں والی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔اس مسجد کے قریب ہی حضرت حکیم حسام الدین صاحبؓ کا گھر تھا جہاں 1904ء میں حضرت مسیح موعودؑ نے قیام کیا تھا۔دوسری مسجد محلّہ اراضی یعقوب میں تھی جہاں احمدی اور غیر احمدی احباب اکٹھے نماز پڑھا کرتے تھے۔وہ اپنی نماز الگ ادا کرتے تھے اور ہم اپنی نماز الگ،کبھی ان کی باری پہلے آجاتی اور کبھی ہمارے دوست پہلے پہنچ جاتے اور ہم پہلے نماز ادا کر لیتے۔سب کو ایک دوسرے کے عقائد کا احترام تھا۔پھر نہ جانے کیا ہوا۔شیطان نے ہمارے درمیان تفرقہ ڈال دیا۔وہ جو آپس میں شیر وشکر تھے اچانک بٹ گئے۔دل میلے ہوئے تو محبت اور احترام کی دیوار گرگئی۔1940ء میں احمدی اور غیر احمدی احباب کا آپس میں اختلاف ہو گیا۔دونوں فریق دعوے دار تھے اور برابر کا حق سمجھتے تھے۔بات بڑھ گئی۔لڑائی جھگڑا،دنگا فساد شروع ہو گئے۔لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔دونوں طرف مذہب سے جذباتی لگاؤ تھا۔مسجد کے قبضے کی خاطر لوگ کٹ مرنے کو تیار تھے چنانچہ مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔افسوس 1942ء میں ایک دن غیر احمدیوں کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔اس مسجد کے قریب ہی ایک جگہ تھی جس کو ''دارا'' کہا جاتا تھا۔1942ء میں یہ جگہ احمدیوں کو مسجد بنانے کے لئے دے دی گئی۔یہی موجودہ مسجد ہے جو کہ ہماری گلی کے کونے پر واقع ہے اور محلّے کی مسجد کہلاتی ہے۔

اس وقت پاکستان میں اتنے وسائل نہ تھے۔ بیکاری اور غربت عام تھی۔لوگوں کا زیادہ تر پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ یا پھر کسی قسمت والے کو تھوڑی بہت مزدوری مل جاتی تو وہ اس کو غنیمت جان کر یہ موقعہ نہ جانے دیتا۔معاش کی تنگی اور بے روزگاری کے باوجود ہمارے خاندان کے بزرگوں اور محلہ اراضی یعقوب کے کئی دوسرے احمدی احباب نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا۔سیالکوٹ کے دوسرے لوگ اس سعی میں شامل نہیں تھے چنانچہ ہمارے خاندانی بزرگوں نے اپنی بساط کے مطابق چندہ جمع کیا۔محلے کی مسجد کی ذمہ داری محترم غلام حسن صاحب نے لی تھی اس لیے انہوں نے چند بزرگوں سے چندہ وصول کیا۔قطرہ قطرہ دریا بنا اور پھر وہ دن بھی آیا کہ اللہ تعالی کے اس گھر کو بنانے کے لئے 4000 روپیہ اکٹھا ہو گیا۔اور اسی ’’دارا‘‘ جگہ پر ایک چھوٹی سی مسجد اور متعدد غسلخانے بنا دیئے گئے۔پھر اسی مسجد کو ہمارے بزرگوں نے آباد کیا۔اس وقت مساجد کے نام نہیں رکھے جاتے تھے۔اس کو آج بھی محلّے کی مسجد کہا جاتا ہے۔میں اس وقت بچہ تھا۔ذہن کے پردوں پر کچھ نقوش رہ گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والدمکرم سراج دین صاحب (پیدائشی احمدی) جو کچہری میں کام کرتے تھے۔انہوں نے 250 روپیہ اس مسجد کی تعمیر کے لئے ادا کیا۔نیز مسجد کے نلکے کا سارا خرچہ دیا۔محترم مہر غلام حسن صاحب نے یک صد روپیہ دیا اور باقی دوستوں نے اپنی توفیق کے مطابق رقوم دیں۔اللہ تعالی ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا۔عمارت بن گئی۔اللہ تعالی کے یہ عاجز بندے مل کر ایک دفعہ پھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئے۔ یہاں بھی محترم مہر غلام حسن صاحبؓ امام الصلوٰۃ تھے۔فجر کے وقت آپ لمبی نماز نہ پڑھایا کرتے بلکہ چھوٹی چھوٹی سورتوں پر اکتفا کرتے اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ کسان تھے انہوں نے جلد اپنے کاموں پر جانا ہوتا تھا۔دوسرے آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث شریف پر بھی عمل کرتے تھے کہ امام اتنی لمبی نماز نہ پڑھے کہ لوگ اُکتا جائیں۔مکرم مہر غلام حسن صاحبؓ چونکہ علم دوست تھے۔قرآن اور حدیث کا علم بھی خوب رکھتے تھے اس لئے فجر کی نماز کے بعد درس دینا بھی آپ کی ذمہ داری تھا۔وقت کی قلت اور کسانوں کا خیال

کرتے ہوئے آپ مختصر درس دیتے مگر تھوڑے سے وقت میں آپ علم وعرفان کے موتی بکھیر دیتے۔ جمعہ کی نماز جامعہ مسجد یعنی کبوتروں والی مسجد میں ہوتی تھی۔ آپ وہاں باقاعدگی سے نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔ رمضان المبارک میں اسی بڑی مسجد میں درس اور اعتکاف ہوتا تھا۔ آپ اعتکاف بھی یہیں بیٹھتے تھے۔ اسی مسجد میں حافظ صاحب رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے تھے۔ اور تقریباً سب بزرگ شامل ہوا کرتے تھے۔ محلّے کی مسجد میں نہ صرف ہمارے محلہ کے لوگ نماز پڑھتے بلکہ بعض مخلص احباب دور دور سے بھی آتے اور نماز با جماعت کا ثواب حاصل کرتے۔ اس وقت سیالکوٹ کے سیکرٹری مال مکرم پٹواری اللہ دتہ صاحب ؓ تھے۔ بہت نیک اور اخلاص رکھنے والے بزرگ تھے۔ یہ بزرگ بابا بیری کے مقام پر رہتے تھے جو کہ مسجد سے دو ڈھائی میل دور تھا۔ ان کی مسجد سے محبت کا یہ عالَم تھا کہ آپ ہر نماز مسجد اراضی یعقوب میں آکر ادا کرتے۔ آپ نے ایک گُتھلی گلے میں لٹکائی ہوتی تھی۔ جس میں وہ احباب کے دو آنے یا چار آنے جمع کیا کرتے تھے۔ بچپن کی یادوں میں ان کا خاکہ بہت گہرا ہے۔

مکرم مہر غلام حسن صاحب ؓ کو ابتدائی احمدی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس وقت آپ کو احمدیت قبول کرنے کی توفیق ملی جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعوی کی بالکل ابتداء تھی۔ اور ہر کوئی حیرت بلکہ ہنسی میں آپ کی باتوں کو اڑا دیتا تھا۔ لوگ آپ کو ماننے کو تیار نہ تھے اس مردِ مجاہد نے ایسے وقت میں آپ کو مانا اور پھر آپ کے پیغام کو پھیلانے کے لئے ہر دم کوشش کرتے رہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کتابوں کا مطالعہ آپ کا اوّلین مشغلہ تھا۔ ان کو حضورؑ کے اشعار بھی خوب یاد تھے۔ آپ کی سیرت کا ایک بڑا پہلو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دین کو پھیلانا تھا۔ آپ کو تبلیغ کا جنون تھا۔ اسی محلّے میں ایک آدمی رہتا تھا جس کا نام محمد شریف پٹواری تھا۔ یہ ہمارا رشتہ دار تھا۔ اس کی بداخلاقی کی وجہ سے مَیں نے ساری عمر کبھی اس سے بات نہ کی تھی۔ مگر حضرت مہر غلام حسن ؓ کا یہ حال تھا کہ جونہی گلی میں اس سے مڈبھیڑ ہو جاتی اس کو تبلیغ کرنی

شروع کر دیتے۔وہ بدبخت دشنام درازی پر اتر آتا۔اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔گال غصے سے پھول جاتے۔منہ سے جھاگ بہہ نکلتی اور وہ نہایت بُری زبان استعمال کرتا،گالیوں تک بھی نوبت پہنچ جاتی مگر حضرت مہر غلام حسن صاحبؓ اپنا کام کئے جاتے اور کئی دفعہ بے عزتی کروانے کے باوجود اپنے مشن سے نہ ہٹتے۔آتے جاتے اس کو خدا تعالیٰ کا پیغام سناتے رہتے۔میں یہ سب کچھ دیکھتا رہتا کیونکہ میں بھی اسی گلی میں چلتا پھرتا اور کھیلتا تھا۔مجھے یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی۔آخر کار میں نے ایک دن ہمت کر کے پوچھ ہی لیا،''چاچا جی جب یہ آپ کی بات ہی نہیں سنتا اور اتنی بدکلامی کرتا ہے تو کیوں آپ اس کو تبلیغ کرتے ہیں؟'' انہوں نے بہت تحمّل سے جواب دیا:''میرا کام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پیغام پہنچانا ہے میں یہ کام کرتا رہوں گا کوئی چاہے سُنے یا نہ سُنے''۔

ان کی سیرت کا دوسرا نمایاں پہلو بچوّں کو نماز کی تلقین کرنا تھا۔میرا گھر مسجد کے سامنے تھا۔میرے کمرے کی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔وہ ہر روز صبح سویرے مجھے کھڑکی بجا کر جگاتے اور جب تک میری آنکھ کُھل نہ جاتی، ٹلتے نہ تھے۔یہی حال ان کا اپنے بچوں کے بارے میں تھا۔انہوں نے بچوّں کی تربیت پر پورا زور لگایا۔اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو نیک ہدایت دے اور احمدیت کے مخلص کارکن بننے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

سیرت کا تیسرا پہلو اُن کا ربُّ العزت سے سچّا لگاؤ اور ان کی قبولیّت دعا تھی۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا خاص تعلق تھا۔وہ صاحب الہام تھے جس کا میں خود گواہ ہوں۔یہ 1945ء کی بات ہے میں اپنی جماعت میں good student یعنی بہترین طالب علم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ہوا یوں کہ فرسٹ ایئر میں مجھے ہاکی کھیلنے کا خبط ہوا۔کتابوں سے ایک دفعہ دل اٹھا تو اٹھتا ہی چلا گیا۔ہاکی ہمارے وطن کا قومی کھیل ہے۔سیالکوٹ میں کھیل کا بہت شوق پایا جاتا ہے۔کبھی کبھی جب ہاکی کا موسم عروج پر ہوتا ہے تو بہت سے طالب علم ہاکی کے شوق میں سکول کا راستہ بھول جاتے ہیں۔میں بھی انہی میں سے ایک تھا۔کتابوں کی حیثیت ثانوی سی رہ گئی۔کھیل

اوّلین فریضہ بن گیا۔جس کا نتیجہ امتحان میں ناکامی کا باعث ہوا۔ریاضی میں بُری طرح فیل ہو گیا۔لڑکپن تھا۔ بڑوں کی ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑادی۔ناکامی کے باوجود ہاکی کا جنون نہ اترا بلکہ نامور کھلاڑی بننے کی خواہش پہلے سے بھی زیادہ زور پکڑ گئی۔وقت کا پتہ ہی نہ چلا اور جزوی یعنی سپلیمینٹری امتحان دینے کا وقت آ پہنچا۔ چند دن باقی تھے تو پڑھنے کا احساس پیدا ہوا۔ ہمارے ایک احمدی دوست تھے جن کا نام محمد امین صاحب تھا۔وہ بی اے پاس تھے اور مجھے پڑھانے آتے تھے۔میں نے پڑھنا کیا تھا بس وقت گذاری تھی۔جب ڈیڑھ دو ہفتے باقی رہ گئے تو فکر پیدا ہوئی۔ میں نے محمد امین صاحب پر زور دینا شروع کر دیا کہ مجھے سارا کورس پڑھا دیں۔وہ بھی ناراض ہوئے کہ اتنے تھوڑے وقت میں کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ تم سارا نصاب پڑھ لوگے۔اب وقت کم ہو گیا تھا۔گذرے ہوئے وقت کو میں لوٹا نہیں سکتا تھا۔میں نے ان پر زور دیا کہ اچھا چلئے ضروری اور اہم سوالات ہی کروا ڈالیں۔آ گا دوڑ پیچھا چھوڑ والا معاملہ تھا۔ مجھے یقین تھا میں اس بار بھی ناکام ہو جاؤں گا۔اب کے ناکامی کا مطلب تھا کہ میرا ایک سال ضائع ہو جائے گا جس کا اب مجھے بہت دُکھ ہو رہا تھا۔

میں صحابیوں کی اولاد تھا۔گو مَیں بچہ تھا مگر دعا پر کامل یقین تھا۔ابھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہؓ زندہ تھے اور سامنے چلتے پھرتے تھے۔میری مراد مکرم مہر غلام حسن صاحبؓ تھے۔خدا تعالیٰ کا سہارا ہی باقی تھا۔اعتقاد تھا۔اللہ تعالیٰ پر حُسن ظنی تھی اور اس بات پر بھی یقین تھا کہ نیک بندوں کی دعا مولا کریم سن لے گا۔ چنانچہ جونہی میری ان پر نظر پڑتی مَیں آگے بڑھ کر نہایت پیار اور عاجزی سے سلام عرض کرتا اور دعا کے لئے درخواست کرتا۔وہ ہر نماز پر آتے۔اُن کو دیکھتے ہی مَیں بھی پہنچ جاتا اور اپنی التجا دُہرا دیتا۔ چاچا جی کو ہم بچوں سے پیار تھا۔وہ دعاؤں میں لگ گئے۔

امتحان سے چند دن پہلے مجھے دیکھ کر بُلایا جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔مجھ سے پنجابی میں یوں مخاطب ہوئے ’’اوئے مَیں دعا کیتی سی مَینوں پتہ چلیا اے کہ توُں فرَسٹ آیاں اَے‘‘ (اوہ۔

مَیں نے دعا کی تھی مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے پتہ چلا ہے کہ تم اوّل رہے ہو)

ایک طرف میں نے نہایت سنجیدگی سے آخری گھڑیوں میں کتابیں الٹنی پلٹنی شروع کر دیں۔ دوسرا حربہ یہ اپنایا کہ چاچا جی کو پہلے سے زیادہ کثرت سے دعا کے لئے کہنا شروع کر دیا۔ امتحان سے ایک دن پہلے پھر مَیں نے دعا کی درخواست جو کی تو انہوں نے پھر فرمایا۔ ''میں نے دیکھا ہے کہ تم فرسٹ آ گئے ہو'' اب امتحان کا وقت آ پہنچا تھا۔ پرچہ جو سامنے آیا تو میرا سر گھوم گیا۔ ریاضی کا مضمون میرا ازلی دشمن تھا میرے اندر خود اعتمادی کی کمی تھی۔ کوئی سے 5 سوال حل کرنے تھے۔ مجھے اپنی نااہلیت اور ناقابلیت پر رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ یہ پرچہ میرے لئے ہمیشہ کی طرح مشکل تھا۔ خیر مجھے ترکیب یہ سوجھی کہ سارا پرچہ حل کر لیا جائے۔ دل نے سوچا شاید کہیں ڈور اٹک ہی جائے آزمانے میں کیا حرج ہے۔ جیسا تیسا بھی پرچہ کیا، غنیمت تھا۔ پرچے کے پہلے صفحے پر میں نے لکھا please see any five کوئی سے پانچ سوال دیکھئے ۔

میں خود بھی دعا کرتا رہا اور چاچا جی کو بھی کہتا رہا۔ پھر وہ دن بھی آ پہنچا جب ہمیں نتیجے سے آگاہ کیا جانا تھا۔ کالج کھل گئے۔ سپلیمنٹری امتحان میں ہم 19 طالب علم تھے۔ میرا رول نمبر 206 تھا۔ ہمارا استاد ایک ہندو تھا۔ اس نے نتیجے کا اعلان کرنا شروع کیا۔ میرا پرچہ دیکھ کر حیران ہو کر پوچھا کیا تم نے نقل لگائی ہے؟ مَیں نے انکار کیا۔ استاد نے مجھے پرچہ نہ دیا اور تہہ کر کے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ جب تمام طالب علم چلے گئے تو مجھے اپنے پاس بلا لیا اور پھر استفسار کیا کہ کیا تم نے نقل لگائی ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ مَیں نے امتحان پاس کر لیا ہے میں خود بھی حیران تھا کہ وہ ایسا سوال مجھ سے کیوں کر رہا ہے۔ میں نے کہا ''نقل مَیں نے کس سے کرنی تھی؟'' پھر اس استاد نے دوبارہ نمبر گنے۔ شاید کسی عدد کو دو مرتبہ نہ گن لیا ہو۔ اچھی طرح دیکھنے اور پرکھنے کے بعد اس نے مجھے پرچہ دیا۔ میری عجب کیفیت تھی۔ جب مجھے پرچہ ملا تو مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مَیں نے پورے نمبر یعنی 150/150 حاصل کئے تھے اور مَیں واقعی اوّل رہا تھا۔ الحمدللہ''

حضرت غلام حسن صاحبؓ دعا گو انسان تھے۔ ہر اہم کام کے لئے استخارہ کیا کرتے تھے۔

لوگ آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔اردگرد کے لوگ آپ کو نیک انسان سمجھتے تھے۔بعض لوگ پانی وغیرہ پر آپ سے دم کرواتے اور مریض کو دیتے۔طاعون کے دنوں میں خاص طور پر مصیبت زدہ مخلوق دعا کے لئے درخواست کرتی اور آپ کا دم کیا ہوا پانی یا دودھ لوگ لے کر جاتے۔اللہ تعالیٰ نے ایک اور بھی فضل آپ پر کر رکھا تھا وہ یہ کہ آپ کے پسینے میں شِفا کی تاثیر تھی۔آس پاس میں جب کسی کو چھپاکی نکل آتی تو لوگ آپ کا کرتہ لے جاتے اور مریض کو پہناتے جس سے آرام آجاتا۔

اللہ کے فضل وکرم سے نانا جان صاحب کشف والہام تھے۔اللہ تعالیٰ سے دوستی ایسی کہ سجدے میں پڑے ہیں اور اس زاری اور رقت سے خدا تعالیٰ کے حضور گڑگڑائے کہ منوا کر ہی چھوڑا۔امی کے میٹرک کے سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ریاضی کا پرچہ غیر معمولی طور پر نہایت مشکل آیا۔آپ نے درد والحاح سے دعا کی تو نماز میں ہی غیبی آواز آئی ''بیٹی پاس ہے''

1930 کی بات ہے کہ ماموں نذیر احمد مبشرؓ نے جامعہ احمدیہ سے مولوی فاضل کا امتحان دیا۔والد صاحب کو دعا کے لئے لکھتے رہتے تھے۔آپ نہایت توجہ سے دعا کر رہے تھے۔ان کو کشف میں ایک تختی پر سنہری حروف میں ''نذیر احمد پاس'' کے الفاظ دکھائی دیئے۔

نانا جان کے سب سے چھوٹے بھائی محترم غلام علی صاحب بیمار ہو گئے۔نانا جان نے دعا کی۔ایک دن پنجابی زبان میں الہام ہوا ''اَسِی غلام علی نوں لے چلے کرلو جو کرنا ہے۔'' پھر اسی بھائی کی عین جوانی میں وفات ہوگئی۔

حضرت غلام حسن صاحبؓ کی شادی اور اولاد

پہلی بیوی حضرت دولت بی بیؓ کے ہاں سب سے پہلے ایک بیٹی محترمہ مریم صاحبہ پیدا ہوئی۔ پھر یکے بعد دیگرے آٹھ نوزائیدہ بیٹے فوت ہو گئے۔پھر آخر میں مکرم نذیر احمد مبشر صاحب کی پیدائش ہوئی۔چھوٹے بھائی کی وفات کے بعد پہلی بیوی نے بھاوج کے ساتھ نکاح کرنے کی تحریک کی۔ دوسری اہلیہ سے تین بچے محترم رشید احمد، محترمہ مبارکہ قمر اور محترم انعام اللہ خلیل پیدا ہوئے۔

آخری علالت اور وفات

حضرت غلام حسن صاحبؓ کی طبیعت میں جفاکشی بھی بہت تھی ۔ تیز قدم اُٹھا کر چلتے تھے۔محنت کے عادی اور ایماندار انسان تھے۔آخری عمر میں یادداشت بہت کمزور پڑ گئی۔ کچھ عرصہ صاحبِ فراش رہ کر اپنے دور کا بے دھڑک اور نڈر مبلغ ،نہایت پیار کرنے والا وجود، دین سے وفا کرنے والا دعا گو بزرگ دنیائے فانی سے کُوچ کر گیا۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس وقت چونکہ ماموں نذیر احمد مبشر صاحبؒ افریقہ میں داعی الی اللہ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ازراہِ شفقت آپ کا جنازہ پڑھایا۔آپ کی وفات سیالکوٹ میں ہوئی جنازہ ربوہ لایا گیا اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں تدفین ہوئی۔

محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ اہلیہ محترم غلام حسن صاحبؓ

ہماری نانی جان محترمہ عائشہ بیگم نانا جان کی دوسری بیوی تھیں۔نانا جان محترم غلام حسن صاحب نے 1894ء میں بیعت کی اور بیوی صاحبہ کو بھی تحریک کی تو نانی جان نے کہا کہ میں نے کافی دیر پہلے دل سے اس بزرگ کو مان لیا ہوا ہے۔حضور کی صداقت کو تسلیم کر لیا مگر اظہار نہ کیا تھا۔پھر میاں بیوی کو دستی بیعت کا موقعہ بھی مِل گیا۔کئی مرتبہ قادیان جلسہ سالانہ پر جانے کی سعادت حاصل ہوئی اور حضرت مسیح موعودؑ سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔1904 میں جب حضورؑ سیالکوٹ تشریف لائے تو وہاں بھی ان کو حضورؑ کی زیارت نصیب ہوئی۔

نانی جان اور دادی جان کے والد بھائی تھے اور ان دونوں کی مائیں دو بہنیں تھیں یعنی دو بھائیوں کی ایک ہی گھر کی دو لڑکیوں سے شادی ہوئی تھی۔نانی جان چند برس کی تھیں تو آپ کے والدین یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔پھر دادی جان کے والدین یعنی خالہ اور تایا نے آپ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔نہ صرف عمدہ انداز میں پرورش کی بلکہ گھر میں ٹیوٹر رکھ کر باقاعدہ تعلیم دلائی۔

آپ چونکہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔علم کی جستجو تمام عمر رہی۔قرآن کا ترجمہ اور معانی وتفسیر پر غور کرتیں۔ ان کا ذاتی قرآن ہمارے ہاں ایک لمبے عرصہ تک رہا جس کو ہماری امی نہایت عقیدت سے پڑھا کرتیں۔اردو زبان بہت اچھی تھی۔آپ نے بہت سے بچوں کو بھی قرآن پڑھایا۔دعا اور ذکر خدا میں مشغول رہتیں۔سید الاستغفار اور دوسری دعائیں بلند آواز سے پڑھتی رہتیں۔آپ نہایت عبادت گذار،صوم وصلوٰۃ کی پابند تہجد گذار، مالی قربانی کرنے والی، اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے والی خاتون تھیں۔نانا جان اور نانی جان قرآن پڑھتے اور اپنے اپنے علم کے مطابق تفسیر کرتے۔پھر دونوں میں اختلاف ہو جاتا۔دونوں اپنی اپنی کی ہوئی تفسیر کو درست سمجھتے اور پھر جب ماموں نذیر احمد مبشرؒ گھر آتے تو ہمارے دونوں بزرگ اپنا علمی اختلاف ان کے سامنے رکھتے جس کو سُن کر محترم ماموں نذیر احمد مبشرؒ دونوں کے درمیان تصفیہ کراتے یعنی دونوں کی تفسیر اپنی اپنی جگہ درست ہے۔

نانی جان نے اپنے بچوں کو خود ہی قرآن پڑھایا۔آپ کی ایک بیٹی عصمت تھی جس نے نانی جان سے 5 برس کی عمر میں قرآن پڑھ لیا تھا۔اللہ کے فضل وکرم سے وہ بچی اتنی ذہین تھی کہ اتنی سی عمر میں نہ صرف درست تلفظ پڑھنا سیکھ لیا تھا بلکہ جب کوئی اور قرآن پڑھ رہا ہوتا اور غلطی ہو جاتی یہ بچی فوراً اُس غلطی کو درست کر لیتی۔ایک مرتبہ ہمارے محلہ کے ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو کہا مَیں ایسی بچی کو جانتا ہوں جو دور بیٹھے سُن کر قرآن کی غلطیاں نکال لیتی ہے۔دونوں نے شرط باندھی اور اس بچی کا امتحان لینے چل پڑے۔جب وہ دونوں عصمت سے ملاقات کیلئے ان کے گھر کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں عصمت کی قبر پر مٹی ڈالی جا چکی تھی۔

نانا جان اکثر اپنے گھر میں تبلیغی نشست جماتے۔نانی جان ان مہمانوں کی ضیافت کا انتظام نہایت عمدہ طریق سے انجام دیتیں۔

آپ نہایت دعا گو خاتون تھیں۔ان کی قبولیت دعا کا ایک اور واقعہ درج کرتی ہوں:

کئی سال قبل جبکہ آپ کے دونوں بچے تھے ایک دن آپ ان بچوں کے ساتھ باہر

زمینوں پر تھیں کہ سیلاب آ گیا۔شام کا وقت تھا۔ بچے کچھ فاصلے پر ڈیرے پر سو رہے تھے۔ پانی نہایت سرعت سے چاروں طرف بھر گیا۔ ماں باپ اور بچوں کا رابطہ کٹ گیا۔بس ایک خدا کا سہارا تھا۔ نانی جان نے دعا شروع کر دی۔ ساری رات نہایت بے قراری سے اللہ تعالیٰ کو پکارتی رہیں۔صبح جب سیلاب کا زور ٹوٹا تو ڈھونڈنا شروع کیا۔کیا دیکھتے ہیں کہ چارپائی ایک درخت کے ساتھ اٹک گئی تھی۔ اس پر بچے بے خبر سو رہے تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے نانی جان کی دعا قبول فرمالی اور دونوں بچے اللہ کے فضل سے زندہ سلامت مل گئے۔

نانی جان کی طبیعت بہت نرم تھی مگر بچوں کو نماز کی عادت ڈالنے کے لئے ماموں پر کسی قدر سختی سے بھی گریز نہ کیا کیوں کہ یہ خدا تعالیٰ کا حکم تھا۔نیک، صدقات دینے والی خاتون تھیں۔ جب کوئی مشکل ہوتی یا منذر خواب دیکھ لیتیں تو ہر وہ جنس جو گھر میں موجود ہوتی اس میں سے کچھ صدقہ نکالتیں یعنی آٹا، چاول، دالیں، چینی، گندم، گڑ، چنے وغیرہ خدا تعالیٰ کی راہ میں دینا ان کا معمول تھا۔ جماعت کے ساتھ ساری عمر وفا کی۔ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا۔ زبان بند ہوگئی۔ دو دن بیمار رہ کر مولا سے جا ملیں۔ آپ موصیہ تھیں۔اس لئے ان کو قادیان کے بہشتی مقبرہ میں لے جایا گیا اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمارے حق میں ان کی دعاؤں کو قبول فرمائے۔آمین۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے موصیہ تھیں۔22 دسمبر 1942 میں وفات ہوئی۔ جنازہ سیالکوٹ سے قادیان لے جایا گیا۔بہشتی مقبرہ قادیان میں تدفین ہوئی۔

نانی جان کے پانچ بچے تھے۔مکرم بشیر احمد صاحب، مکرمہ محمودہ بیگم صاحبہ، مکرم رشید احمد، مکرمہ مبارکہ قمر صاحبہ، مکرم انعام اللہ خلیل صاحب۔

محترمہ مریم بی بی صاحبہ

محترمہ خالہ مریم بی بی صاحبہ محترم غلام حسن صاحب کی پہلوٹھی کی اولاد تھیں۔آپ 1898ء یا 1899ء میں پیدا ہوئیں۔بچپن سیالکوٹ میں گذرا۔دینی تعلیم اور قرآن پاک والدین نے ہی پڑھایا۔1903ء میں نانا جان اور نانی جان کی معیت میں حضرت مسیح موعودؑ سے ملاقات کی۔حضور کے لئے ان کے کمرے میں صراحی رکھی تھی جس پر مٹی کا آبخورہ اُلٹا دھرا تھا۔خالہ مریم نے اس آبخورے سے پانی پی لیا تو حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا ''لڑکی اب یہ آبخورہ تُو ہی لے جا'' اور آپ کو یہ آبخورہ عنایت کر دیا۔آپ حضور کا یہ تحفہ خوشی خوشی لے کر گھر کو چل دیں۔جو عرصہ دراز تک ان کے ہاں طاق میں حضرت مسیح موعودؑ کی مقدس نشانی کے طور پر محفوظ پڑا رہا۔ان کے ہاں تین بچے پیدا ہوئے۔

محترمہ رضیہ بیگم صاحبہ،محترم داؤد احمد صاحب،محترم بشارت احمد صاحب،امی سے ان کو بہت پیار تھا۔امی کی نرینہ اولاد کے لئے بہت دعائیں کیا کرتی تھیں۔اباجی کا بھی بہت احترام کرتی تھیں جب ان کو ملنے کے لئے آتیں تو خوبصورت رومال ہاتھ سے کشیدہ کر کے بطور تحفہ پیش کرتیں اباجی خوش ہو کر بلند آواز سے شکریہ ادا کرتے کہ بہن ہو تو ایسی ہو۔وہم کی حد تک صفائی پسند تھیں۔طبیعت میں نفاست اور سلیقہ تھا۔

14 برس کی عمر میں ان کی شادی محترم محمد یٰسین ولد حضرت بابو ابراہیم صاحب سے طے پائی۔نہایت سادگی سے رخصتانہ کی تقریب ہوئی۔ہمارے بزرگ چونکہ احمدیت سے پہلے اہلِ حدیث تھے۔بدرسومات سے پرہیز کرتے تھے۔شادی کے موقعہ پر ڈھول تماشے نہ ہوتے تھے۔

پہلی بیٹی رضیہ بیگم صاحبہ کے بعد دو بچوں کی وفات ہوگئی۔پھر آپ نے رحم کی لمبی بیماریاں کاٹیں مگر بہت صابر خاتون تھیں۔اللہ تعالیٰ کو ان کا صبر پسند آیا اور 13 برس گذر جانے کے بعد محترم بھائی داؤد پراپرٹی ڈیلر اسلام آباد (حال کینیڈا) کی پیدائش ہوئی۔بچے کی ولادت سے پہلے حمل کا سارا عرصہ بستر پر لیٹنا پڑا جو کہ انکے لئے نہایت صبر آزما تھا۔خالق و مالک کے اولادِ نرینہ کے

انعام پر آپ کی خوشی قابلِ دید تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا جودیا تو پھر یہ تمنا بھی دل میں بھڑکی کہ اس کا ساتھی بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ آپ کی گریہ وزاری قبول ہوئی اور چار برس کے بعد محترم بھائی بشارت پیدا ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں کی کم عمری میں گھر میں آسودہ حالی نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ، جو رازق بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی ہے، نے بے انتہا دیا۔ خالہ مریم صاحبہ کی یہ خواہش تھی کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ آپ ربوہ کی آبادکاری کے وقت بنائے گئے سٹیشن کے قریب کچے گھر میں رہتی تھیں۔ بشارت بھائی کو صبح 6 بجے والی گاڑی پر ہر روز سکول کے لئے چنیوٹ بھجواتی تھیں۔ چھوٹا سا بچہ ٹھٹھرتا ہوا جاتا مگر اس ماں کی ہمت اور صبر نے اسے تعلیم اور دنیاوی عزت وجلال سے نوازا۔

قبولیتِ دعا

داؤد بھائی چونکہ 13 برس کے وقفے کے بعد پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کو ناز و نعمت سے پالا گیا۔ وہ بچپن میں ٹائیفائیڈ کا شکار ہو گئے۔ تیز بخار میں ہذیانی کیفیت ہوگئی اور حالت دگرگوں ہوگئی۔ ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا گیا تو اس نے کہا کہ ان کی زندگی کے آثار بہت کم ہیں۔ یہ سُن کر اس ماں کے دل کی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کو برسوں کی تمناؤں اور امیدوں کے بعد بیٹا ملا ہو اور اب وہ مرض کی شدت سے حواس باختہ ہو چکا ہو۔ خالہ مریم نے وضو کیا اور اپنے حیّ و قیوم سے اپنے لعل کی زندگی کی طلب کے لئے سجدے میں گر گئیں اور نہایت کرب اور زاری سے دعائیں کرنی شروع کر دیں۔ ان کو خود بھی قبولیتِ دعا پر بہت یقین تھا اور اس بات پر بھی ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ پر یقینِ کامل تھا۔ وہ اپنے رب کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتی رہیں۔ اللہ، جو اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ کا وعدہ دینے والا ہے اور رحیمیت اور رحمانیتّ کی صفات سے پُر ہے، نے ان کی گریہ وزاری کو قبول فرمایا۔ بچے کی ہذیانی کیفیت دور ہوگئی اور بخار کی شدّت میں کمی آ گئی اور اس کو معجزانہ شفا ہوگئی اور جب وہ نماز مکمل کر کے بچے کو دیکھنے آئیں تو بچہ سکون کی نیند سو رہا تھا۔

ان کی وفات بجلی کا کرنٹ لگنے سے ہوئی۔ جنازہ سسرال کے گاؤں دوالمیال لے جایا گیا اور وہیں دفنایا گیا۔

مکرم حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ صاحب (مبلغ گھانا)
کی یاد میں لکھی گئی ایک آزاد نظم

اک غریب الوطن مجاہد
محبت کا پیکر گھنے جنگلوں میں
پُر پیچ انجانے راستوں پر
پیار کے گیت گاتا رہا تھا
بھوکا پیاسا حق کی طرف بُلا رہا تھا
تھے اس کی محفل میں اُمی، وحشی اور قاتل
عالمِ دیں بن گئے جو تھے مطلق جاہل
جس نے ہر خوشی دینِ احمد پہ وار دی تھی
کس کے اعجاز نے ان کی قسمت نکھار دی تھی
آندھیوں، طوفانوں میں سر بکف سپاہی
ننھی کشتی میں خونخوار لہروں سے لڑ رہا تھا
اپنے خون کے چھینٹوں سے
صحرا میں شفق رنگ بھر گیا تھا
اندھیری راتوں میں رب سے محوِ سرگوشیاں

فلک پہ تارے سن رہے تھے
جس کی تیغِ دعا سے زمیں ہل گئی
ناگہاں تقدیرِ الٰہی چل گئی
توقیرِ مسیح کی طلب اور تمکینِ دیں مقصود
نشاں بن گئی جنبشِ زمیں ہُوا خلق کا ورُود
اللہ والے کے لئے دن ہو گئے پُرسعود
پالیا جس نے مبشر کا خطاب
داخلِ فردوس ہو وہ بے حساب

حضرت مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ (مبلغ گھانا)

مولانا نذیر احمد صاحب مبشرؒ ہمارے بڑے ماموں تھے۔ شائد وہ خاندان میں ہر لحاظ سے بڑے تھے۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوتا تھا جب وہ ہمارے گھر تشریف لاتے۔ اور بھی مختلف عزیز و اقارب ربوہ میں رہتے تھے لیکن جتنی آؤ بھگت اور عزّت ہمارے ابا جی اُن کی کرتے تھے اس کا رنگ ہی اور تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بادشاہ آ گیا ہے حالانکہ وہ اکثر آیا کرتے تھے۔ بچپن کی یادوں میں یہ نقوش بہت گہرے ہیں۔

حضرت غلام حسنؓ کے متعدد بیٹے یکے بعد دیگرے کم عمری میں وفات پا گئے۔ ماموں نذیر کی پیدائش سے پہلے والد صاحب کو خواب میں دکھلایا گیا کہ بیٹا پیدا ہوگا اور وہ زندہ رہے گا نیز اس کو وقف کرنے کا بھی اشارہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہی اس کو وقف کر دیا۔

جب آپ کی پیدائش ہوئی تو محلے کی خواتین نے نانی امّاں کو بچے کو دودھ پلانے سے منع کر دیا۔ نانی جان کو ایک بیماری تھی جس کے نتیجہ میں دودھ زہر باد ہو جاتا تھا اور بچہ مر جاتا تھا۔ اس وقت محلہ اراضی یعقوب میں کئی خواتین تھیں جن کے ہاں نوزائیدہ بچے تھے۔ ان سب خواتین نے رضا کارانہ اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ خاص خیال رکھتیں۔ جونہی ماموں کے رونے کی آواز سُنائی دیتی کوئی نہ کوئی عورت پہنچ جاتی اور ماموں کو دودھ پلا جاتی۔ اس حوالے سے آپ کی گلی میں بہت سی خواتین آپ کی رضاعی مائیں تھیں اور ان کی بیٹیاں آپ کی رضاعی بہنیں تھیں جو آپ سے پردہ نہ کرتی تھیں اور جن کی آپ خاص طور پر بہت عزت کرتے تھے اور دلجوئی کرتے تھے۔

والد صاحب نے ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیا۔ اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسہ احمدیہ قادیان میں داخلہ دلوا دیا۔ ایک طرف باپ کی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا آسمانِ احمدیت پر ستارے کی مانند چمکے دوسری طرف فطری محبت جوش مارتی تھی۔ چنانچہ حضرت مہر غلام حسنؓ اپنے بیٹے کو قادیان تعلیم کے لئے چھوڑ کر جانے لگے تو مارے محبت

کے بار بار واپس پلٹ کر آ جاتے اور بچے کو پیار کرتے۔آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں،قدم بھاری تھے۔آپ کی پیدائش سے پہلے جو وعدہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔اس کو پورا کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔مگر امتحان بہت کڑا تھا۔ماموں نذیر بھی سر جھکائے کھڑے تھے۔وہ اپنے باپ کی یہ حالت دیکھ کر نہ رہ سکے اور بول اُٹھے کہ آپ جائیں اور مجھے اللہ کے حوالے کر دیں۔ آخر کار اس مومن باپ نے اپنی محبت کو اللہ کے حضور قربان کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی تھکے قدموں سے گھر لوٹ آئے۔

حضرت غلام حسنؓ کا دل بیٹے میں اٹکا رہتا تھا۔اس کی صحت کا خیال رہتا۔چنانچہ آپ نے قادیان کے ایک حلوائی کو تاکید کی کہ میرے بیٹے کو ہر روز دودھ مہیا کر دینا جس کا بِل والد صاحب کو خود ادا کرنا تھا۔مگر ماموں نذیرؓ نے کبھی دودھ نہ پیا۔ہمیشہ خاکساری ہی برتتے رہے۔ آپ خدا ترسی اور خدمتِ خلق کا چھوٹے سے چھوٹا موقعہ بھی نہ جانے دیتے تھے اور کبھی ان کی ان نیکیوں میں والد بھی شریک ہو جاتے۔ چنانچہ جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ایک بڑی کلاس کے طالبِ علم کے پاس کتابوں کے لئے خرچہ نہ تھا۔ماموں جان نے گھر والد کو لکھا کہ فلاں طالب علم کے پاس رقم نہیں ہے ان کو آپ کتابیں خرید دیں۔ پہلے وہ استعمال کر لیں گے پھر مَیں خود فائدہ اٹھاؤں گا۔چنانچہ نانا جانؓ نے ان کی اس خواہش کا فوراً احترام کیا اور کتابوں کے لئے رقم ارسال کر دی۔

ماموں نذیرؓ محنتی انسان تھے۔جامعہ کے امتحان بہت مشکل ہوا کرتے تھے۔امتحان دینے کے بعد آپ دعاؤں میں مصروف ہو گئے تو نماز کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی کی بشارت دی۔

یہ واقعہ مولانا غلام باری سیف نے یوں قلم بند کیا ہے:

1930 میں جامعہ احمدیہ سے مولوی فاضل کا امتحان دینے کے بعد مولانا نذیر احمد مبشرؓ صاحب کو سیالکوٹ کے دورہ پر بھجوایا گیا۔ پسرور میں ظہر کی نماز کے آخری سجدہ میں آپ نے حضرت

جبرائیل علیہ السلام کی آواز سُنی ''نذیر احمد پاس'' جسے اقتداء میں نماز پڑھنے والے چوہدری محمد حسین صاحب نے بھی سُنا اور اِسی قِسم کی خواب آپ کے والد صاحبؓ نے بھی دیکھی۔انہیں بھی ایک روز قبل کشف میں ایک تختی پر سُنہری حروف میں ''نذیر احمد پاس'' کے الفاظ دکھائے گئے۔قادیان کے جامعۃ المبشرین میں آپؒ نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کرلیا۔جامعہ کی تعلیم حاصل کرکے ماموں گھر (سیالکوٹ) آگئے۔والدزمیندارہ کرتے تھے۔ان کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔دن پردن گزرتے چلے جارہے تھے۔جماعت کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ کہیں باہر بھجوادیتی یاان کے لئے کسی کام کاج کا بندوبست کردیا جاتا۔مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ والد صاحبؓ گھبرا گئے۔ (بحوالہ رسالہ تحریک جدید)

تبلیغ کے لئے بِلا شرط پیشکش

دن یونہی گذرتے رہے۔دسمبر 1935 کی بات ہے۔ناناجانؓ آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ہوگئے۔ان کو آپریشن کے لئے ڈسکہ ہسپتال لے جایا گیا۔ماموں ان کی خدمت کے لئے ساتھ تھے۔انہی دنوں میں آپ نے الفضل میں ایک اعلان پڑھا جو محترم مولوی نذیر احمد علیؒ صاحب کی طرف سے تھا۔

''گولڈکوسٹ (مغربی افریقہ۔گھانا) میں جماعت کوایک مولوی فاضل کی ضرورت ہے جو وہاں جاکر افریقن لوگوں کی تربیت کرے،ان میں سے مربی تیار کرے اورانہیں تبلیغ کے طریقے سکھائے۔جماعت احمدیہ گولڈکوسٹ کی طرف سے انہیں معمولی مُشاہرہ دیا جائے گا۔''

(بحوالہ الفضل)

ماموں جانؒ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بہت نیک طبیعت رکھتے تھے۔لالچ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔اللہ کے دین کی خدمت کی تمنا تھی۔قربانیوں کے حصول کی امید تھی۔چنانچہ آپ نے اس سلسلے میں محترم مولوی نذیر احمد علی صاحبؒ کوخلوص بھرا خط لکھا اور گولڈکوسٹ جانے کے لئے

آمادگی ظاہر کردی۔ نیز آپ نے یہ بھی لکھا کہ مَیں بِلا شرط اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ جب محترم مولوی نذیر احمد علی صاحب کو مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کا مکتوب ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

چنانچہ انہوں نے مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کا نام سیدنا محمود خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں پیش کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ ان کی طرف سے کوئی مطالبہ نہیں یہ بلا شرط جانے کو تیار ہیں۔ حضورؓ نے فرمایا ''آپ انہیں لے جائیں کیونکہ شرط لگانے والے کام نہیں کیا کرتے۔''

اللہ کی راہ میں مغربی افریقہ کا سفر

یوں آپ کی دلی مراد پوری ہوئی اور چند ہفتوں کے بعد اپنے وطن سیالکوٹ اور تمام عزیز و اقارب کو خدا حافظ کہہ کر دار الامان چل دیئے۔

سیدنا محمود خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے ملاقات ہوئی۔ نئے سفر کے بارے میں ان کی قیمتی نصائح سُننے کا موقع مِلا۔

اس مشن پر جانے سے پہلے حضور نے آپ کے نام کے آگے ''مبشر'' کا اضافہ کِیا۔ اس سے قبل آپ اپنے نام کے ساتھ سیالکوٹی لکھا کرتے تھے۔ اس دن کے بعد آپ ''نذیر احمد مبشر'' کہلانے لگے۔ اللہ کے بندے کی بات پوری ہوئی۔ وہ واقعتاً دین کے لئے مبشر ثابت ہوئے اور ہمارے لئے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

پھر 2 فروری 1936ء کے دن آپ کو روانہ کرنے کے لئے قادیان کے کئی جوان اور بزرگ خدا حافظ کہنے کے لئے تشریف لائے۔

دعاؤں کے سائبان تلے محترم مولوی نذیر احمد علی صاحب کی معیّت میں آپ نے اس نئے اور کٹھن سفر کا آغاز کِیا۔ قادیان کے ریلوے اسٹیشن پر جدھر دیکھو عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ کوچ کرنے والے مسافر بزرگان ابتدائی مبلّغین تھے جو ہندوستان سے باہر جا رہے تھے۔ اسی گاڑی میں مولانا جلال الدین شمس (مبلغ بلاد عربیہ) لندن کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ حضرت خلیفۃ

المسیح الثانیؓ کو بھی ان مجاہدوں سے بہت محبت تھی۔حضورؓ بھی ان کو الوداع کہنے کے لئے اسی گاڑی میں سوار ہو گئے اور امرتسر تک تشریف لے گئے۔فرطِ جذبات سے دل پھٹے جاتے تھے۔عجب ایمان افروز نظارہ تھا۔آپ کو درد بھری دعاؤں کے ساتھ رُخصت کیا گیا۔امرتسر تک حضور اور دوسرے احباب ہم سفر رہے۔

امرتسر سے ان مجاہدوں نے دوسری گاڑی پکڑی اور دہلی پہنچے۔وہاں دہلی کی جماعت نے والہانہ استقبال کیا۔اس کے بعد ان کی اگلی منزل کولمبو تھی۔ یہ سفر بھی گاڑی کے ذریعہ طے ہوا۔ تینوں دوستوں کا سارا سفر نہایت خوشگوار گذرا۔مزاج بھی ملتے تھے۔تینوں ایک ہی میدان کو مارنے چلے تھے۔راستہ میں جہاں جہاں بھی چھوٹی یا بڑی جماعتیں تھیں یا اکاّ دُکاّ احمدی تھا وہ ملاقات کے لئے آتے رہے اور اس حسین سفر میں محبت کے رنگ بھرتے رہے یہاں تک کہ کولمبو جا پہنچے۔وہاں سے اس ننھے قافلے نے ایک جاپانی جہاز (سوئے مارو) پر اپنا سفر جاری رکھا جس کی آخری منزل انگلستان تھی۔

اس وقت جماعت معاشی طور پر بہت کمزور تھی۔ وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔دنوں کا سفر ہفتوں میں طے ہوا کرتا تھا۔سفر کرنے کے لئے سستا ترین راستہ ڈھونڈا جاتا تھا جو طویل اور پُرصعوبت بھی ہوتا۔اس وقت عام طور پر بحری جہازوں کے عرشے پر کھلے آسمان تلے بیٹھ کر سفر ہوتا۔مولانا نذیر احمد علیؒ کو عدن اترنا پڑا کیونکہ وہ حج کو جانا چاہتے تھے۔لیکن ماموں نذیر احمد مبشر صاحبؒ اور مولانا جلال الدّین شمس صاحبؒ پورٹ سعید جا کر اترے۔وہاں سے قاہرہ جانے والی گاڑی پکڑی۔اس وقت سفر کی سہولیات آج کل کی طرح نہ ہوتی تھیں۔ایک منزل سے دوسری منزل تک کسی اور بحری جہاز کا انتظار کرنا پڑتا۔اس سلسلہ میں پہلی منزل پر قیام کبھی چند دن کا تو کبھی ایک ماہ کا بھی ہو جاتا۔چنانچہ مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ کے گھانا کے سفر میں بھی ان دونوں مسافروں کو جاتے ہوئے قاہرہ میں کچھ دیر قیام کرنا پڑا۔اس قیام کے دوران ایک دن آپ جامعہ ازہر (یونیورسٹی) گئے۔وہاں یونیورسٹی کے ایک طالب علم سے عربی میں گفتگو

کرنے کا موقعہ ملا۔اس نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے یہ عربی کہاں سے سیکھی ہے۔آپ نے کہا پنجاب کی ایک چھوٹی سی بستی قادیان ہے جہاں سے عربی اور دوسری تعلیم حاصل کی ہے۔تو وہ بہت حیران ہوا اور کہنے لگا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اتنی عِلمی عربی بولتے ہیں۔

پھر ایک دن ایک دوست کے ہمراہ فلسطین کے مقامات مقدسہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بیت المقدس بھی گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا نذیر احمد علیؒ حج سے واپس آئے اور بیمار ہو گئے۔جس کی وجہ سے سفر التوا میں پڑ گیا۔صحت یاب ہونے کے بعد پھر دونوں داعی اِلی اللہ گولڈ کوسٹ کے لئے بذریعہ لاری روانہ ہوئے۔

گولڈ کوسٹ میں آمد اور باعزّت روزی کا سامان

آخر کار ایک طویل مدت کے انتظار کے بعد گولڈ کوسٹ پہنچے۔استقبال کے لئے جماعت کے کثیر افراد جمع تھے۔ چاہتوں کا دامن پھیلائے سادہ لوح گھانا کے باشندے اپنے معلّموں اور مُحسنوں کو خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔مولانا نذیر احمد علی صاحبؒ ان لوگوں سے آشنا تھے کیونکہ وہ یہیں رہ کر گئے تھے۔اس موقع پر مولانا نذیر احمد علیؒ نے نہایت مؤثر خطاب فرمایا۔مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ کو بھی کہا گیا کہ آپ حاضرین سے کچھ عربی زبان میں کہیں۔آپ کو وہاں کی قومی زبان نہ آتی تھی مگر ایک بڑا طبقہ عربی بھی سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ آپ نے عربی زبان میں اختصار سے کچھ بیان کیا۔جس کا ترجمہ مقامی مبلغ محترم الحاج محمد اسحق صاحب نے کیا۔جن کا تعلق گھانا سے تھا جو بعد میں تاحیات جماعتِ احمدیہ گولڈ کوسٹ کے صدر رہے۔

گھانا جو کہ صدیوں سے انگریز کے قبضہ میں رہتا چلا آ رہا تھا۔نہایت پسماندہ ملک تھا اور آج بھی ہے۔انگریزوں نے ان کو کسی قسم کی ترقی دینے کی بجائے معاشی اور علمی بدحالی میں رکھا۔ ان کا مال و اسباب لُوٹ کر لے گئے اور اس قوم کو جہالت اور ظلمت کے گڑھوں میں رہنے دیا۔

یہاں کی جماعت بہت غریب تھی۔ مغربی افریقہ زیادہ تر صحرا پر مشتمل ہے۔ قحط سالی اور بھوک عام ہے۔ تعلیم کا فقدان ہے۔ بیکاری عروج پر ہے۔ سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ افریقہ کے باسیوں کو اپنی معدنیات یا دوسری دولت استعمال کرنے کا شعور ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانوں کا ان کو علم ہی نہیں۔ کم علمی اور ناواقفیت کا یہ عالَم ہے کہ بھوک سے مرتے رہیں گے مگر محنت کرنے کا طریقہ اور شعور نہیں۔ زراعت کا فن ان کو نہیں آتا۔ کم از کم وہ اپنے لئے خوراک پیدا کر سکتے ہیں اور افلاس سے بچ سکتے ہیں۔ اُس وقت کی معاشی حالت آج کی بہ نسبت کہیں بدتر تھی۔ ان حالات میں کوئی جماعت کیسے ایک مبلغ کا خرچہ اٹھا سکتی تھی۔ اسی لئے تو محترم مولوی نذیر احمد علی صاحبؒ نے پہلے ہی بذریعہ اعلان بتا دیا تھا کہ نہایت واجبی اخراجات ملیں گے۔ جو اعلان بِلا شرط کا آپ نے دیا تھا وہ اِن حالات کے عین مطابق تھا۔

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کا یہاں آنے کا اصل مقصد اور مشن دعوتِ الی اللہ تھا۔ لیکن گذراوقات کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے تھا۔ وہاں کے لوگ دن بھر چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد نہایت مشکل سے شام کا کھانا حاصل کر پاتے ورنہ بھوکے سو رہتے۔ ایک تو پردیس تھا دوسرے نہایت افلاس زدہ ملک تھا جہاں محنت کی کہانی صعوبتوں سے لکھی جاتی تھی۔ اگر کمانے کی غرض سے باہر نکلتے ہیں تو دین کے لئے کونسا وقت بچے گا۔ یہی سوچتے ہوئے آپ نے اپنے والد کو سیالکوٹ خط بھیجا۔ افریقہ کے حالات لکھے۔ جماعت کی مجبوریاں بیان کیں۔

آپ جانتے تھے کہ والد صاحب کے پاس بھی اتنی کثیر رقم نہ ہوگی۔ اس لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مجھے کھیلوں کا کچھ سامان فٹ بال و دیگر اشیاء اُدھار لے کر بذریعہ بحری ڈاک سستے ڈاک خرچ سے بھجوا دیں۔ سیالکوٹ کئی صدیوں سے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں، دست کاریوں اور معیاری کھیلوں کے سامان کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے اور ہندوستان سے کھیلوں کا سامان یورپ، امریکہ، اور دوسرے بہت سے ممالک کو بھیجا جاتا تھا۔ آپ کے والد کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی بھی آپس میں واقفیت تھی۔ سیالکوٹ کے بہت سے تاجروں کو آپ جانتے

تھے۔اس لئے انہیں اس کام کو کرنے میں کوئی خاص دقّت نہ محسوس ہوئی۔آپ کو افریقہ بیٹھے ہوئے مطلوبہ سامان پہنچ گیا۔اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی مولانا نذیر احمد مبشر صاحب کے لئے اپنے فضل کے دروازے کھولے۔ان کی واقفیت ایک ایماندار شام کے باشندے سے ہو گئی جو تجارت کرتا تھا۔آپ نے یہ سارا سامان اس کو نفع پر فروخت کر دیا۔یوں اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی اور آپ کے گذارہ کے لئے گھر بیٹھے انتظام ہو گیا۔جس کے نتیجہ میں آپ کا وقت بچ رہتا۔چنانچہ سارا دن آپ کو تبلیغ کا موقع ملتا۔اب یہاں سے جو تھوڑا نفع کمایا تو اپنی تجارت کو اور بڑھانے کا خیال آیا۔ایک بڑی ضرورت جو اس مُلک میں تھی وہ ان غریب لوگوں کے لئے سستی اور کار آمد دواؤں کا حصول تھا۔آپ نے لاہور کی امرت دھارا ایجنسی کو خط لکھا اور ان سے تجارتی مراسم بڑھالئے۔آپ بعض ادویہ منگوا لیتے اور عصر سے مغرب تک مشن ہاؤس میں رہ کر یہی کام کرتے تھے۔یوں تبلیغ اور خدمت خلق دونوں کا آپ کو موقع ملتا رہا۔ایک بات جو قابلِ ذکر ہے آپ نے بتایا کہ ''میری روانگی سے پہلے ملاقات کے دوران سیدنا محمود خلیفۃ المسیح الثانی ؓ نے مجھے اشارتاً تجارت کی تلقین فرمائی تھی۔'' چنانچہ اس رنگ میں اللہ تعالیٰ نے حضور کی خواہش کو بھی پورا کر دیا، الحمدللہ۔آپ نے اپنے گذارے کے لئے یہ تجارت جاری رکھی۔پھر اس معمولی سے کاروبار میں ایسی برکت پڑی کہ آپ کے پاس ایک معقول رقم جمع ہوگئی۔اللہ تعالیٰ کا فضل جاری رہا۔

1937ء کا سال تھا کہ مولانا نذیر احمد علی صاحب ؒ کو مرکز کی طرف سے سیرالیون بطور مبلغ بنا کر بھیجا گیا۔خدا تعالیٰ نے آپ کی اس تجارت میں اتنی برکت ڈالی کہ آپ نے مولانا نذیر احمد علیؓ کے جہاز کا کرایہ اور shurety کی 60 پونڈ کی خطیر رقم اس تجارت کی آمدنی سے ادا کی۔(بحوالہ رسالہ تحریک جدید)

سالٹ پانڈ کے مشن ہاؤس کی تعمیر

افریقہ کے لوگوں نے نہ جانے کس جذبے سے رقم اکٹھی کر کے مشن ہاؤس کی تعمیر شروع کی تھی۔عمارت کا آغاز محترم حکیم فضل الرحمان صاحب نے کیا تھا۔عمارت تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔باہر کی

چار دیواری اور سیڑھیاں وغیرہ ابھی باقی تھیں۔مولانا نذیر احمد علیؒ اور مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے وہاں جا کر بقیہ عمارت مکمل کی۔ چنانچہ آپ کے افریقہ پہنچنے کے پورے ایک سال کے بعد فروری 1937 میں اس دوسرے مشن ہاؤس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس مبارک تقریب پر علاقہ کے خاص مہمانوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ بہت سے احباب دور و نزدیک سے تشریف لائے۔مولانا نذیر احمد علی صاحبؒ نے افتتاحی خطاب کیا۔احمدی احباب کی خوشی قابلِ دید تھی۔اس موقع پر مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ کو بھی خطاب کرنے کا موقع ملا۔اس موقعہ پر جماعت کو مالی تحریک کی گئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایک دفعہ پھر جماعت کو مالی قربانی کا شرف حاصل ہوا اور اس دن جماعت نے مزید ایک کثیر رقم تعمیر کے لئے پیش کی۔

عربی میں تصنیف ''القول الصریح فی ظھور المھدی والمسیح''

مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ کے گولڈ کوسٹ میں پہنچنے سے اور مسلسل کام کرنے سے جماعت میں بیداری آ گئی۔احمدی نوجوان اور احباب شوق سے مشن ہاؤس آنے لگے۔ان کے اندر خدمتِ دین کا جذبہ پیدا ہوا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ افریقہ کے حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ان دونوں مبلغین کی کاوشوں کو پھل لگتے دیکھا،عوام میں بڑھتی ہوئی دلچسپی محسوس کی تو حضورؓ نے تحریک کی کہ مقامی باشندے اپنے آپ کو تبلیغ کے لئے پیش کریں۔ وہاں ہماری جماعت کا اصل حدف تو عیسائی ہی تھے مگر مسلمانوں کو بھی حضرت مسیح موعودؑ کا صحیح پیغام پہنچانا ضروری تھا نیز ان کے اندر جو غلط عقائد رائج ہو چکے تھے ان کو بھی دور کرنا لازم تھا۔عام مسلمانوں کو بھی تبلیغ کے مواقع ملتے رہتے۔حضور کی اس تحریک پر وہاں کے بہت سے باشندوں نے اپنے آپ کو دعوتِ الی اللہ کے لئے پیش کیا۔اس ضرورت کے تحت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے ان مبلغین کی باقاعدہ کلاسیں لینی شروع کیں۔ان کو قرآن اور دین کے مسائل سکھائے ، فقہ سے آشنا کیا۔مگر ان کے لئے کوئی باقاعدہ کتاب نہ تھی جس سے وہ موقع کے مطابق فائدہ اٹھا لیتے۔ان

اعزازی مربیّان کی تربیت اور علم کے لئے مولانا نذیر احمد علیؓ صاحب کی تحریک پر مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ نے اختلافی مسائل مثلاً مسئلہ ''وفاتِ مسیح، ردّ کفارہ، ظہور مہدی کی حقیقت اور ضرورت'' وغیرہ وغیرہ کے موضوعات پر ایک کتاب عربی زبان میں لکھی۔ یہ کتاب 217 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے 8 ابواب ہیں۔ اور اب تک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف مغربی افریقہ کے احباب کی ضرورت پوری ہوئی بلکہ دوسرے عرب ممالک میں بھی بہت پسند کی گئی۔ (حوالہ- تحریک جدید، ربوہ)

مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کی دن رات کی کوششوں کے بعد بڑی تعداد میں اعزازی مبلّغ تیار ہو گئے۔ اب یہ احباب اپنے اپنے علاقوں اور قبیلوں میں جا جا کر اسلام کے محاسن بیان کرتے۔ سادہ لوح لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرتے۔ اللہ کا پیغام دور و نزدیک پہنچنے لگا اور مشن کی رونقیں بڑھنے لگیں۔ اللہ کی تقدیر کے تحت احمدیوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی اور نئے نئے قبیلے اپنے سرداروں کے ساتھ سلسلہ عالیہ احمدیہ میں شامل ہونے لگے۔

اللہ کی تائید اور دشمن سے بچاؤ

حضرت مسیحِ موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت پھیلی تو دشمنوں نے بھی سر نکالنا شروع کر دیا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کا بیان ہے کہ ایک رات مَیں نے خواب دیکھا کہ ایک سانپ نکلا ہے لیکن جلد دوسری جگہ غائب ہو گیا ہے۔ دوسرے روز دوپہر کو مَیں نے پھر خواب میں دیکھا کہ مَیں نے اس سانپ کو پکڑ کر باورچی خانہ میں بھُون ڈالا ہے۔ چنانچہ چند روز کے بعد ہمیں یہ علم ہوا کہ ہماری ایک مخالف جماعت نے ہمارے مشن کے خلاف ایک سکیم بنائی ہے اور ہمارے سکول کے ایک استاد کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس امر کا انکشاف ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی تائید سے ان کی سکیم کو بھی خدا نے ناکام کیا۔

محترم مولانا نذیر احمد علی کو سیرالیون جانے کا حکم ہو گیا۔ ان کی روانگی سے قبل گولڈ کوسٹ یعنی

گھانا کی ریاست ’آیہ کرانمپا‘ کے پیراموئنٹ چیف نے ہمارے بیس احمدیوں کو اِس بناء پر قید کرایا کہ وہ پبلک میں تبلیغ کرتے ہیں۔

اس واقعہ کا حال حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی زبان سے سنیئے:

’’محترم مولانا نذیر احمد علی کے حکم پر مَیں دو ترجمانوں کو لے کر پیراموئنٹ چیف کے پاس پہنچا۔اس وقت میری انگریزی زبان کمزور تھی۔ یہ پیراموئنٹ چیف تعلیم یافتہ تھا اور ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر تھا۔ مَیں نے اس کے دربار میں جا کر اسلام کی تعلیمات پیش کیں اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے بیس احمدیوں کو رہا کر دیں کیوں کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا صرف آپ کی رعایا کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کی ہیں۔ پیراموئنٹ چیف نے جواب دیا کہ آپ کی جماعت کے یہ لوگ اَن پڑھ ہیں اور اَن پڑھوں کو تبلیغ کا کیا حق ہے؟ مَیں نے پیراموئنٹ چیف سے کہا کہ جناب آپ یہ بتائیں کہ زمینداروں کے ذہن اچھے ہوتے ہیں یا مچھیروں کے؟ اس نے جواب دیا ’’زمینداروں کے‘‘ اِس پر مَیں نے کہا ’’حضرت مسیح کے شاگرد اَن پڑھ اور مچھیرے تھے۔ انہیں اگر تبلیغ کا حق تھا تو ان زمینداروں کو کیوں تبلیغ کا حق نہیں‘‘ پیراموئنٹ چیف عیسائی تھا۔ میرے جواب پر وہ خاموش ہو گیا اور اِس نے ہمارے احمدیوں کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔‘‘

(بحوالہ۔تحریک جدید مئی 1979)

خدا تمہارے ساتھ ہے

ایک سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جماعت میں بہت استحکام پیدا ہو گیا۔ احباب میں جوش و جذبہ دیکھا جانے لگا۔

نومبائعین کی تعداد بڑھ گئی۔ سالٹ پانڈ اور گولڈ کوسٹ کے مشن کو ترقی ملی۔ اس کامیابی کو دیکھ کر مولانا نذیر احمد علیؓ صاحب اور مولانا نذیر احمد مبشرؓ صاحب بہت مطمئن تھے پھر ایک دن مولانا نذیر احمد علیؓ صاحب کے نام مرکز سے پروانہ آ گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ان کا تبادلہ سیرالیون کر دیا تھا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اکیلے رہ گئے۔ اس ملک میں آپ خود نئے

تھے۔ جوانی کی عمر تھی۔ تجربات کی کمی تھی ظاہر ہے اب اس مشن کا کام صرف ان کو ہی کرنا تھا۔ اتنی بڑی ذمّہ داری کے بوجھ تلے دبے جاتے تھے۔ علاقائی زبان بھی عمدگی سے سیکھ نہ پائے تھے۔ یہاں کی دفتری زبان انگریزی تھی۔ حکومت کے افسروں کو خط و کتابت انگریزی میں کرنی پڑتی تھی۔ مگر آپ کی انگریزی اس وقت ایسی نہ تھی کہ آپ ہر اہم کام سرانجام دے سکتے۔ آپ کو طبعی طور پر گھبراہٹ ہوئی کیونکہ حضرت مولانا نذیر احمد علیؓ احمدیہ سکولوں کے منتظم تھے۔ حکومت کے ساتھ انگریزی میں ہر قسم کے راہ و رسم کا ان کو خوب تجربہ تھا۔ ان کے ساتھ رہ کر کام کرنے میں کچھ اور ہی لُطف تھا۔ ایسے حالات میں فرض کی ادائیگی کے بارے میں گھبراہٹ ہونا قدرتی امر تھا۔ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے خیال سے ان کو طبعی طور پر بہت بے چینی محسوس ہوئی کہ تمام معاملات کیسے طے کرسکوں گا؟ پریشانی پر قابو پانا مشکل ہوگیا تو حضرت مولانا نذیر احمد علیؓ سے ذکر کیا۔ انہوں نے جن الفاظ میں آپ کی ہمت بندھائی وہ ہمارے لئے اور ہماری نسلوں کے لئے سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ حضرت نذیر احمد علیؓ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

''دیکھیں حضرت موسیٰؑ کا سونٹا بے جان تھا۔ لیکن خدا نے اس سونٹے سے کیا کام لیا اور آپ تو خدا کے فضل سے عالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سے ضرور کام لے گا''

حضرت مولانا نذیر احمد علیؓ کے ان الفاظ نے مرہمِ عیسیٰ کا کام کیا۔ آپ کے دل نے مضبوطی پکڑی۔ اس نصیحت نے بہت تقویت دی۔ اللہ تعالیٰ نے، جو قادر و قدیر ہے اور اس کی صفات عزیز و حکیم بھی ہیں، اپنے لطف و کرم سے آپ کو ہمّت و توفیق دی۔ پردیس میں خود ان کا سہارا بنا اور ان کو جماعت کی خدمت نہایت عمدگی سے کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور آپ کی کوششوں سے انہی دنوں احمدیہ سکولوں کی گرانٹ دس فیصد زیادہ ہوگئی۔ (بحوالہ رسالہ تحریک جدید)

اشانٹی میں فتنہ اور بادشاہ کی پذیرائی

جہاں فرشتہ صفت انسان ہوتے ہیں وہاں شیطان نما مخلوق بھی چلتی پھرتی ہے اور اللہ کے بندوں کو پھاڑنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتی ہے۔ اشانٹی ایک الگ تھلگ علاقہ تھا جہاں

ہماری جماعت بھی تھی مگر چند لوگوں کی طرف سے حضرت مولانا نذیر احمد علیؒ کو بُری خبریں مل رہی تھیں کہ اس علاقہ میں کچھ لوگوں نے فساد مچا رکھا تھا۔ حضرت مولانا نذیر احمد علیؒ کو اگلے مشن پر جانا تھا۔ اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے ان کی موجودگی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کو خاص تاکید کی کہ وہاں کے حالات پر نظر رکھی جائے اور خود جا کر جائزہ لیا جائے۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشر کو ان کی بات ماننی پڑی۔ آپ نے اشانٹی جا کر ڈیرہ لگا لیا۔ جو لوگ آپ کو جماعتی نظام کو بگاڑتے ہوئے دکھائی دیئے ان کو آپ نے ہر طرح سمجھایا بجھایا، فہمائش کی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ آپ کو یہ دیکھ کر بہت تشویش پیدا ہوئی پھر آپ کی طبیعت دعا کی طرف مائل ہوگئی۔ اپنی بساط کے مطابق ہر تدبیر کر لینے کے بعد نہایت فکر سے دعاؤں میں مصروف ہو گئے۔ سمیع و مجیب خدا نے آپ کی تضرعات کو سُنا اور اُس علیم و حکیم پروردگار نے آپ کی ہر آن راہ نمائی کی۔ ایک رات آپ نے خواب دیکھا کہ آپ ایک مکان کی چھت پر ہیں مکان کی دیوار کے ساتھ شہتوت کا ایک درخت ہے۔ کچھ سانپ زمین سے درخت پر چڑھ کر آنا چاہتے ہیں۔ آپ کے دل میں ڈالا گیا کہ درخت کی شاخ کاٹ کر اس شاخ سے سانپوں کی طرف اشارہ کرو چنانچہ جب کوئی سانپ چھت پر آنا چاہتا تو آپ اس کی طرف اس شاخ سے اشارہ کرتے۔ وہ سانپ دب کر انسانی شکل میں ظاہر ہو جاتا اور وہ اسے پہچان لیتے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نصرت اور قدرت سے ان کو تمام شریر لوگوں کے متعلق صاف صاف بتا دیا اور ان کی نشان دہی کر دی۔ آپ کو اس فتنہ کے ازالہ کی توفیق ملی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے جماعت کو اپنے فضل سے حفظ و امان میں رکھا۔ الحمدللہ

حضرت مولانا نذیر احمد مبشر صاحب کا کام ہی تبلیغ تھا۔ حکومت کے ہر بڑے عہدیدار کو اللہ کا پیغام پہنچانے کی تمنا تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حالت سدھری تو سیکرٹری جماعت احمدیہ کی معیت میں وہاں کے شاہ اشانٹی Sir Ajeman Prompe 2nd کو ملنے کی غرض سے گئے۔ شاہ اشانٹی بہت تپاک سے ملے اور بہت عزت افزائی کی۔ مختصر سی گفتگو کے بعد اپنے ملکی اور علاقائی رواج کے مطابق رخصت کرتے وقت انہوں نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشر کو ایک برّہ یعنی چھترا بطور تحفہ پیش کیا۔

علماء پر عربی دانی کا رعب

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت مولانا نذیر احمد صاحب مبشرؒ نے افریقہ آتے ہوئے مصر میں قیام کے دوران قاہرہ کی یونیورسٹی میں ایک طالب علم سے عربی میں گفتگو کر کے اس کو حیران کر دیا۔

اشانٹی میں رہتے ہوئے آپ نے واقفیت اور دوستی کا دائرہ وسیع کیا۔تبلیغ کے لئے مختلف طبقہ کے لوگوں سے ملتے۔آپ کی عربی دانی کے بارے میں محترم غلام باری سیف صاحب نے تحریک جدید ربوہ میں لکھا ہے:

’’آپ نے خود بیان کیا کہ اشانٹی کے شہر کماسی کے ایک بڑے عالم معلّم عبدو کو اپنے علم پر بڑا ناز تھا۔مَیں اپنے دو شاگردوں کے ساتھ انہیں ملنے گیا۔مَیں نے عربی زبان میں ان سے گفتگو شروع کی۔ پہلے تو اُس نے بات کرنے سے گریز کیا۔جب مَیں نے عربی زبان میں لفظ توفی کے بارے میں حضرت مسیح موعودؑ کا چیلنج دہرایا۔رفع کے بارے میں لُغوی معنی اور اس بارہ میں چیلنج پیش کیا کہ جب اللہ فاعل ہے۔مفعول ذی روح مومن ہو تو معنے رفع درجات کے ہوتے ہیں۔اسی طرح خاتم کے بارے میں چیلنج پیش کیا کہ جب یہ جمع کی طرف مضاف ہو تو اس کے معنی اس جنس کا اعلیٰ ترین فرد ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل عربی شعر میں بیان ہوا ہے۔

فُجِعَ العَرِيضُ بِخَاتَمِ الشُعراء

غدير روضتها حبيب الطائی

اور ان کے سامنے یہ پیش کیا کہ جب ظرف مقدم ہو اور مضارع مؤخر تو وہ حصر کا فائدہ دیتا ہے۔لہٰذا مسیح علیہ السلام آیت فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ (اعراف آیت ۲۶) کے تحت آسمان پر زندہ نہیں جا سکتے۔ وہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔میرے کسی چیلنج کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا بلکہ ہاؤسا زبان میں میرے دونوں شاگردوں کو کہنے لگا کہ تمہارے اس مولوی کو خوب

علمی مہارت حاصل ہے۔

انہی ایّام میں ایک اور عالم جو کہ فرانسیسی مقبوضہ علاقہ سے کماسی میں آئے ہوئے تھے جنہیں کراموکٹیا کہتے تھے انہیں اپنی عربی دانی پر بڑا ناز تھا۔ان کے ساتھ متنازعہ فیہ مسائل پر عربی زبان میں گفتگو ہوئی تو وہ لا جواب ہو گئے اور اپنی کرسی سے اتر کر آئے۔میرے پاؤں پر ہاتھ لگا کر مجھے کہنے لگے کہ مَیں آج سے آپ کو اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي۔"

سالٹ پانڈ میں عرب تاجر کو ہرانا

ایسا ہی ایک اور واقعہ ان کی اپنی زبانی سنیئے: آپ فرماتے ہیں:

"جب اشانٹی میں حالات معمول پر آ گئے تو مَیں 1938ء میں واپس سالٹ پانڈ آ گیا۔وہاں ایک مرتبہ ایک لبنانی تاجر سے تبلیغی گفتگو ہوئی۔جب وہ گفتگو میں عاجز آ گیا تو کہنے لگا کہ اگر مسیح موعودؑ نے آنا تھا تو عرب میں آتے۔مَیں نے پوچھا کیوں؟ تو جواب دیا کہ ہم عرب لوگ قرآنِ مجید کو بہتر جانتے ہیں پنجابی ہماری طرح قرآن نہیں جانتے۔مَیں نے کہا مرزا صاحب نے باوجود پنجابی ہونے کے اللہ کی تائید سے عربوں کو قرآن مجید کی تفسیر نویسی کا چیلنج دیا لیکن کوئی مخالف سامنے نہ آیا۔عرب تاجر نے جواب دیا ہم نے ان کے چیلنج کو کوئی وقعت ہی نہ دی۔مَیں نے کہا یہ تو وہی جواب ہے جو قرآن کریم میں (الانفال) پہلے مذکور ہے۔

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۲﴾ مَیں نے کہا آج مَیں مسیح موعودؑ کا خادم آپ کے سامنے ہوں، آپ عرب ہیں، میرے ساتھ عرب نویسی کا مقابلہ کر لیں اور مَیں اس کے لئے ثالث آپ کے شامی اور لبنانی دوستوں کو تسلیم کرتا ہوں۔لیکن وہ مقابلہ پر نہ آیا اور پھر ایک دوست کے سامنے اعتراف کیا کہ مَیں نے اس لئے آپ کے مولوی صاحب کا چیلنج قبول نہ کیا کیونکہ ان کو گرائمر میں مہارت حاصل ہے۔

(بحوالہ تحریک جدید۔مئی ۱۹۷۹)

خاکساری کا رعب

افریقہ میں تبلیغ کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاکساری کی لاج رکھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی عاجزانہ دعاؤں کو بھی قبولیت بخشتا ہے۔ بسا اوقات ان کی خاکساری کا رعب غیروں کے دل پر ڈال دیتا ہے۔ افریقہ میں قیام کے دوران ایک مرتبہ گرمیوں کی شدت تھی مولانا نذیر احمد مبشر صاحب نے نیکر اور بنیان پہنی ہوئی تھی۔ مشن ہاؤس میں آپ نے پودے لگائے ہوئے تھے۔ افریقہ کے بے چارے کم علم لوگوں کو زراعت کے فن سے بالکل آشنائی نہ تھی۔ مولانا نذیر احمد مبشر صاحب نے پاکستان اپنے والد کو خط لکھ کر سبزیوں کے بیج منگوائے اور ان کو سبزیوں کی کاشت کرنی سکھائی۔ ایک دفعہ وہ مشن ہاؤس کے باہر کیاریوں میں ہاتھ میں کُھرپہ لئے پودوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ اس دوران وہاں ایک پینٹ کوٹ پہنے ہوئے پادری آ گیا۔ وہ ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور ان سے کہا کہ وہ مولوی نذیر احمد مبشر صاحبؓ سے ملنا چاہتا ہے اور وہ ان کو اس وقت کہاں ملیں گے۔ ان کی بڑی مشہوری ہے کہ وہ بہت بڑے مربی ہیں۔ چونکہ مولانا نذیر احمد مبشرؓ صاحب اس وقت کیاریوں میں کھڑے تھے پادری نے سمجھا کہ یہ کوئی مالی ہوگا۔ جب مولانا صاحب نے اس کو بتایا کہ

''I am Moulvi Nazir Ahmad Mubashar.'' تو وہ حیران رہ گیا اس کو خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ اتنے بڑے مربی یوں خاکساری اور بے نیازی سے نیکر پہنے کیاریاں صاف کر رہے ہوں گے۔ پادری بڑ بڑایا اور کہا ''very great اگر یہی مربی ہے جو کہ خاکساری کا مجسمہ ہے۔ کیا مَیں اس کے ساتھ مباحثہ کے قابل ہوں؟۔'' وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے واپس مڑا۔ مولانا نذیر احمد مبشر صاحب اس پادری کو بلاتے ہی رہ گئے۔ اس کو رکنا تھا نہ وہ رکا۔ اس پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ آپ سے بحث یا مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور فرار ہو گیا۔

جنگِ عظیم دوئم کے دوران مشکلات

دوسری عالمی جنگ میں حالات بہت خراب ہو گئے۔ ہر قسم کی درآمدی اور برآمدی تجارت بند ہو گئی۔ ملک شدید معاشی بحران کا شکار ہو گیا یہ ملک پہلے ہی غریب تھا۔ جنگ سے کچھ ایسی بدحالی پھیلی کہ ماہوار چندہ جات بالکل ہی بند ہو گئے۔ مولانا نذیر احمد مبشر صاحب نے اس مشکل وقت میں یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ جماعتی کاموں کو پورا کرنے کے لئے ہر تین ماہ بعد ایک سرکلر جاری کیا کہ ہر عورت چھ پنس اور ہر مرد ایک شلنگ چندہ خاص جماعت کے لئے ادا کرے۔ اس رقم کی ادائیگی اگرچہ ان مفلس لوگوں کے لئے بہت مشکل تھی مگر خدا کے فضل وکرم سے حضرت مسیح موعودؑ کے ماننے والوں نے مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کا ساتھ دیا۔ اس طرح جو رقم جمع ہوتی رہتی اس سے جماعت کے اخراجات پورے کئے جاتے۔

جنگ کے اثرات کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ مولانا نذیر احمد مبشر صاحب مقامی مبلغین اور دیگر کارکنوں کی تنخواہیں کم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کھیلوں کا جو سامان حضرت مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کے والد صاحب پاکستان سے بھیجا کرتے تھے اور جس کی تجارت سے ان کی آمدنی تھی وہ بھی جنگ کی وجہ سے بند ہو گئی۔ جو پونجی انہوں نے تجارت سے جمع کی تھی وہ سب مجلسِ عاملہ نے ان سے بطور قرض حسنہ لے لی۔

اب اس مشکل وقت میں اور کوئی آمدنی یا گذارے کی صورت نہ تھی۔ وہ اس طرح گزارہ کرتے کہ صبح ناشتہ نہ کرتے۔ دوپہر کو صرف تین ہندوستانی پیسوں کے عوض کساوا نامی پودے کی جڑیں خریدتے۔ ان کو ابال کر ان پر نمک چھڑک کر اور کھٹائی ڈال کر اسے کھاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کوئی چیز بے فائدہ نہیں بنائی نیز ہر چیز کو انسان کی خدمت پر لگا دیا۔ مگر بسا اوقات انسان ناواقف ہونے کی وجہ سے تکلیف میں پڑ جاتا ہے اور ایک ہی چیز کی زیادتی جسم کو مختلف عارضوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کساوا نامی جڑیں اگرچہ بدن کو طاقت بھی دیتی تھیں مگر ان کے ساتھ گوشت یا مچھلی کا

استعمال ضروری تھا جس کا ان کو علم نہ تھا اور جس کو خریدنے کی توفیق بھی نہ تھی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کو شدید قسم کی خارش ہوگئی اور سارا جسم چھوٹی چھوٹی پھنسیوں سے بھر گیا۔اس بیماری کی وجہ سے جسم پر لباس پہننا مشکل ہو گیا۔چنانچہ ان کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ہسپتال میں بھی اس مجاہد نے اللہ کا پیغام اس طریقے سے لوگوں تک پہنچایا کہ مریضوں کو اکٹھا کر لیتے اور مغرب اور عشاء کے درمیان تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھتے۔(بحوالہ رسالہ تحریک جدید)

نوٹ (کساوا نامی جڑوں کا چھلکا سخت اور گہرے بُھورے رنگ کا ہوتا ہے۔اور موٹی موٹی مولیوں کی مانند ہوتی ہیں۔یہاں ایک عربی دوکان پر کساوا نام کی جڑ نما سبزی مجھے نظر آئی تو مجھے اپنے ماموں بہت یاد آئے۔چنانچہ ایک دن مَیں نے وہ جڑ خریدی اور اسے ابال کر کھایا۔اس میں لذت تھی نہ ذائقہ۔میرا دل اپنے مجاہد ماموں کے لئے رو دیا جنہوں نے ایک لمبا عرصہ ان جڑوں پر گذارہ کیا اور محض خدا تعالیٰ کی خاطر ان تکالیف کو برداشت کیا۔اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور ہمارے اندر ان کے وصف پیدا کرے)۔

حضرت امام مہدی کی صداقت کا ایک نشان

1939ء میں جنگ زوروں پر تھی کہ ایک روز آ گونا سرکٹ کے چیف رئیس مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کے پاس سالٹ پانڈ آئے انہوں نے بتایا کہ ڈ گومبا قوم کا ایک نوجوان جو اپنے والد کے ساتھ مکہ گیا تھا اور اپنی پوری جوانی تک مکہ میں رہا اب اپنے وطن گولڈ کوسٹ واپس آنے پر اس نے ایک ''صراحہ'' نامی گاؤں میں، جو احمدیت کا پرانا مرکز ہے، رہائش اختیار کر لی ہے وہ جماعت کے خلاف لوگوں کو بہت اُکسا رہا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ مہدی علیہ السلام ہرگز ظاہر نہیں ہوئے اور یہ کہ احمدیت نعوذ باللہ باطل ہے۔جب اس غیر احمدی نوجوان کا چرچا اس علاقہ میں زیادہ ہوا تو پھر علاقہ کے رئیس صاحب نے آپ کے پاس آ کر درخواست کی کہ اس نوجوان کے اثر کو زائل کرنے کے لئے کوشش نہ کی گئی تو وہ بعض کمزور احمدیوں کی ٹھوکر کا باعث

ہوگا۔آپ نے اس احمدی چیف سے کہا وہ ان کے کسی احمدی شاگرد کو لے جائیں۔مگران کا اصرار تھا کہ مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ ہی جائیں۔ جب آپ وہاں پہنچے تو وہ نوجوان مولانا نذیراحمد مبشر صاحبؓ سے گفتگو کرنے سے کتراتا رہا۔اردگرد کے احمدی احباب پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔آپ نے ایک کثیر مجمع کے سامنے اس غیر احمدی نوجوان سے گفتگو شروع کردی اوراُسے چیلنج دیا کہ اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو ان کے ساتھ مناظرہ کرے۔لیکن اس نے مناظرہ سے بالکل انکار کردیا وہ اوراس کے ہمنوا غیر احمدی کہنے لگے کہ مناظرہ کی بجائے مولانا نذیر احمد مبشر صاحب ''مہدی علیہ السلام کے ظہور کی علامات اوران کی صداقت'' پر لیکچر دیں۔ چنانچہ آپ نے اڑھائی گھنٹہ تک ایک مبسوط تقریر ''علاماتِ ظہور مہدی و مسیح'' پر کی۔ پھراس کے بعد سوالات کا بھی موقع دیا گیا۔ایک شخص نے صرف دو سوال کئے جن کے جواب دے دئے گئے اور یہ خیال کرنے پر کہ ممکن ہے کہ وہ لوگ مزید استفسار کریں آپ اس گاؤں میں ایک روز اورٹھہر گئے لیکن کسی نے کوئی بات دریافت نہ کی۔دوسرے دن آپ سالٹ پانڈ واپس آ گئے۔

آپ کی واپسی کے اگلے دن چیف رئیس محمد نے سالٹ پانڈ آ کر بتایا کہ اس گاؤں اوراس کے آس پاس علاقہ کے غیر احمدی لوگ اکھٹے ہوئے۔انہوں نے سفید لٹھے کا جھنڈا بنایا اوراپنے سروں اورکلائیوں پر سفید لٹھے کی پٹیاں باندھیں جسے وہاں کی فتحیابی کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ اورمختلف دیہات میں گھوم کر نعرے لگائے کہ ہم نے امیر جماعت احمدیہ گولڈ کوسٹ کو شکست دے دی ہے اور ساتھ ہی وہ فینٹی زبان (مقامی زبان) میں گاتے جاتے تھے ''مہدی ظاہر نہیں ہوا کیونکہ زلزلہ نہیں آیا''۔گویا ان کے نزدیک مہدی کے ظہور کی بڑی علامت زلزلہ کا آنا تھا اور وہ ان کے ملک میں نہیں آیا۔

نوٹ:(احادیث میں حضرت مہدی کے وقت زلزلہ آنے کا ذکر نہیں۔البتہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی آمدِ ثانی کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بیان فرمائی کہ ''بھونچال آئیں گے'' (متی باب ۲۴ آیت ۷) علاوہ ازیں خود حضرت بانی سلسلہ نے بھی زلازل کی پیشگوئیاں فرمائیں۔(بحوالہ۔درویشان احمدیت جلد دوئم)

جب مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ کو یہ خبر ملی تو آپ بہت فکر مند ہوئے۔ اپنی ذات کی فکر تو نہ تھی۔ ڈر یہ تھا کہ یہ سادہ لوح لوگ اس نوجوان کے ہاتھوں گمراہ ہو گئے تھے اور وہ یہ مذاق اڑا رہے تھے کہ حضرت امام مہدی ابھی ظاہر نہیں ہوئے۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشر نے خدا تعالیٰ سے بہت دعا کی اور رحمت و نصرت طلب کی۔ اپنے خدا سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت ظاہر کرنے کی التجا کی اور اُس علاقے میں مختلف مقامات پر جلسے کرنے کے لئے جماعتوں کو سرکلر بھجوایا۔ مشرک اور عیسائی بھی وہاں شریک ہوئے۔ ان اجلاسوں میں انہوں نے اپنے مناظرے کے چیلنج اور تقریر کا ذکر کیا۔ اور جلسوں میں زلازل کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیاں بیان کیں۔ لوگوں کو انذاری پیشگوئیوں سے ڈرایا اور خدا تعالیٰ کے قول کو سمجھنے کے آداب سمجھائے۔ ان جلسوں میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیاں بیان کی گئیں اور کہا گیا۔ ''اے لوگو! اگر تم زلزلے کے خواہش مند ہو تو اللہ تعالیٰ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لئے زمین کو بھی جنبش دے سکتا ہے۔ خوفناک زلزلے بھی آسکتے ہیں۔ خدا کے غضب کو مت بھڑکاؤ۔ خدا تعالیٰ بے نیاز ہے۔ اس ہستی سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے۔ نیز مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ نے حضرت بانئ سلسلہ احمدیہ کی پیشگوئیاں متعلقہ زلازل بیان کر کے عام اعلان کیا:

''کہ دنیا کے سارے دوسرے ممالک میں اِن پیشگوئیوں کے مطابق زلزلے آچکے ہیں اور اب گولڈ کوسٹ (غانا) کی باری ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ آپؑ کی صداقت کے ثبوت میں ضرور جلد ہی گولڈ کوسٹ کی زمین کو بھی زلزلہ سے ہلا کر آپ کے مخالفین پر حُجّت تمام کرے گا۔''

خدا تعالیٰ کبھی اپنے محبوب بندوں کی رحمت سے مدد کرتا ہے کبھی سخت دل رکھنے والوں کو اپنے جلال سے ڈرا دیتا ہے۔ یہاں بھی خدا تعالیٰ کی غیرت بھڑکی۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے تین مقامات (فرانسی۔ اکواکرم اور مدینہ ٹہیڈ پاسی جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں) میں جلسے کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اوّل الذکر دو مقامات پر پبلک جلسے کئے گئے۔ ابھی تیسری جگہ یعنی

مدینہ ٹھیڈ پاسی پہنچے جہاں اگلے دن جلسہ ہونا تھا تو خدا کی قدرت کہ اجلاس کے منعقد ہونے سے پہلے جمعرات کی رات کو قریباً آٹھ بجے شدید قسم کا زلزلہ آیا جس کے جھٹکے دیر تک رات کو بھی محسوس ہوتے رہے۔ زلزلہ سے در و دیوار لرز گئے۔ ساری رات زمین سے خوفناک گڑ گڑاہٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ لوگ ڈر گئے۔ مختلف مکانوں کو نقصان پہنچا۔ اس زلزلہ سے گولڈ کوسٹ میں بہت سے مکانات منہدم ہو گئے اور بعض مقامات پر غیر از جماعت لوگ بوجہ خوف اپنی جانیں بچانے کے لئے احمدیہ مساجد میں جا گھسے اور بعض مقامات پر لوگوں پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ انہوں نے گھروں کے اندر جانے سے انکار کر دیا اور گھروں کے باہر زمین پر بستر بچھا کر سوئے۔ زلزلہ کا مقام اگرچہ وہی علاقہ تھا تاہم اس کے اثرات دور دور تک تھے۔ ملک کا دارالحکومت ''اکرا'' اس جگہ سے 20 میل دور تھا۔ وہاں بھی کئی عمارتوں کو اِس زلزلہ سے نقصان پہنچا۔ اس زلزلہ کے نشان کو دیکھ کر بعض مشرک عیسائی بھی اپنے ستار بجا بجا کر گیت گانے لگے کہ مہدی ظاہر ہو گیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ زلزلہ آ گیا ہے۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہاں وہ سخت دل لوگ مذاق اڑاتے پھرتے تھے کہاں اتنی بڑی تبدیلی آئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ، جو کہ ہر قدرت کا مالک ہے اور مقلّبُ القلوب ہے، نے ان لوگوں پر ایسا تصرف نازل کیا کہ بعض مقامات پر عیسائیوں اور مشرکوں نے مل کر یہ گیت گانے شروع کئے ''مہدی آ گیا ہے کیونکہ زلزلہ آ گیا ہے۔''

جب حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اس علاقے سے واپس لوٹے اور سالٹ پانڈ مشن میں واپسی کا سفر اختیار کیا تو سڑک پر واقع گاؤں کے لوگوں نے آپ کو دیکھ کر کہا۔ ''یہی وہ شخص ہے جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ اس ملک میں زلزلہ آئے گا''

زلزلے کا یہ خدائی نشان جولائی 1939ء کو ظاہر ہوا تھا جو ایک طرف تو ایک بے وطن مجاہد کی دعا کی قبولیت کا نشان تھا اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کے فرستادہ کی صداقت کا ایک زبردست نشان تھا۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ جب مولانا نذیر احمد مبشر صاحب نے واپس جا کر ایک اشتہار

مشتمل بر پیشگوئیاں حضرت مسیح موعودؑ متعلقہ زلازل، عربی، انگریزی اور اردو زبانوں میں شائع کیا تو حضرت مسیح موعودؑ کے اس نشانِ صداقت کی وجہ سے ایک ماہ میں 180 مبائعین جماعتِ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ فالحمدللہ علی ذالک۔ (رسالہ تحریک جدید)

اللہ تعالیٰ کی مدد قدم بہ قدم

1931 کی بات ہے جبکہ محترم نذیر احمد علی گولڈ کوسٹ میں مبلغ انچارج تھے تو غانا کے شمالی گولڈ کوسٹ کے ایک گاؤں وا (Wa) کے باشندے مکرم الحاج معلم صالح صاحب کالونی کے آسن سرکٹ میں اپنے کاروبار کے سلسلہ میں آئے تو ان کی ملاقات مولوی نذیر احمد علی سے ہوئی۔ ان سے تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ مولوی صاحب کی تبلیغ اور دعا سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت بخشی۔ چنانچہ انہوں نے احمدیت قبول کر لی۔ کچھ عرصہ گولڈ کوسٹ میں رہ کر جب وہ اپنے وطن وا (Wa) واپس گئے اور قبولِ احمدیت کا اظہار کیا تو جیسے طوفان آ گیا۔ سارے کا سارا گاؤں ان کا مخالف ہو گیا۔ ان کو ہر قسم کی تکلیفیں اور اذیتیں دی جانے لگیں۔ اپنے پرائے سب دشمن ہو گئے۔ کئی مرتبہ ان پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے بچ گئے۔ ایک دفعہ معلم صالح صاحب اپنے گھر میں بیٹھے قرآن پاک پڑھ رہے تھے تو مخالفین میں سے ایک مخالف روشندان کے ذریعہ ان کے مکان کے اندر داخل ہوا اور تلوار سے ان پر حملہ کر دیا۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے کے مصداق دشمن ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ تلوار ان کو لگنے کے بجائے قرآن پاک کو اس زور سے لگی کہ قرآن دو ٹکڑے ہو گیا۔ یہ سلوک وہاں کے غیر احمدی مسلمان باشندوں کا تھا جو کئی سال تک جاری رہا۔ مگر محترم معلم صالح صاحب کے ایمان میں لغزش نہ آئی۔ اِس ساری شرارت کا اصل سرغنہ ڈپٹی کمشنر وا (Wa) کا ایک کلرک تھا جو غیر احمدی امام مسجد کا بیٹا تھا۔ اس کی فطرت میں شرارت اور فساد تھا چنانچہ وہ مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا رہتا تھا اور حکام کو بھی محترم معلم صالح صاحب کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔

ایک طرف دشمن کے ہاتھ بہت مضبوط تھے۔مگر دوسری طرف خیرالماکرین کی احسن تدبیریں تھیں۔اس وقت یہ سارا علاقہ انگریز کی ملکیت تھا۔ان کے حکام بھی انگریز ہی تھے۔ چنانچہ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ دونوں ڈپٹی کمشنروں کو(جنہوں نے محترم معلم صالح کی مخالفت میں حصہ لیا تھا)اِس جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سزا ملی کہ حکومتِ برطانیہ نے ان کو خرابیٔ صحت کے باعث ڈاکٹری مشورہ کے بعد واپس وطن یعنی برطانیہ بُلا لیا۔بات یہیں ختم نہ ہوئی بلکہ محترم معلم صالح کی تکلیفوں میں اضافہ ہوگیا لیکن آپ ذرا نہ ڈگمگائے اور خدا تعالیٰ کی آواز کو لوگوں تک پہنچاتے رہے۔آپ کی مسلسل کوششیں اور تبلیغی سرگرمیاں رنگ لائیں اور گاؤں کے کچھ لوگوں نے بیعت کر لی۔اس پر گاؤں کے لوگ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے حکام کے پاس رپورٹ کر دی اور ظلم یہ ہوا کہ محترم معلم صالح صاحب کو گاؤں سے زبردستی باہر نکال دیا گیا۔آپ گھر بار چھوڑ کر ایک دوسرے گاؤں ٹمالی چلے گئے لیکن وطن کے بغیر کیسے دل لگتا ہے کچھ عرصہ دیارِ غیر میں گذارنے کے بعد پھر وا(Wa) واپس آ گئے۔

کئی برس کی محنت کے بعد اس علاقے میں احمدیوں کی تعداد بڑھ گئی۔1940ء کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔احمدیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔یہ صورت حال دیکھ کر مخالفین کیوں صبر سے بیٹھتے۔انہوں نے احمدیوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور حکام کو بھی جماعت کے خلاف اکسایا۔چنانچہ ایک دن سالٹ پانڈ کے اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر صاحب نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو بلایا اور کہا کہ چیف کمشنر شمالی علاقہ نے گورنر گولڈ کوسٹ کو یہ تجویز پیش کی ہے کہ وا(Wa) گاؤں سے تمام احمدیوں کو نکال دیا جائے۔خدا کی شان دیکھئے کہ اسی معلم صالح کا بیٹا محمد بعد میں شمالی علاقہ جات کا کمشنر بنا۔

جب یہ سازش ہو رہی تھی تو ایک مہربان مسلم جج محترم مصطفیٰ صاحب جو سائپرس کے باشندے تھے اور گولڈ کوسٹ میں متعین تھے۔انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ احمدیوں کے خلاف ایسا قدم نہ اٹھایا جائے لیکن گولڈ کوسٹ کی حکومت نے ان کے اس مشورہ کو نظر انداز کر دیا۔

جب سالٹ پانڈ کے اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو اپنے دفتر میں بلایا اور کہا:

’’چیف کمشنر شمالی علاقہ کی رائے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے گورنر نے مجھے لکھا ہے کہ امیر جماعت گولڈ کوسٹ کو آگاہ کیا جائے کہ حکومت کا یہ منشاء ہے کہ وا (Wa) کے احمدیوں کو وہاں سے نکال دیا جائے اور کسی اور جگہ آباد کیا جائے۔‘‘

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو جواب دیا کہ:

’’مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ انصاف سے بعید بات ہے کہ کسی کو اس کے مذہبی عقائد کی بناء پر اس کے وطن سے نکال دیا جائے۔ احمدیوں کے اپنے مکانات کے علاوہ وہاں ایک بہت بڑی مسجد بھی ہے جس سے انہیں ہاتھ دھونا پڑے گا۔‘‘

پھر حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ نے فرمایا:

’’I will agree with protest‘‘ مَیں حکومت کے فیصلہ کے ساتھ اتفاق کروں گا لیکن احتجاج کرتے ہوئے‘‘

اگرچہ وہ حکومت کے سامنے بے بس تھے مگر اپنے دکھ کا اظہار بہادری سے کیا۔

اس پر اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو کہا کہ مَیں ایک مسوّدہ تیار کروں گا جو آپ کو دکھایا جائے گا اور اس کے بعد وہ گورنر صاحب کو بھیج دیا جائے گا لیکن اس اللہ کے بندے کے دل میں کجی تھی۔ اس نے بات کچھ اور کی تھی مگر بعد میں وہ اپنے قول سے پھر گیا۔ اس کی نیت احمدیوں کے حق میں نیک نہ تھی چنانچہ اس نے مسودہ تیار کیا اور حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو دکھائے بغیر ہی براہِ راست گورنر کو لکھ دیا کہ امیر جماعت احمدیہ رضامند ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد چیف کمشنر شمالی علاقہ جات نے مُعلّم صالح کو وا (wa) سے ٹمالی بلا لیا اور اسے کہا کہ آپ کے امیر جماعت اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ وا (wa) کے احمدیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر کہیں اور آباد کر دیا جائے۔ مُعلّم صاحب حیران تھے کہ یہ کس قسم کی سزا ہے کہ

ان تمام غریب احمدیوں کو ان کے وطن سے نکال باہر کیا جائے ابھی وہ جواب سوچ ہی رہے تھے کہ ان کو ایک خیال آیا چنانچہ مُعلّم صاحب نے چیف کمشنر سے دریافت کیا کہ آپ بتائیں کہ یہ امیر جماعت گولڈ کوسٹ کا حکم ہے کہ وا (wa) کے احمدیوں کو ان کے علاقہ سے نکال کر باہر کسی دوسرے علاقہ میں بسایا جائے یا محض ان کی ذاتی رائے اور سوچ ہی ہے۔اس پر چیف کمشنر کو کچھ بن نہ پڑا اور اُسے سچ بولنا پڑا۔اس پر مُعلّم صالح نے کہا کہ اگر امیر صاحب کا حکم ہوتا تو پھر ہمارے لئے ماننا ضروری تھا لیکن رائے کا ماننا ضروری نہیں۔یوں اس کی بنی بنائی ترکیب اکارت گئی۔اس کی سکیم فیل ہوگئی مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ اللہ تعالیٰ نے اس گاؤں کے غریب احمدیوں کی خود حفاظت فرمائی اور ان کو عزت سے ان کے گھروں میں آباد رکھا۔الحمدللہ۔

دشمن کا مکر اور اللہ تعالیٰ کی رحمت

جنگ عظیم دوئم کا زمانہ تھا۔دشمن کے جاسوس چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔جماعت بھی جنگ کے اثرات سے متأثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ایک رات حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو رؤیا میں ایک سانپ دکھائی دیا۔قدرتی طور پر آپ بہت فکر مند ہوئے اور صبح اٹھ کر مبلغین کی کلاس میں جبکہ وہ تفسیر القرآن پڑھا رہے تھے اپنی اس خواب کا ذکر کیا اور طلباء کو خواب بتا کر کہا یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر یا جماعت پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔اسی محفل میں ابھی یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ ایک طالبِ علم کی کھڑکی سے باہر نظر پڑی، کیا دیکھتے ہیں کہ مشن ہاؤس کے گرد دو درجن سپاہیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ نے بھی نظر اٹھا کر دیکھا کہ پولیس نے مشن ہاؤس کو گھیر رکھا ہے۔ان میں سے ایک سپاہی جو خُفیہ پولیس کا آدمی تھا اور سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا وہ مشن ہاؤس کے مشرقی گیٹ کی طرف سے اندر آیا۔جب وہ داخل ہو رہا تھا حضرت مولانا نذیر احمد مبشر کی نظر ان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذوں پر پڑی۔آپ نے اس پولیس مَین سے پوچھا کہ کیا آپ میرے لئے وارنٹ لائے ہیں؟ کیا آپ کو اسی مقصد کے

لئے بھیجا گیا ہے؟ اس کا جواب ہاں میں تھا۔ مولانا نے کاغذات پر نظر ڈالی تو وہ ان کی تلاشی کے وارنٹ تھے۔ اور ان میں درج تھا کہ ان کی جرمنی سے خط و کتابت ہے اور انہوں نے اسلحہ، ٹرانسمیٹر کا آلہ اور دیگر سامان چُھپا رکھا ہے۔ آپ اس کے شک پر حیران ہوئے۔ اپنی صفائی میں دلیل دینے یا اپنے حق میں بولنے کی بجائے آپ نے مُسکراتے ہوئے اس کو خُوش آمدید کہا اور یہ کہتے ہوئے کہ آیئے اپنی تسلّی کر لیں آپ نے اس کو مشن ہاؤس کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اپنی مدد کے لئے دو سپاہی اور ایک حوالدار ہمراہ لایا تھا۔ ان تینوں سرکاری کارندوں نے مِشن ہاؤس کی ایک ایک چیز کی بخوبی تلاشی لی۔ ان کی ساری فائلیں دیکھیں۔ چونکہ وہاں کوئی مشکوک چیز باوجود ان کی گہری تلاشی کے نہ مِل سکی۔ مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ مطمئن تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی قابلِ اعتراض چیز موجود ہی نہ تھی۔ آپ ان سرکاری پیادوں کے ساتھ جرأت اور بہادری سے باتیں کرتے رہے اور بعض دفعہ جب ان کو کچھ نہ ملتا تو ان کے ساتھ مزاح بھی کرتے۔ جب ان کو مشن ہاؤس سے کچھ نہ مِلا تو انہوں نے مشن کے دفاتر کی تلاشی لینا چاہی۔ مولانا نذیر احمد مبشر نے ان سے کہا کہ از روئے قانون آپ لوگ دفاتر کی تلاشی نہیں لے سکتے کیونکہ وہاں جنرل سیکرٹری اور کیشیئر کام کرتے ہیں اور تلاشی کا وارنٹ آپ ان پر نہیں لائے اس لئے آپ ان کی تلاشی لینے کے مجاز نہیں۔ مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کی سرزنش پر وہ ٹھٹھک گئے اور خاموش کھڑے رہے۔ پھر ہنستے ہوئے مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ ان سے مخاطب ہوئے۔ چلو یہاں بھی تلاشی لے لیں۔ دفاتر سے بھی وہ خالی ہاتھ باہر آ گئے۔ کچھ ہوتا تو ان کو ملتا۔ محض یہ ایک جھوٹ اور بہتان تھا جو مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ پر باندھا گیا۔ پولیس نے اس پر بھی بس نہ کیا۔ مِشن ہاؤس کے صحن میں ایک بڑی جستی ٹینکی تھی جو الٹی پڑی ہوئی تھی۔ پولیس نے اس کا بھی معائینہ کرنا چاہا۔ مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ نے اس کی بھی اجازت دے دی۔ چنانچہ پولیس نے اسے بھی اُلٹا کر دیکھا یہاں سے بھی ان کو کچھ نہ مِلا۔ مشن ہاؤس کے احاطہ میں سکول کے طلباء کا ہوسٹل تھا۔ حکومت کے ان کارندوں کا ارادہ اب بچوں کے کمروں کی تلاشی لینا

تھا۔مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ نے پولیس سے کہا کہ تم بچوں کے کمرے کی تلاشی کے وارنٹ نہیں لے کر آئے تم کیسے ان کی تلاشی لے سکتے ہو۔حضرت مولانا نذیر احمد مبشر کے کہنے پر وہ رُک گئے۔جب وہ ٹھہر گئے تو پھر مولانا نے ان کو ایک چانس اور دیا اور مسکراتے ہوئے بچوں کے کمروں میں جانے دیا نیز ان سے کہا کہ آپ کو یہاں سے بھی کچھ نہیں ملے گا کیونکہ یہ بہتان ہے جو ہماری جماعت پر باندھا گیا ہے۔پولیس نے بچوں کے صندوقوں، کپڑوں اور الماریوں کی تلاشی لی۔ابھی وہ تلاشی سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس جن کا نام بانس تھا خود آپہنچے۔یہ وہ افسر تھا جس نے تلاشی کا حکم نامہ جاری کیا تھا اور پولیس اور دو حوالداروں کو مشن ہاؤس میں حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو تنگ کرنے اور ان کو بے عزت کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ نے حوالدار سے پوچھا کیا تمہیں کوئی چیز ملی ہے۔وہ کہنے لگا۔نہیں ہم نے کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں پائی۔پھر سپرنٹنڈنٹ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے ان کی فائلیں پڑھی ہیں تو حوالدار نے جواب دیا کہ ہاں ہم نے ان کی تمام فائلیں دیکھی ہیں۔اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب تحکمانہ لہجے میں مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ سے مخاطب ہوئے کہ وہ ان کی ذاتی فائل دیکھنا چاہتا ہے۔حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے اسے جواب دیا کہ ان کی ذاتی فائل کوئی نہیں۔یہ سب جو یہاں موجود ہیں مشن کی فائلیں ہیں اور جتنی بھی خط وکتابت حکومت کے حکام، محکمہ تعلیم، پبلک، ممبرانِ جماعتِ احمدیہ اور جماعت کے مرکز سے ہوتی ہے وہ تمام اِن فائلوں میں موجود ہے۔آپ خوشی سے ہر فائل اور تمام ریکارڈ کو بغور مطالعہ کر سکتے ہیں۔چنانچہ سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی مشن ہاؤس میں گیا حالانکہ اس کے بھیجے ہوئے سپاہی ہر چیز کی تلاشی لے چکے تھے اس نے خود فائلیں دیکھیں۔لیکن اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ ایک سادہ منش انسان تھے جو کہ اللہ کی راہ میں دین کی خدمت کررہے تھے۔وہ جرمنی کے جاسوس کیسے ہوسکتے تھے۔

اب ملاحظہ کیجئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کس طرح عزت بخشتا اور اس کے دشمن کو کیسے ذلیل کرتا ہے۔

آسمانی انذار

جب سپرنٹنڈنٹ نے اپنی تسلّی کر لی اور ہر طرح سے مکمل تلاشی لے کر مطمئن ہو گیا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ نے اس سے کہا کہ آپ نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ابھی وہ آپ سے باتوں میں مصروف تھا کہ اسے ایک نزدیکی گاؤں سے اطلاع ملی کہ وہاں کسی نے شراب کی بھٹی لگا رکھی ہے اور اس کا شراب کا کاروبار ہے جس کو Native Sum کہا جاتا تھا۔ کھلے عام شراب بنانا اور بیچنا اس ملک کے قانون کے خلاف تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی سپرنٹنڈنٹ وہاں پہنچا اور اس نے شراب کی بوتل پکڑ لی۔ مزاحمت کے دوران مجرم نے غصے سے بوتل کو اس کے ہاتھ میں ہی توڑ ڈالا اور اسی بوتل کے شیشے سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ زخمی کر گئے۔ اس کی ایسی حالت تھی کہ ہسپتال کی ایمبولینس میں سالٹ پانڈ کے ہسپتال لایا گیا۔ وہاں جانے کے لئے راستہ میں جماعت کا مشن ہاؤس پڑتا تھا۔

جب وہ جماعت کے مِشن ہاؤس کے سامنے کی سڑک اور شہر سے گذر رہا تھا تو بعض غیر مسلموں نے کہا دیکھو تم نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ جیسے بے ضرر آدمی کو تکلیف پہنچائی ہے اور یہ اس کا نتیجہ ہے مگر اس نے پھر بھی نصیحت نہ پکڑی اور شرمندہ نہ ہوا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک دن کیپ کوسٹ اپنی کار میں جا رہا تھا تو اس کی کار ایک بڑی بس سے ٹکرا گئی جس کے نتیجہ میں اس کی کار ایک گہرے نالے میں گر پڑی لیکن خدا کی قدرت وہ پھر بھی اس حادثہ میں بال بال بچ گیا۔ اِس حادثہ کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی نے جو کہ ایک شریف الطبع خاتون تھی اور اپنے خاوند پر آنے والی آفت سے ڈر گئی تھی نے اس کو خوب ڈرایا کہ روز روز کی ذلّت سے بہتر ہے کہ تم حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ سے جا کر معافی مانگ لو اور ان کو راضی کر لو، دیکھو ان کا خدا کتنا طاقتور ہے۔ بیوی کی نصیحت سن کر اسے ندامت کا احساس ہوا۔ چنانچہ سپرنٹنڈنٹ نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ سے پشیمانی کا اظہار کیا اور ان کو وہاں کے رواج کے مطابق دو عدد

ولائتی مرغیاں بھجوائیں۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ بہت باغیرت احمدی تھے۔ وہ کہاں ایک مخالف کا اس رنگ کا تحفہ قبول کرنے والے تھے۔ چنانچہ آپ نے یہ کہہ کر مرغیاں واپس کر دیں کہ اگر آپ ان کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں تو رکھ لیتا ہوں وگرنہ واپس۔ آپ نے سپرنٹنڈنٹ کو کوئی طعنہ نہ دیا اور سرزنش بھی نہ کی۔

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کے اخلاقِ حمیدہ کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اب وہ آپ کا دوست بن گیا۔ اس کے دل میں کینے اور غصے کی جگہ آپ کے لئے محبت پیدا ہوگئی۔ وہ جہاں کہیں بھی آپ کو ملتا نہایت تپاک سے ملتا، آگے بڑھ کر مصافحہ کرتا اور دور سے ہی سلام میں پہل کرتا۔ (بحوالہ رسالہ تحریک جدید)

افسرِ بالا اور انتقام الٰہی

جب تلاشی کا عمل ختم ہو چُکا تو حضرت مولانا نذیر احمد مبشر نے سوچا کہ مجھے ان افسران کے خلاف دنیاوی تدبیر ضرور کرنی چاہئے۔ انہوں نے میری تلاشی نہیں لی بلکہ حضرت مسیحِ موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ پر ہاتھ ڈالا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے چیف کمشنر کیپ کوسٹ کے پاس اس امر کی شکایت کی۔ چیف کمشنر ایک انصاف پسند افسر تھا۔ اس نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس تلاشی کے وارنٹ پر کس افسر کے دستخط تھے؟ اب ان کو یہ معلومات دینے میں دقت پیش آرہی تھی۔ مگر آپ نے جرأت سے جواب دیا اور اس کو بتا دیا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے مگر ایک بات کا ان کو علم تھا کہ ان دنوں سالٹ پانڈ کا علاقہ مجسٹریٹ وہاں نہیں تھا۔ اس بات کو مدّنظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ شاید اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر صاحب نے تلاشی کے وارنٹ پر دستخط کئے ہونگے۔ اس پر اس انگریز چیف کمشنر صاحب نے اس سارے واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ مولانا کے ساتھ بہت ہمدردی کی اور وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کی تحقیق کرائیں گے۔

کچھ عرصہ کے بعد اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر کو وہاں سے تبدیل کر دیا گیا اور اس کو Asnanti

Mimpons بھیج دیا گیا۔ خدا کا غضب یوں بھڑکا کہ اس کو وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی۔ وہاں جا کر اسے نئی نوکری نصیب نہ ہوئی اور وہ Black Fever میں مبتلا ہو گیا بعد ازاں عبرت ناک تکلیف سہہ کر جلد ہی فوت ہو گیا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَااُولِی الْاَبْصَار۔

عجب نظارہ

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ بہت عبادت گذار تھے۔ صوفی منش اور اللہ والے بزرگ تھے۔ عبادت سے ان کو بہت محبت تھی۔ اکثر رؤیا صادقہ ہوتیں۔ آپ ایک خواب کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ 1940 کا واقعہ ہے کہ ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد مَیں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا کہ مَیں نے دیکھا کہ میرے سامنے سے ایک ٹیلیگرام فارم گذر گیا ہے اس پر لکھا ہوا تھا.Ah! all age is seventy one یہ نظارہ مَیں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں لکھا اور یہ بھی لکھا کہ حضور اس اکہتر کے ہندسہ سے اکہتر دن اکہتر ہفتے، مہینے یا سال مراد ہیں اور اس سے کون مراد ہے؟ تو حضور کی طرف سے جواب ملا کہ جس بات کو خدا نے نہیں بتایا اس کے بارہ میں آپ کیوں پوچھتے ہیں؟

(بحوالہ تحریک جدید۔ ربوہ جون 1979)

خواب کے ذریعہ مستقبل کی خبر

عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ بظاہر جرمنی جنگ جیت چکا تھا۔ اس کا پلڑا بھاری تھا۔ ایک رات حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے خواب دیکھا آپ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک میدان ہے جس میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں اور اس میدان میں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ مَیں نے اس پانی میں دو بَیلوں کو دیکھا ایک بَیل تو بہت ہی ضخیم اور موٹا تھا اور دوسرا بَیل اس سے ذرا دُبلا۔ میرے دل میں ڈالا گیا کہ بڑے بَیل کو پانی کی تہہ

میں سے بَیل کے پیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر اوپر اٹھالوں۔ چنانچہ جب مَیں نے اُسے اپنی ہاتھ کی ہتھیلی پر پانی میں سے اوپر اٹھایا تو مَیں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ کی ہتھیلی پر ایک مُردہ چوہا ہے اور اس وقت میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہ ہٹلر ہے اور دوسرے بیل کو بھی اسی طرح ہی مَیں نے اُٹھایا تو وہ میری ہتھیلی پر ایک چھچھوندر کی طرح مرا ہوا نظر آیا اور میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہ مسولینی ہے"۔

چنانچہ اس خواب کو حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے سالٹ پانڈ کی جماعت کے سامنے بیان کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر اور مسولینی کو شکست ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دونوں لیڈر اس وقت کے بادشاہ تھے اور نہایت طاقتور تھے مگر خدا تعالیٰ نے ان کو زمین پر پٹخ دیا۔

ایک داعی الی اللہ خدائی حفاظت میں - اللہ نے کیسے موت کے وار سے بچایا

محافظ پیارا خدا تھا اُس کا ہر لمحہ
فدا دیں کے لئے تھا جس کا ہر لمحہ

افریقہ کے گھنے جنگلات اور ان میں پائے جانے والے خطرات دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان گھنے جنگلوں کی خوف دلانے والی کہانیاں آج بھی لکھی جاتی ہیں۔ کہیں سانپ اور اژدھے نکل آتے ہیں۔ کہیں تاریک جنگل میں راستہ سُجھائی نہیں دیتا۔ کہیں گوشت خور پودے بُھولے بھٹکے راہی کو اپنی ظالم شاخوں میں جکڑ لیتے ہیں۔ آج بھی وہاں دور دراز جنگلوں میں خونخوار جانور انسان کو اکیلا دیکھ کر ان پر حملہ کر دیتے ہیں غرضیکہ افریقہ کے جنگل دنیا میں سب سے زیادہ پیچیدہ اور پُرخطر ہیں۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی گئی اور راستے آسان ہوتے چلے گئے۔ آج سے کئی سال پہلے ان علاقوں میں ترقی نہ ہوئی تھی اور وہاں کے لوگ نہایت وحشیانہ حرکات سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ جنگل بیابان میں کسی تنہا مسافر کو دیکھ لیتے تو اچانک حملہ بھی کر دیتے۔ وہ لوگ کسی قسم کے قانون کے پابند نہ تھے۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ گاؤں

گاؤں قریہ قریہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچایا کرتے تھے۔ یہ سفر ان کو پیدل طے کرنا ہوتے تھے۔ افریقہ میں اس وقت نہایت پسماندگی تھی۔ ٹرانسپورٹ کی سہولت قطعاً نہ تھی۔ ایک مرتبہ آپ نے تبلیغی اور تربیتی دورہ کا ارادہ کیا جس کے لئے آپ کی منزل گھانا کے علاقہ گومواہ ''اباؤکہ'' کی چھوٹی سی بستی تھی۔ یہ گاؤں دریا کے پار گھنے جنگل میں واقع ہے۔ یوں تو یہ علاقہ قدرت کے حُسن و جمال کی منہ بولتی تصویر ہے مگر راستہ بہت پیچیدہ اور نہایت پُرخطر جس کو ایک اجنبی تو کیا وہاں کے رہنے والے بھی بھول جاتے تھے۔ اس گاؤں میں تربیتی جلسہ ہوا۔ اردگرد دیہات کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیاب جلسہ کے بعد واپس لوٹے تو آپ نے اپنے ہمراہ ایک احمدی نوجوان کو بطور گائیڈ لے لیا جس نے آپ کا سامان یعنی سُوٹ کیس اٹھایا ہوا تھا۔ یہ نوجوان دریا کی جانب آتے ہوئے راستہ بھول گیا۔ دریا کا اصل گھاٹ جہاں کشتی آ کر رکتی تھی اس تک پہنچنے کی بجائے وہ کسی اور سمت سے دریا پر پہنچ گیا۔ وہ خود بھی چکرا گیا۔ ہاتھ میں سامان بھی تھا۔ چنانچہ وہ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو وہیں اکیلے بٹھا کر چل دیا اور کہنے لگا کہ مَیں چونکہ راستہ بھول گیا ہوں اس لئے آپ کو تھوڑی دیر یہیں رُکنا ہوگا۔ مَیں ادھر اُدھر سے گھاٹ کا پتہ کر کے آتا ہوں پھر آپ کو وہاں لے چلوں گا جہاں سے ہم بذریعہ کشتی دریا عبور کر سکیں گے۔ آپ دریا کے کنارے اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہ جنگل میں سے آواز سُنائی دی کہ جیسے کوئی آ رہا ہو۔ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ پندرہ بیس فُٹ کے فاصلے پر ایک لمبا تڑنگا نائیجیرین نوجوان نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں ایک تیز خنجر تھا۔ وہ کچھ دیر تک آپ کو دیکھتا رہا۔ اس کو نہ جانے کونسا خزانہ اس سوٹ کیس میں نظر آ رہا تھا جو آپ کے ہمراہ تھا۔ وہ سُوٹ کیس کو گھورتا رہا اور کچھ دیر کے بعد مُنہ پھیر لیا۔ آپ بھی خاموش رہے اس سے کچھ نہ پوچھا تم کون ہو؟ یہاں کیسے آ نکلے؟۔ اس کا رُخ دوسری جانب ہو گیا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد اس نے دوبارہ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خُون اُتر چکا تھا۔ چہرہ کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ سرخ اور خُون آلود آنکھوں سے آپ پر حملہ کرنے کو تیار تھا اس نے اونچی

آواز سے آپ کو للکارا کہ دوسرے لوگ کہاں ہیں؟ اس کا مقصد آپ کو ڈرانا تھا اس کے علاوہ شاید وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ آپ اکیلے ہی اس علاقہ میں آئے تھے یا کچھ اور لوگ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ وہ آپ پر حملہ کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ واقعی آپ اکیلے تھے وگرنہ کوئی اور اس پر بھی حملہ کر سکتا تھا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت بہت طاقت عطا فرمائی۔ آپ بالکل ڈرے نہ گھبرائے بلکہ اُسے نہایت گرج دار آواز میں جواب دیا کہ میرے ساتھی یہیں ہیں۔ ایک اور چیز جس نے اُس وحشی کو روکے رکھا یہ تھی کہ اس وقت ان کے ہاتھ میں بڑی سی چھتری تھی جو اس وقت بند تھی۔ اس کی نوک کو دیکھ کر اس جنگلی نے سمجھا کہ یہ ایک قسم کا ہتھیار ہے۔ آپ چوکنّے ہو گئے اور چھتری کو اپنے دفاع کے لئے پکڑ کر ایک دم کھڑے ہو گئے۔

''افریقہ میں وحشی لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ غیر ملکی سفید فام لوگوں کا قتل ایک پیشہ کے طور پر اور اپنے وحشی پن کے جذبہ کی تسکین کے لئے کرتے ہیں، نہ کہ صرف انہیں لُوٹنے کی غرض سے۔ لہٰذا ان سے جان بچا کر نکلنا عموماً زیادہ مشکل ہوتا ہے۔'' (بحوالہ درویشانِ احمدیت جلد سوم)

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تیز تیز قدموں کی آہٹ سُنائی دی جوان کے ساتھی گائیڈ کی تھی۔ قدموں کی آواز کو سُن کر وہ وحشی سُرعت سے جنگل میں غائب ہو گیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے جو ہر آن اس میدان میں آپ کی حفاظت کرتا رہا اپنے فضل سے یہاں بھی ان کو محفوظ رکھا۔

کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا نذیر احمد مبشر کو پھر اسی علاقہ کے احمدی افریقن مبلّغ، مسٹر یعقوب، سالٹ پانڈ (غانا کی جماعت کا مرکزی دارالتبلیغ۔ ناقل) میں ان کو ملنے آئے تو انہوں نے یہ واقعہ ان کو سُنایا تو انہوں نے کہا کہ جس شخص کا حُلیہ آپ بتا رہے ہیں۔ اسی قد کاٹھ اور حُلیہ کا ایک آدمی جو کہ نائیجیریا کا رہنے والا ہے اب ہماری جماعت میں بیعت کر کے اللہ تعالیٰ کے فضل سے داخل ہو چُکا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ دوبارہ اسی علاقہ میں دورہ کی غرض سے گئے۔ آپ کو ایک میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ وہاں آپ کو جمعہ کی نماز بھی پڑھانا تھی۔ چنانچہ نماز جمعہ کے

وقت آپ کی نظریں اسی وحشی نائیجیرین پر گڑ گئیں جو جنگل کی تنہائی میں ان پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر اب اللہ تعالیٰ کے کرم سے جماعت میں شامل ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک تھا۔ تاہم آپ نے اسے وہ واقعہ یاد دلانا یا جتلانا مناسب نہ سمجھا اور وہ بھی آپ کو پہچان گیا۔ آپ سے نظر ملانے سے گریز کیا اور شرم کے مارے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ سے آگے بڑھ کر نہ ملا۔

دو نئے مدرسوں کی بنیاد

1941ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت جماعت کے ساتھ ساتھ تھی۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی کوششوں سے مختلف علاقوں کے لوگ حضرت مسیح موعود علیہ والسلام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا مقصد ان علاقوں میں تبلیغ کے کے علاوہ ان غریب قوموں کے لئے سکول کھولنا، ان کو تعلیم سے رُوشناس کروانا نیز علاج معالجے کے لئے شفا خانے مہیا کرنا تھا۔ جماعت کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ ساتھ حالات یہ تقاضا کرتے تھے کہ بچوں کے لئے نئے ادارے بنائے جائیں چنانچہ اس سال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو مقامات پر مدرسوں کا اجراء ہوا۔

15 جنوری 1941ء اکرافل مڈل سکول کا افتتاح کیا گیا۔ اس ادارے میں مسلم اور غیر مسلم بچے تعلیم پا رہے ہیں اور ہر سال سینکڑوں بچے یہاں سے فارغ ہو کر دوسری سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

27 جنوری 1941ء کو دوسرے سکول کا اجراء کیا گیا جس کا نام ''کماسی احمدیہ سکول ہے'' اس سکول کا نام اس علاقے کے نام پر رکھا گیا۔ اس کے رسمِ افتتاح کے موقعہ پر احبابِ جماعت کے علاوہ غیر از جماعت بھی کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ اس وقت کے بادشاہ شاہِ اشانٹی کے بھیجے ہوئے نمائندے بھی اس رسم میں شریک ہوئے جو جماعت کے لئے بہت اعزاز تھا۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ نے اسلام اور تعلیم کے موضوع پر ایک پُر اثر لیکچر دیا۔

پیارے آقا کا اظہارِ محبت

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی تبلیغی اور تربیتی مساعی رنگ لائیں۔افریقہ میں دورونزدیک کئی علاقوں میں احمدیت کا پودا لگ چُکا تھا۔لوگ جس مسیح کا انتظار کررہے تھے وہ آچکا تھا اور نیک فطرت سلسلہ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔بعض جگہوں پر ایسا ہوتا تھا کہ سردار احمدیت قبول کرتا تو اس کی اطاعت میں سینکڑوں لوگ جو اس کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی جماعت میں شامل ہوجاتے۔

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کے اوصافِ حمیدہ، مسلسل دعا، اور بھرپُور مساعی کا نتیجہ تھا کہ بیعتوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ جنہوں نے ان کو اس مشکل مہم پر خود روانہ فرمایا تھا اور قادیان کے ریلوے اسٹیشن پر بنفسِ نفیس تشریف لا کر اپنی پُرسوز دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔اب وہ دعائیں اور کوششیں رنگ لائیں۔حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی دینی مصروفیات اور خدمات کو سراہتے ہوئے اپنے ایک خطبہ جمعہ میں مؤرخہ 25 ستمبر 1942ء کو مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار فرمایا: (یہ خطبہ الفضل یکم اکتوبر 1942ء میں شائع ہوا)

''مولوی نذیر احمد مبشر سیالکوٹی آج کل گولڈ کوسٹ میں کام کررہے ہیں۔یہاں گو جماعتیں پہلے سے قائم ہیں مگر وہ اکیلے کئی ہزار کی جماعت کو سنبھالے ہوئے ہیں۔پھر ان کی قربانی اس لحاظ سے بھی خصوصیت رکھتی ہے کہ وہ آنریری طور پر کام کررہے ہیں۔جماعت ان کی کوئی مدد نہیں کرتی۔وہ بھی سات آٹھ سال سے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے جُدا ہیں۔بلکہ تبلیغ پر جانے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کا رخصتانہ بھی نہیں کرا سکے۔''

حبیبِ کبریاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اللہ والے بزرگ تھے۔ان کے منہ پر اکثر درود شریف رہتا۔چلتے پھرتے دعائیں پڑھتے رہتے۔مجھے ان سے بچپن کی ملاقاتوں میں پنجابی زبان کا یہ مصرعہ

خوب یادرہتا ہے۔

اللہ ہی اللہ کریا کرو خالی دم نہ بھریا کرو

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ یہ مصرعہ بھی گنگنایا کرتے تھے۔

مصطفیٰ ؐ پر تیرا بے حد ہو سلام اور رحمت

صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ بھی کثرت سے پڑھتے رہتے ان کا سر جُھکا ہوتا اور وہ چلتے پھرتے دعا و درود میں مصروف رہتے۔

1942ء کا سال آپ کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایک روز آپ سو رہے تھے کہ آپ نے خواب میں دیکھا جو آپ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''روزِ محشر ہے اور بہت سے لوگ جمع ہیں۔ ان لوگوں کے چہرے چمک رہے ہیں اور وہ گیلریوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں مخاطب ہو کر فرمار ہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رُخِ مبارک مغرب کی طرف ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند قدموں کے فاصلہ پر پیچھے کی جانب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کھڑے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے چند قدم پیچھے یہ عاجز کھڑا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جوشِ خطابت میں پیچھے کی طرف مُڑ کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف اشارہ کر کے تین مرتبہ فرماتے ہیں: یہ میرا مسیح موعود ہے۔ یہ میرا مسیح موعود ہے۔ یہ میرا مسیح موعود ہے۔''

قادر خدا کا ہاتھ مجاہد مُعلِّم کے سر پر

عجب نہیں کہ مجھے قبول کرلے مجیب خدا
فقیرِ راہ ہوں منزل مری ہے دینِ ہُدیٰ

جس علاقہ میں حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی رہائش تھی وہاں عام طور پر کمزور اور غریب

لوگ ایمان لے آئے تھے۔ یہی دین کی مقبولیت کی تاریخ ہے۔کسی بھی مذہب کو معاشرے کے کمزور اور مفلس لوگ امراء کی نسبت پہلے قبول کرتے ہیں شاید اس لئے کہ امراء میں تکبّر زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سینئر سکول کے اساتذہ نے آپ سے درخواست کہ آپ سالٹ پانڈ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بُلا کر اسلام کے بارے میں تبلیغی تقریر فرمائیں مگر حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اپنی کم علمی کی وجہ سے ان کی یہ درخواست قبول نہ کر سکے۔آپ کی انگریزی کمزور تھی۔ چنانچہ آپ نے صاف دلی سے کہہ دیا کہ:

''آپ کو معلوم ہے کہ میری انگریزی کمزور ہے۔ٹیبل ٹاک یا گاؤں میں لیکچر دینا آسان بات ہے لیکن انگریزی دانوں کے سامنے پبلک لیکچر انگریزی زبان میں دینا کوئی آسان بات نہیں اس لئے ایک ہفتہ تک دعا کرنے کے بعد مَیں آپ کو بتا سکوں گا کہ انگریزی دان غیراز جماعت کو بُلا کر لیکچر دوں یا انکار کر دوں۔''

چنانچہ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ خدا تعالیٰ کے حضور جُھک گئے ،خوب گڑگڑائے ، اللہ تعالیٰ نے ان کی نیم شبانہ دعاؤں کو قبولیت بخشی اور اپنے فضل سے ان کے دل کو سکینت نصیب ہوئی۔ چنانچہ ہفتہ بھر دعا کرنے کے بعد آپ نے ان اساتذہ کو کہا کہ آپ لیکچر کے لئے تاریخ مقرر کر کے دعوت نامے جاری کر دیں۔انہوں نے علاقے کے امراء،تعلیم یافتہ اور اچھے عہدوں پر فائز، اور حکومت کے اداروں کی خاص شخصیات کو دعوت نامے جاری کر دیئے۔اس لیکچر کے انتظامات سالٹ پانڈ سینئر سکول کی گراؤنڈ میں کئے گئے۔جماعت نے اپنی بساط کے مطابق اہتمام کیا۔اس لیکچر کا عنوان یہ تھا:

Which is the universal Religion, Islam or Christianity?

جب تمام مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تو حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ سادہ سے لباس میں تشریف لائے۔اللہ کے نام سے ابتداء کی اور یوں گویا ہوئے جیسے انگریزی ان کی اپنی زبان ہو۔نہایت روانی سے بولتے چلے گئے یوں جیسے الہام ہو رہا ہو۔جیسے ان کے اندر کوئی اور بول رہا

ہو۔آپ اس کیفیت کوخود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’چنانچہ مَیں نے ڈیڑھ گھنٹہ تک مندرجہ بالا مضمون پر انگریزی زبان میں تقریر کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ الفاظ کہاں سے نکلتے آ رہے تھے۔ مجھے مضمون کون سُجھا رہا تھا۔کیسے میری زبان پر انگریزی کے مطلوبہ الفاظ چڑھتے چلے آ رہے تھے۔میرے پاس الفاظ کا خزانہ تھا نہ مجھے فصاحت و بلاغت کا ملکہ تھا۔میری انگریزی زبان محض نبیادی حیثیت کی تھی۔مگر اس وقت مجھ پر لفظوں کے ذخیروں کی بارش ہورہی تھی۔کہاں مَیں تول تول کر بولا کرتا تھا۔سوچ سمجھ کر جواب دیا کرتا تھا کہاں مجھ پر یہ زبان اتنی آسان ہوگئی کہ جیسے میری مادری زبان ہو۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی طاقت نے میرے اندر اعتماد بھر دیا ہواور مَیں بِلا روک ٹوک خدا تعالیٰ کے فضل سے بڑی عمدگی اور روانی کے ساتھ یہ مضمون بیان کرتا چلا گیا۔‘‘

اسلام کے محاسن بیان کرنے اور اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کے ثبوت فراہم کرنے کے بعد حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ جماعت کے تمام منتظمین اور عہدیداران بھی آپ کی مدلّل تقریر سے بہت خوش اور مطمئن تھے تقریر کے بعد حاضرینِ جلسہ کوسوالات کا موقعہ دیا گیا۔ایسا علمی لیکچر ان عیسائیوں نے کبھی سُنا نہ تھا۔سامعین ایک گھنٹہ تک مختلف سوالات کرتے رہے اور حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اللہ تعالیٰ کی تائیدونصرت سے تسلی بخش جوابات دیتے رہے۔

اس لیکچر کا بہت چرچا ہوا۔لوگوں نے بہت اچھا اثر لیا۔چونکہ تعلیم یافتہ طبقہ کو مدعو کیا گیا تھا اس لئے بھی وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔چنانچہ اتوار کے دن میتھوڈسٹ چرچ سالٹ پانڈ میں جب عیسائی لوگ اپنی عبادت کی غرض سے جمع ہوئے تو چرچ کے اسسٹنٹ پادری نے گرجا میں ان عیسائی ممبران کومخاطب کرتے ہوئے کہا:

’’تم لوگ اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو لیکن مولوی نذیر احمد مبشرؓ نے جمعہ کے روز احمدیہ سینئر سکول کی گراؤنڈ میں لیکچر دیتے ہوئے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عیسائیت صرف اور صرف بنی اسرائیل

کے لئے ہے نہ کہ غیر اقوام کے لئے اور اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو عالمگیر ہے۔''

سوالات کے دوران اسی پادری نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ سے سوال کیا تھا کہ آپ نے تقریر کے دوران اپنی کتاب یعنی قرآن حکیم سے استنباط کرنے کی بجائے بائیبل کے حوالہ جات سے کیوں فائدہ اٹھایا۔ اس پر آپ نے اسے جواب دیا کہ قرآنِ کریم نے ہی مجھے یہ اتھارٹی دی ہے کہ مَیں آپ کی بائیبل سے حوالہ جات پیش کروں اور وہ اتھارٹی یہ ہے کہ:

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ۔

ترجمہ۔ اور ہم نے تجھ پر اس کتاب کو حق پر مشتمل اتارا ہے۔ وہ اپنے سے پہلی کتاب کی باتوں کو پورا کرنے والی ہے اور اس پر محافظ ہے۔ پس تُو اس کتاب کے مطابق جو اللہ نے تجھ پر اتاری ہے ان کے درمیان فیصلہ کر۔

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی یہ بات سن کر وہ پادری حیران رہ گیا اور اس کو مزید اعتراضات کی جرأت نہ ہوئی۔ (بحوالہ رسالہ تحریک جدید)

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کا یہ لیکچر مضمون کی صورت میں ریویو آف ریلیجنز کے نومبر 1943ء کے شمارہ میں چھپ چُکا ہے۔

غلامِ مسیح موعودؑ کی اہانت کی سزا

''ایک الٰہی انذاری نشان''

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ دور دور تک تبلیغی اور تربیتی سفر کرتے۔ انہی سفروں کے دوران ان کو مختلف موقعوں پر مناظرے اور مباحثے بھی کرنے پڑتے 1943 کے سال کا یہ واقعہ جماعت احمدیہ غانا کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

ٹاکوراڈی بندرگاہ کے نزدیک ایک چھوٹا سا خوبصورت گاؤں ہے جس کا نام ''اسکورا'' ہے جس میں ایک غیر از جماعت معلم تھا جسے اپنے علم اور دین کی سمجھ پر بہت ناز تھا۔ یہ شخص ہاؤسا قوم سے تعلق رکھتا تھا اور داؤدا نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس نے اپنے علم کی فضیلت کے باعث حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ سے مناظرہ کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ آپ نے اس کا چیلنج قبول کر لیا۔ وقتِ مقررہ پر آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا پہنچے۔ آپ کے ساتھ جماعت کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ مباحثہ شروع ہوا۔ دونوں فریقوں کو باری باری دلائل دینے تھے۔ اردگرد گاؤں کے لوگ کافی تعداد میں موجود تھے۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کے دلائل کے آگے وہ ٹھہر نہ سکا اور جلد ہی گھائل ہو گیا۔ یہ شخص عالم تو نہ تھا اور نہ ہی اس کے پاس وزنی دلائل تھے۔ جب ہارنے لگتا تو دشنام دہی سے کام لیتا اور سامنے بیٹھے ہوئے عیسائی سامعین کو فساد پر ابھارتا۔ مناظرہ جاری رہا یہاں تک کہ وہ بہت جوش میں آ گیا اور نہایت بدتہذیبی پر اُتر آیا۔ مغلّظات ایک طرف اس نے اپنی ہزیمت کا بدلہ یوں لیا کہ جماعت کے جنرل سیکرٹری کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

اب آگے دیکھئے خدا تعالیٰ نے اپنے پیارے مسیح کے ایک غلام کی بے عزتی کا بدلہ کس طرح لیا۔

یہ مجلس برخواست ہوئی۔ لوگ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کے علم اور فتح کے قائل ہو گئے۔ داؤد نامی معلم غصّے میں شور مچاتا، الٹی سیدھی زبان استعمال کرتا ہوا واپس اپنے گاؤں اسکورا

پہنچا۔اب خدا تعالیٰ کے قہر کی تلوار اس پر ٹوٹ پڑی۔اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔اسلام کا یہ دشمن چند دن موت وحیات کی کشمکش میں رہ کر ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور اپنی موت کے ساتھ صداقتِ حضرت مسیحِ موعودؑ کے ایک اور نشان کو زندہ کر گیا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَار۔

عرب باشندوں پر مردِ مجاہد کا عربی زبان دانی کا رعب

ایک مرتبہ 1943ء کی بات ہے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ سفر میں تھے کہ ان کو ''اکرا'' (Accra) مقام پر جانا پڑا تو وہاں جنرل پوسٹ آفس کے پاس چند دوکاندار تھے جو غیر ملکی اور سفید فام تھے۔اس علاقے میں عام طور پر سیاہ فام یعنی حبشی لوگ ہی ملتے ہیں۔کہیں کہیں سفید فام سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ تبلیغ کے مواقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔آپ نے ان دوکانداروں سے بات چیت کرنا چاہی تو انہوں نے آپ کے ساتھ انگریزی بولنا شروع کر دی۔ان کے طرزِ تکلّم سے آپ نے اندازہ لگایا کہ وہ یا تو یونانی باشندے ہیں یا فرانسیسی کیونکہ ان کا انگریزی تلفّظ صاف نہیں تھا۔گفتگو کے دوران انہوں نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ سے دریافت کیا کہ کیا آپ عربی بول سکتے ہیں؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا۔پھر انہوں نے ان کے ساتھ عربی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ شامی اور لبنانی مسلمان عرب باشندے ہیں۔

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے ان کے ساتھ تبلیغی نشست لگائی۔وفاتِ مسیح کا موضوع زیرِ بحث تھا۔جب آپ نے ان کے سامنے آیت ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ'' پڑھی تو وہ کہنے لگے کہ یہ آیت قرآن مجید میں نہیں ہے۔حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے زور دے کر کہا یہ قرآن کی ہی آیت ہے اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے مولانا نے اپنی جیب سے ایک جیبی سائز کا مصری قرآن کا نسخہ نکالا (جو وہ اکثر اپنے ساتھ رکھتے تھے مبادا ضرورت پیش آجائے تو آیت کا حوالہ دکھا سکیں) اور اس میں سے مندرجہ آیت نکال کر دکھائی۔تو وہ لاجواب ہو

گئے مگر ان پر یقین نہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ آپ کا ہندوستانی قرآن مجید ہے۔

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے ان سے اُلٹا سوال کیا کہ کیا کوئی ہے جو قرآنِ مجید تبدیل کر سکے؟ آپ ذرا ہوش سے بات کریں۔ قرآنِ مجید وہ کتاب ہے جس کی حفاظت کا وعدہ اور ذمہ خدا نے خود لیا ہے۔ قرآن کی ہی گواہی ہے ''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝۱۰'' (الحجر)

پھر مولانا نے ان کو قرآن پاک دکھایا اور سمجھایا کہ یہ حمائل شریف مصر کی شائع شُدہ ہے آپ لوگ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہندوستانی قرآن ہے۔ اس پر وہ عرب باشندے لاجواب ہو کر شرمندہ ہو گئے۔

پھر وہ اس بحث میں الجھ گئے کہ قرآن پاک میں ایک آیت ہے جو اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنے جسمِ عُنصری کے ساتھ آسمان پر جا چکے ہیں۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے ان کو قائل کرنا چاہا کہ ایسی کوئی آیت قرآن میں موجود نہیں جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت مسیح ناصری اپنے جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر اُٹھائے گئے تھے۔ پھر مولانا نے ان کی غلط فہمی کو دور کرنے اور علماء کے بتائے ہوئے غلط طریق تفسیر کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کا مطلب آیت بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ سے ہے؟ اِس پر وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ہاں یہی آیت ہے۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے ان کو کہا کہ آپ اہلِ زبان ہیں۔ آپ کو اپنی زبان بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ کیا آپ عربی زبان کی گرائمر اور قواعد سے واقف نہیں؟ مولانا نے مزید کہا کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ فاعل ہو اور ذی رُوح مفعول ہو تو اِس جگہ ''رَفَعَ'' کے معنی ترقی درجات اور بلندیٔ مراتب کے ہوا کرتے ہیں اور اس کی چند مثالیں بھی قرآن اور حدیث سے دیں۔ اس کا ان پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی عربی زبان جو ان کی اپنی زبان تھی سے ناواقفیت ان کے لئے باعثِ ندامت بھی ہوئی۔ یہ گفتگو اتنی دلچسپ تھی کہ بہت سے عربی اور لبنانی مرد اور مستورات وہاں جمع ہو گئے اور اس گفتگو سے مستفید ہوئے۔

آسمانی تائید ونصرت میدانِ تبلیغ میں

اسلام کے جیالے ہوں یا احمدیت کے پروانے دنیا کے کونے کونے میں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے کوشاں رہے۔ جہاں جہاں انہوں نے حق وصداقت کا درس دیا۔ وہاں مشکلات بھی بے انتہا دیکھیں۔ شیطان سائے کی طرح پیچھے رہتا ہے اور ہر طرف ہر جہت سے بھرپور حملہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے کہ اپنے پیاروں کو ابتلاء میں ڈالتا ہے تاکہ ان کا تزکیہ نفس ہو اور ان کے ایمان کو ترقی نصیب ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلاموں کے ساتھ بھی یہی کہانی ہے۔ گھانا کے علاقہ wa (گاؤں میں احمدیت کی بہت سخت مخالفت تھی۔ احمدیوں کو مختلف طریقے سے ڈرایا دھمکایا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل وہاں کے ایک سرکردہ نے پوری کوشش کی تھی کہ تمام احمدیوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا جائے اور ان کی بہت بڑی مسجد پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس علاقہ میں 1931ء سے مخالفت چلی آرہی تھی۔ جب سے معلم صالح نے احمدیت قبول کی سارا گاؤں مخالفت کی آگ برسانے لگا۔ طرح طرح کی اذیتوں کے علاوہ ان پر بار بار قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ جب ان معلم صاحب کی کوششوں سے 1940ء میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عاشقوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی تو سازشیوں نے وہاں کے حکّام کو بھی احمدیوں کے خلاف اُکسایا۔

اب ایک دفعہ پھر غلامانِ احمد پر آزمائش تھی۔ نومبر 1943ء کی بات ہے کہ دشمنانِ اسلام نے ایک دفعہ پھر بھرپور کوشش اور سازش کے تحت احمدیوں کو ملک بدر کرنے اور ان کو اجاڑ دینے کی ٹھانی۔ غریب نہتے گاؤں کے لوگ پہلے ہی خوف و ہراس میں زندگی بسر کر رہے تھے پھر ان کے اوپر ایک اور خطرہ، ایک اور اُفتاد کا ان کو سامنا تھا۔ احمدیوں پر پے در پے حملے کئے گئے۔ ان حملوں کا جواب محض صبر تھا۔ جب دشمن کی ایذا رسانیاں بڑھتی گئیں تو حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو ان کے قانونی مشیر نے مشورہ دیا کہ وہ ایک petition یعنی التجا تیار کریں جس میں ان تمام

تکالیف، دشمن کے حملوں اور خوف و ہراس کا ذکر کیا جائے۔اس کی تین کاپیاں کی جائیں۔ایک کاپی گورنر کو بھیجی جائے اور دونقول اپنے پاس رکھ لی جائیں۔اگر گورنر ان کی اس petition پر توجہ نہ دے تو مولانا کو چاہئے کہ ایک نقل مولوی جلال الدین صاحب شمس کو لندن بھیج دی جائے تا کہ وہ وہاں پارلیمنٹ کے کسی ممبر کے ذریعہ اس ظلم کے خلاف حکومت کے ذمّہ دار افسران کو اپیل بھجوانے کی کوشش کریں۔خیال رہے کہ اس وقت مغربی افریقہ انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور یہ علاقے ان کی کالونی کہلاتے تھے جہاں ان کا یعنی برطانیہ کا کسی حد تک قانون چلتا تھا۔ان علاقوں میں متعین بہت سے اعلیٰ افسران بھی انگریز ہی تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ نے اللہ کا فضل چاہتے ہوئے ظاہری تدبیر بھی کرنے کی تیاری کر لی۔آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس نصیحت کا لحاظ رکھا کہ اپنی طرف سے پورا زور لگاؤ پھر خدا تعالیٰ پر چھوڑ دو۔بغیر تدبیر کے بیٹھ رہنا اور خدا تعالیٰ کو آزمانا گناہ بن جاتا ہے۔آخر کار مولانا نے یہ اپیل تیار کر کے گورنر کو بھیج دی اور خود دعاؤں میں لگ گئے۔ جماعت کے افراد بھی صبر سے اللہ تعالیٰ سے طاقت وقوت طلب کرتے رہے۔اس اپیل کو بھجوائے ہوئے ابھی 6 ماہ ہی بیتے تھے کہ ایک دن حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو صبح سویرے ان کے قانونی مشیر کی طرف سے کیپ کوسٹ سے فون موصول ہوا۔انہوں نے یہ مژدہ سُنایا کہ آپ کو مبارک ہو۔مولانا نے پوچھا کہ آپ انہیں کس بات کی مبارک دے رہے ہیں؟ قانونی مشیر نے نہایت خوشی سے کہا کہ آپ کی جماعت کو حکومت کی طرف سے وہ تمام تبلیغی مراعات مل گئی ہیں گویا تبلیغ کرنے کی آزادی مل گئی ہے جیسی مراعات دوسرے مشنوں کو اسی ملک کے شمالی علاقہ میں حاصل ہیں۔فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ

آج حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اور Wa کی اس چھوٹی سی جماعت کی کوششیں اور دعائیں رنگ لائیں۔اب قانوناً ان کی پوزیشن مضبوط ہو گئی تھی۔دشمن کو بھی ویسی جرأت نہ رہی تھی۔ پہلے کی نسبت ماحول میں فرق آ گیا تھا۔

پھر دشمن کی طاقت جلد اکٹھی نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے امن کا زمانہ لمبا ہوتا گیا۔ ستمبر 1941ء سے لے کر اکتوبر 1951ء تک Wa گاؤں میں امن وسکون رہا۔ لڑائی جھگڑے کی قطعاً نوبت نہ آئی لیکن اس لمبے وقفے کے بعد کبھی کبھی دوبارہ مخالفت کی چنگاریاں بھڑکتی رہیں۔ ایک بار پھر نفرت کی آندھی چلی اور دشمن پھر سے طاقت پکڑ گیا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ دشمن جو کہ گھات لگائے بیٹھا تھا آخر اس کو موقعہ مِل گیا اور وہ 1959ء میں احمدیوں پر تیروں اور تلواروں سے حملہ آور ہوا۔ جماعت نے اپنی حفاظت کی پوری کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ناچار ان کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا اور پھر خلاصی ہوئی۔ قانون کا سہارا لے کر یہ بات ختم کی گئی۔

ان تمام مشکل حالات وواقعات، پابندیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود احمدیت کا یہ قافلہ چلتا رہا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اور Wa کی اس چھوٹی سی جماعت کو خدا تعالیٰ کی خاص تائید ونصرت حاصل رہی۔ انہیں صبر کا اجر ملا۔ ان کی استقامت کے جذبے نے **الاستقامۃ فوقُ الکرامۃ** کا معجزہ دکھایا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عُشّاقِ صادق ہزار پابندیوں کے باوجود دینِ حق کو پھیلاتے رہے، افریقن لوگوں کے دلوں کا اندھیرا چھٹتا رہا۔ اسلام کی روشنی سے سینے مُنّور ہوتے گئے۔

وہی Wa گاؤں جہاں آج سے چند برس قبل صرف ایک ہی احمدی مُعلّم صالح صاحب تھے جہاں سے احمدیوں کو ملک بدر کرنے کی سازشیں ہو رہی تھیں دن رات ان کو تنگ کیا جاتا تھا۔ وہاں کے افسران احمدیوں کو ہراساں کرتے اور طاقت کے نشے میں مختلف تدبیریں ان کے خلاف کرتے رہتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی کوششوں اور دعاؤں کے طفیل 1961ء کے بابرکت سال میں اس گاؤں میں احمدیوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا اور یہ تعداد ایک سے بڑھ کر 3508 نفوس ہوگئی۔ اس کوشش میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہاں کے مقامی مُعلّمین اور مخلصین کا بھی بہت ہاتھ تھا جنہوں نے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کے ساتھ مل کر نہ صرف تبلیغ کا میدان مار لیا بلکہ اس غریب قوم کی ہر طرح مدد کی۔

نئی مسجد

پھر بنا اک گھر خدا کا دُور بیابانوں میں
شِرک مٹنے لگا کلیسا کے شبستانوں میں

WA کی جماعت اب خدا تعالیٰ کے کرم سے پھیل چکی تھی۔ان کی موجودہ مسجد تنگ ہو چکی تھی۔اسلام کے پروانے تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ان کی چھوٹی سی مسجد ان کے لئے نہایت ہی ناکافی تھی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ان مخلص بندوں نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مالی قربانی کی عظیم الشان مثال پیش کر دی اور 9700 پاؤنڈ کی خطیر رقم جمع کر کے ایک نہایت عالیشان مسجد تعمیر کی۔یہ تعمیر نو حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی موجودگی میں نہیں ہوئی بلکہ ان کے وہاں سے چلے آنے کے بعد ہوئی۔

29 جنوری 1961 بروز اتوار مسجد کی افتتاحی تقریب عمل میں آئی جس میں حکومت کے اعلیٰ افسران،عہدیداران،عیسائی انجمنوں کے نمائندوں اور دوسری اہم شخصیتوں کو بُلایا گیا تھا۔اردگرد کے علاقوں کے احمدی بھی مسجد کو دیکھنے اور سجدۂ شکر ادا کرنے کے لئے تشریف لائے۔

وطن واپسی

دینِ احمد کا بے لوث مجاہد آبلہ پا
غریب الوطنی کی حدِّ فاصل کو چھو رہا تھا
رہ کے خالی شکم وفا کی پینگیں بڑھا گیا تھا
شیرِ اسلام کا پیالہ تھما گیا تھا
خونِ جگر سے سلیقہ زندگی کا سکھا گیا تھا
حیاتِ ابدی کا پیغام دے گیا تھا

افریقہ کے صحراؤں اور جنگلوں میں کئی برس تک جماعت سے ایک پیسہ لئے بغیر یہ مردِ مجاہد

اب حضرت سیدنا محمود خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے حُکم سے دوسری مرتبہ لمبا اور کٹھن راستہ طے کرنے کے بعد عازمِ وطن ہوا جہاں سے آپ کو گئے زندگی کی کئی بہاریں بیت چکی تھیں۔ آپ کی عدم موجودگی میں عزیز واقارب کی ایک بڑی تعداد مُلکِ راہیٔ عدم ہو چُکی تھی۔

یہ 1946ء کا سال تھا۔ اگرچہ دوسری عالمگیر جنگ ختم ہو چکی تھی اور زندگی معمول پر آ چکی تھی مگر اس جنگِ عظیم کے اثرات بہت دیر پا تھے جس کی وجہ سے مشن پر مالی مشکلات بہت زیادہ تھیں۔ جس کے نتیجہ میں تحریکِ خاص کے ذریعہ چندہ جمع کر کے مشن کا کام چلایا جاتا تھا لیکن اب آپ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا اور اتنی رقم جمع ہو گئی کہ مشن کے تمام اخراجات پورے ہو گئے۔ اس کے علاوہ مشن اپنی غربت اور کم مائیگی کی وجہ سے ایک عرصہ سے مقروض تھا۔ افریقہ میں وسائل کی کمی نے انسان کو جاہل اور نکما کر دیا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی انسان کما نہ سکتا تھا۔ سعی کرنے کی امنگ دل میں ہی رہتی تھی اور اس غریب اور مفلوک الحال قوم کی حالت نہ سُدھرتی تھی۔ آمدنی کے ذرائع بہت محدود تھے۔ ان تمام مجبوریوں کے باوجود افریقہ کی جماعت کے تعاون سے مشن کے قرضے اتارے گئے، نیز حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو بینک کی بچت کی سکیم Fixed Deposit میں ایک ہزار پاؤنڈ جمع کرانے کی سعادت مِلی۔ الحمدللہ

آپ کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی طرف سے وطن واپس جانے کا حُکم نامہ آ چُکا تھا۔ مرکز سے دو مبلغّین مکرم مولوی عبدالخالق صاحب اور مکرم ملک احسان اللہ صاحب گولڈ کوسٹ پہنچ چُکے تھے۔ 12 ستمبر 1946ء کو مکرم مولوی عبدالخالق صاحب کو جماعت گولڈ کوسٹ کا چارج دے دیا گیا۔ جماعت نے آپ کی قیادت میں بہت ترقی کی تھی۔ افریقہ کی جماعت کو آپ نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ ان کی روحانی، علمی، مالی اور اقتصادی مدد کی تھی۔ آپ کی کوششوں سے اب بہت سارے معلم اور مبلغ تیار ہو چُکے تھے۔ جاہلیت کا اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ کئی مدرسے آپ نے قائم کئے تھے۔ وہاں اپنے گھر سے دُور ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلسلہ میں داخل ہوئے تھے۔ ان کو آپ سے محبت بھی بہت تھی۔ آپ ان لوگوں کے لئے مُعلّم بھی

تھے اور محسن بھی، امام بھی تھے اور دوست بھی۔ رہنما بھی تھے اور باپ بھی۔ اب ان کو حضور کے حُکم سے واپس پاکستان بُلایا جا رہا تھا۔ جن احباب اور دوستوں میں ایک لمبا عرصہ گذارا تھا ان کو آپ کی شفقت اور دلجوئی نے گرویدہ بنالیا تھا۔

گھانا کے احباب، خواتین، بوڑھے اور بچے سبھی اداس تھے۔ آخر کار اس صابر و شاکر داعی الی اللہ کی روانگی کا دن آ پہنچا۔ دوست احباب اور بچّوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو اپنے پیارے مجاہد بھائی کو الوداع کہنے آیا تھا۔ ان کے لئے دعا کرنے آیا تھا یا ان کی دعا لینے آیا تھا۔ بھاری دل اور اداس آنکھوں کے ساتھ انہوں نے 14 ستمبر 1946ء کو اس ہمدرد ہستی کو رخصت کیا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ نے بھی حزیں دل پر قابو پاتے ہوئے ان پیار کرنے والوں کے ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ اب لوگ گلے مل رہے تھے۔ آپ کے ہاتھوں کو چُوم رہے تھے، اظہارِ محبت کر رہے تھے۔ کسی مقام پر مبلّغ کی حیثیت ایک مہمان کی سی ہوتی ہے مگر یہ ہستی مہمان کم اور میزبان عزیز زیادہ تھی کیونکہ انہی کی وجہ سے وہاں جماعتیں وجود میں آئیں تھیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جب حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ وہاں تشریف لے گئے تھے تو یہ تعداد نہایت قلیل تھی۔ اب اللہ کے فضل سے گاؤں گاؤں بستی بستی احمدیت کا پودا لگ چُکا تھا۔ آج جو لوگ یہاں کھڑے تھے کہنے کو تو وہ وہاں کے مقامی افریقی باشندے تھے مگر وہ خود ان کی تبلیغ کے زیرِ اثر احمدیت کی جھولی میں آ گرے تھے۔ اور انہی کی تعلیم سے مُعَلِّم بنے تھے اور انہی کی بدولت افریقہ کی گلی گلی میں علم اور حق کی روشنی پھیل چُکی تھی۔

اس موقعہ پر گھانا کی جماعت نے اپنی نہایت قلیل آمدنی میں سے بچت کر کے 50 پاؤنڈ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو بطور ہدیہ پیش کئے مگر آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ بھی آپ کی خوددار طبیعت سے واقف تھے۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشر کا جُھکا ہوا سر نفی میں ہلتا تھا مگر جماعت کے ددوست اتنا ہی زیادہ اصرار کرتے جاتے تھے۔ آخر کار ان کے اظہارِ خلوص کے سامنے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ آپ لاری میں سوار ہوئے تو سوگوار آنکھوں کے ساتھ بے شمار ہاتھ آپ کو الوداع کہنے کے لئے فضا میں بلند ہوئے اور مولانا نے

بوجھل دل کے ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کران پرُخلوص دوستوں کے نعروں کا جواب دیا۔سب کی آنکھیں نم تھیں، ہونٹ دعا کے لئے ہل رہے تھے۔دونوں طرف برابر کی آگ تھی۔ہجر کے لمحات محبت کرنے والوں کے لئے کٹھن ہوا کرتے ہیں۔افریقی بھائی اداس آنکھوں میں پیار کا سمندر لئے یونہی کھڑے رہے حتٰی کہ لاری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سفر کی صعوبتیں اور موت کا سامنا

آپ حضرت سیدنا محمود خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی اجازت سے پہلی مرتبہ اکرا سے روانہ ہوئے تھے۔جماعت کے پاس ہوائی سفر کے اخراجات کے لئے رقم نہ تھی حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو خشکی کے راستے ہزاروں میل کا کٹھن سفر طے کرنا تھا جو صحرائی راستے پر مشتمل تھا۔اس صحرا کا المیہ یہ تھا کہ آپ کو تین تین چار چار دن تک پانی نہیں ملتا تھا اور یہی حال کھانے کا تھا۔کئی کئی دن کچھ کھائے بنا سفر کرنا پڑا۔اس راستے کے مسافر چونکہ ان مصائب کو جانتے تھے اس لئے وہ اپنے ساتھ پانی کے مشکیزے رکھتے تھے جو وہاں کے رواج کے مطابق لاریوں کے ساتھ باندھے جاتے تھے۔ایک روز کسی نے موقع پا کر آپ کا مشکیزہ چُرالیا۔پانی اور کھانے کی پہلے ہی قلّت تھی پھر اُفتادیہ آپڑی کہ مشکیزے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔صحرا میں پانی میسر نہ ہوتو موت آنکھوں کے آگے منڈلاتی ہے۔کچھ ایسا ہی حال حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کا بھی ہوا۔ایک دن صحرا میں لاری کا ڈرائیور راستہ بھول گیا اور وہ ریتلے میدان میں شدت کی گرمی میں ادھراُدھر بھٹکتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی کا انجن بہت سخت گرم ہوگیا۔آپ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔صحرا کا سورج پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ریت تپ رہی تھی اور راہ بھولے ہوئے ان تھکے ہوئے پیاسے مسافروں پر آگ برس رہی تھی۔حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ بہت دیر تک برداشت کرتے رہے مگر پھر شدّتِ پیاس سے نڈھال ہوگئے۔پانی پاس نہ تھا کہ تشنگی مٹائی جاسکتی۔آپ بہت صابر تھے مگر جب حالت غیر ہونے لگی تو اپنے ہمراہی شاگرد مکرم یعقوب احمد صاحب کو فرمایا کہ ”میرے

سامان میں دودھ کی ایک بوتل ہے اس کو ڈھونڈو'' کافی تلاش بسیار کے بعد بوتل ملی اور آپ کے بے جان ہونٹوں کو لگائی گئی تب جا کر کہیں جسم میں جان پڑی اور دل کو تھوڑی تسکین ہوئی۔

اس دشوار گذار راستے کو طے کرتے ہوئے آپ ٹوگو لینڈ، ڈھومی، نائیجیریا، کیمرون، چاڈ، اور سوڈان کو عبور کر گئے۔

صحرا میں چونکہ سورج کی تمازت بہت ہوتی ہے اور سفر تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اس لئے شام کو یا پھر عصر کے بعد سفر شروع کیا جاتا ہے اور صبح تقریباً 10 بجے دن تک سفر جاری رکھ کر آرام کیا جاتا ہے۔ ریت فوراً احرارت خارج کر دیتی ہے اس لئے صحرا کی راتیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں اور کبھی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی گِر جاتا ہے۔ صرف موسم ہی خطرناک نہیں ہوتا بلکہ صحرا میں اور بھی خطرات ہوتے ہیں۔ صحرائی بھیڑیے اور دوسرے جانور حملہ کر دیتے ہیں نیز ڈاکوؤں کے گروہ مسافروں کو لُوٹتے نظر آتے ہیں۔

اللہ اللہ کرتے آپ کا یہ کٹھن، اذیت ناک، تھکا دینے والا اور پُرخطر سفر گذرا۔ اس سفر کے دوران حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کو چند روز لیگوس میں قیام کرنا پڑا۔ آپ جماعتِ احمدیہ لیگوس کے مہمان بنے جنہوں نے اکرامُ الضّیوف یعنی مہمان نوازی کا پُورا پُورا حق ادا کر دیا۔ قیام کے دوران جماعت نے آپ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ بھی دیا جس میں شہر کے معزّزین کو بھی مدعو کیا گیا۔ یہاں بھی مولانا کو جماعت کے تعارف اور اسلام کی تبلیغ کا موقعہ میسر آ گیا۔ اس خدمت کا سہرا مکرم الحاج فضل الرحمن کے سر تھا جو اس وقت نائیجیریا میں بطور مبلغ انچارج متعین تھے۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ ان کی شفقت کو ہمیشہ یاد رکھتے اور نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مجاہد دوست کی فرقت

ہر اک چھوڑے گا اس سراء کو
قضا لے جائے گی جہانِ دو سرا کو

جماعتِ احمدیہ لیگوس کو الوداع کہتے ہوئے آپ اپنی اگلی منزل کو روانہ ہو گئے اور سوڈان کی

بندرگاہ (پورٹ سوڈان) تک جا پہنچے۔ 31/اکتوبر 1946ء کو حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ جدّہ پہنچے اور یکم نومبر 1946ء کو فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے عازمِ مکّہ ہوئے اور خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ان کو نہایت مشکل سفر کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شہرِ مبارک میں لا کھڑا کیا۔ اب وہ خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہوئے اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہے تھے۔

جنگِ عظیم دوئم کے باعث جہازوں میں جگہ ملنی بہت مشکل تھی اس لئے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو تقریباً ایک ماہ کا عرصہ مکہ مکرمہ میں ہی گزارنا پڑا۔ چنانچہ 29 نومبر 1946ء کو آپ کو جدّہ کے لئے سواری میسر آ گئی مگر آپ کے دونوں ساتھی مکرم یعقوب صاحب اور مکرم نور محمد صاحب کو وہیں رُکنا پڑا۔ یہ سفر لاری کے ذریعہ طے کیا گیا۔ 15 دسمبر 1946ء کو تقریباً دو ہفتے کے بعد مکرم نور محمد صاحب بھی مکہّ سے جدّہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ مکرم نور محمد صاحب نے آپ کو یہ روح فرسا خبر سُنائی کہ آپ کے مکہّ سے روانہ ہونے کے دوسرے روز ہی مکرم یعقوب احمد صاحب کو پیٹ میں درد اُٹھی۔ اسی شدّتِ مرض سے ان کی آناً فاناً وفات ہوگئی۔ اِناَّلِلّٰہِ وَاِنآَّ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اور یوں ایک بے وطن مُسافر کی اجنبی دیس میں قبر بنادی گئی جہاں اس کے قریبی عزیزوں میں سے کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ وسائل کی کمی کے باعث ان کے گھر والوں تک وفات کی خبر نہ پہنچی۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو اپنے اس ساتھی کے بچھڑنے کا بہت صدمہ ہوا۔

مال کی کمی اور بھوک پر صبر

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کا جدّہ میں قیام لمبا ہوتا چلا گیا۔ جنگِ عظیم کے اثرات نے زندگی کے ہر شعبہ کو مفلوج کر دیا تھا۔ جہاز میں سیٹ ملنی بہت مشکل تھی۔ اس لئے اب یہاں بھی حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کو نہ چاہتے ہوئے ایک ماہ اور رُکنا پڑا۔ جدّہ میں ان کا قیام 29 نومبر 1946ء سے 26 دسمبر 1946ء تک تھا کیونکہ ان کو اتنا لمبا عرصہ بحری جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔

اس سارے عرصہ میں یعنی مکہ مکرمہ اور جدّہ میں قیام کے دوران حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے مال کی کمی کے باعث صبر کا اعلیٰ نمونہ دکھایا۔ آپ کے پاس سٹرلنگ ایریا کے کچھ چیک تھے جو سعودی عرب کے قانون کے مطابق کیش نہ ہو سکتے تھے۔ سعودی عرب میں اگرچہ حجاج تمام عالم اسلام سے اور دنیا کے کونے کونے سے آتے ہیں مگر اس حکومت کی پالیسی غیر مُلکی کرنسی کے بارے میں بہت سخت ہے اور اگر مسافر ان قوانین کو پہلے سے نہ جانتے ہوں تو ان کو بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کی بھی ہوئی۔ ان کے پاس کافی رقم نہ تھی کہ وہ تین وقت کا کھانا کھا سکتے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ صرف ایک وقت کا کھانا کھانا چاہئے۔ باقی پانی پر گذارہ کرنا چاہئے۔ حالات یہی تقاضا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے طبیعت ایسی خودار بنائی تھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس متوکّل ہستی نے افریقہ میں بھی نہایت سادہ خوراک کھائی اور اب یہاں بھی اپنی نسلوں کے لئے بےنظیر نمونہ چھوڑ گئے۔

سفر کی صعوبتوں، موسم کی سختیوں اور خوراک کی قلّت نے آپ کے جسم کو لاغر کر دیا تھا مگر وہ صبر کے پیکر تھے ان کے منہ سے شکوہ کا ایک لفظ نہ نکلتا تھا اور نہ ہی کسی طریقے یا اشارہ کنایہ سے انہوں نے خلیفہ وقت سے مدد مانگی یا کسی مشن کو اپنی اس حالت کی اطلاع دی۔

ملائکہ کی حفاظت

مَیں اس مکاں میں پھر آ گیا ہوں جہاں
قدم قدم پہ ملائک ہیں پَر پھیلائے ہوئے

دن یونہی گذرتے رہے۔ آخر ایک دن 26 دسمبر 1946ء کو جدّہ کی بندرگاہ پر وہ جہاز آ کر لنگر انداز ہوا جس میں آپ کو سوار ہونا تھا۔ انتظار کے یہ کٹھن مراحل ختم ہوئے۔ اس بحری جہاز میں آپ کو کراچی تک سفر کرنا تھا۔ جب جہاز روانہ ہوا تو سمندر میں بہت سخت طوفان آ گیا۔ بپھری ہوئی لہروں نے اس جہاز کے ساتھ وہ آنکھ مچولی کھیلی کہ بہت سے مسافر بیمار ہو گئے۔

طوفان کے باعث جب سمندر کی سرکش موجیں بحری جہاز کو کھلونا سمجھ کر پٹختی ہیں ایسے حالات میں جہاز رول کرتا ہے تو عام طور پر اُلٹیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے بہت سے مسافروں کے ساتھ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ بھی بیمار ہو گئے۔ سمندر کا طوفان بہت شدّت اختیار کر گیا۔ جہاز اپنے مقررہ وقت پر منزل تک نہ پہنچا اور یہ افواہ مشہور ہو گئی کہ جہاز بوجہ طوفان غرق ہو گیا ہے۔ ایک انسان جس کا گھر والوں نے اور جماعت نے تقریباً گیارہ سال انتظار کیا تھا ان کے بارے میں متوحش خبریں سُننے کو ملیں تو اندازہ لگا یئے کہ دل پہ کیا بیتتی ہو گی۔ ایسے نازک لمحات میں ذرائع ابلاغ کا کردار نہایت غیر ذمّہ دارانہ اور جھُوٹ پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ اخباروں کے لکھاری اپنے پرچے کو بیچنے کی غرض سے مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اپنے اپنے اخباروں کو فروخت کرنے کی خاطر عجیب وغریب افواہیں اور متوحش سُرخیاں لگاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کا جہاز وقتِ مقررہ سے بہت دن بعد کراچی کی بندرگاہ پر آن کھڑا ہوا۔ مدت دراز کے بعد آپ نے اپنے پیارے وطن میں دوبارہ قدم رکھا تھا۔ آپ کے ساتھ حجّاج کی بہت بڑی تعداد موجود تھی جن کے لئے سپیشل گاڑیاں چلائی جاتی تھیں۔ چنانچہ آپ حجّاج کی ٹرین میں سوار ہو کر بٹالہ پہنچے۔ اس وقت آپ نے یہ قطعاً نہ سوچا کہ مجھے پہلے سیالکوٹ جانا چاہئے اور اپنے بوڑھے والد سے ملنا چاہئے بلکہ آپ نے خلیفۂ وقت کو ترجیح دی اور سیدھا دیارِ مسیح کو چل دیئے۔ جماعت کو آپ کے آنے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ 7 جنوری 1947ء کو آپ قادیان دارالامان پہنچے۔ قادیان کے ریلوے اسٹیشن پر جماعتِ احمدیہ قادیان کے اطفال، خدّام اور انصاراللہ کا جمِّ غفیر تھا جو اس مجاہد کا استقبال کرنے کے لئے کھڑا تھا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشر پر نظر پڑتے ہی فضا نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھی۔ لوگ آپ سے ہاتھ ملانے اور معانقہ کرنے کے خواہاں تھے۔

باہر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی گاڑی میں آپ کا انتظار ہو رہا تھا۔ حضرت مولوی سید سرور شاہ صاحبؓ آپ کو حضور کی گاڑی میں بٹھا کر ریلوے اسٹیشن سے دارالضیافت لے گئے۔ داعی الی

اللہ کا فریضہ ادا کرنے کے بعد آپ کامیاب و کامران واپس لوٹے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہزاروں سعید روحوں کو آپ کے گھانا میں قیام کے دوران صداقت کی روشنی ملی تھی۔

آپ کی آمد سے اگلے روز آپ قصرِ خلافت میں تشریف لے گئے اور سیّدنا محمود خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے لمبی ملاقات ہوئی۔حضور ایک ایک جماعت کا حال تفصیل سے پوچھتے رہے۔ حضور حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کی خدمات پر بہت خوش تھے۔ ملاقات کے دوران حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ نے پچاس پاؤنڈ کی وہ رقم جو آپ کو جماعتِ احمدیہ گولڈ کوسٹ کی طرف سے بطور ہدیہ راستہ کے اخراجات کے لئے ملی تھی اسی طرح سیّدنا محمود خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں پیش کر دی۔حضور آپ کے اس خلوص اور مالی قربانی پر بہت خوش ہوئے۔حضورؓ نے آپ کی یہ رقم بشاشتِ قلبی کے ساتھ قبول فرمائی اور بعدازاں وکیل التبشیر کو جماعتی ضروریات کے لئے پیش کر دی۔

13 جنوری 1947ء مدرسہ احمدیہ قادیان کی طرف سے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا جس میں سیّدنا خلیفۃ المسیح الثانیؓ بھی تشریف رکھتے تھے۔حضور نے اپنے خطاب میں آپ کی افریقہ میں تبلیغی خدمات کی بہت تعریف کی اور فرمایا:(الفضل 15 جنوری 1947ء)

''وہ قومیں جن کی تعداد ہم سے کہیں زیادہ ہے انہیں یہ سعادت حاصل نہیں اور مولوی نذیر احمد مبشرؒ کو اس عمارت کی بنیادی اینٹ بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔''

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ○ وَتُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ○

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ چند دن قادیان میں ٹھہرنے کے بعد اپنے آبائی وطن سیالکوٹ تشریف لے گئے جہاں ان کے دوسرے عزیز و اقارب کے علاوہ عمر رسیدہ والدہ بھی منتظر تھیں۔آپ کا نکاح 19 برس قبل 1928ء میں حضرت بھائی محمود کی بڑی صاحبزادی محترمہ آمنہ بیگم سے ہوا تھا۔ جوانی کا سارا عرصہ ہماری ممانی جان نے صبر سے والدین کی دہلیز پر اور ماموں جان نے دعوتِ الی اللہ میں سعی کرتے گزار دیا۔اب جبکہ ماموں جان تشریف لائے تو آپ کی

ریش سفید بالوں سے بھر چکی تھی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد آپ کا رخصتانہ ہو گیا۔ حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؓ کی شادی پر الفضل میں ایک نوٹ شائع ہوا جو مندرجہ ذیل ہے۔

’’اسلام کے لئے ایک احمدی نوجوان کی شاندار قربانی‘‘

’’ایسے طالع منداور خوش بخت نوجوانوں میں سے ہمارے ایک نوجوان مجاہد مکرم حضرت مولانا نذیر احمد مبشر سیالکوٹی ہیں جو مسلسل گیارہ سال افریقہ میں مجاہدانہ خدمات اور سرفروشانہ تبلیغِ اسلام کا فریضہ ادا کرنے کے بعد حال ہی میں واپس تشریف لائے ہیں۔ اب جبکہ نوجوانی کا بہترین زمانہ خدا تعالیٰ کی راہ میں گزار کر لوٹے ہیں تو داڑھی میں سفید بال آ چکے ہیں۔ عنقریب رخصتانہ کی وہ تقریب منعقد ہونے والی ہے جو محض اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر گیارہ سال سے ملتوی چلی رہی تھی۔ احباب دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ اس مخلص نوجوان کی اس بہترین قربانی کو خاص طور پر شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اس جوڑے پر اپنی برکات نازل فرمائے۔

(خطاب برموقعہ عصرانہ۔ الفضل 13 فروری 1947)

اللہ تعالیٰ سے سرگوشیاں

روزنامہ الفضل میں محترم عبدالحلیم سحر صاحب آپ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

’’ایک دفعہ خاکسار مولوی صاحب کے ساتھ نماز عصر کے بعد ان کے ساتھ ساتھ اُن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ جب مولوی صاحب کا گھر آ گیا تو مجھے کہنے لگے حلیم میرے ساتھ اندر آئیں۔ مَیں آپ کو اپنی زندگی کا ایک انوکھا واقعہ بتانا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ایک پلنگ تھا اور ایک کرسی تھی۔ کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس میں سے روشنی آ رہی تھی۔ مجھے مولوی صاحب نے کہا کہ بیٹھو اور فرمایا ’’کہ ایک دن مَیں اس پلنگ پر لیٹا ہوا تھا کہ اچانک پتہ نہیں کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ آج اللہ سے باتیں کروں۔ مَیں نے لیٹے لیٹے کہنا شروع کیا کہ اے اللہ مولوی

نذیر احمد مبشر 12 سال کا تھا تو اس وقت سے نماز تہجد با قاعدگی سے پڑھ رہا ہے اور آج تک کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ تیری توفیق اور فضل سے فرض نمازیں بھی با جماعت اور با قاعدگی سے پڑھتا ہوں تیرے پیارے دین کی خدمت کی بھی توفیق بھی ملی اور قدم قدم پر تیرے فضلوں کے نظّارے بھی دیکھے۔ تیری عزت کے نظّارے بھی دیکھے۔ جو دعا بھی مانگی تو نے قبول کی، جو مانگا تو نے دیا۔ میری زندگی تو ساری کی ساری تیری اور تیرے دین کے لئے ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی اپنا دیدار تو کروا‘‘۔ مولوی صاحب کہتے ہیں یہ الفاظ مکمل ہوئے ہی تھے کہ یہ جو کھڑکی سامنے ہے اس میں سے روشنی کا ایک ہیولا سا آیا اتنا طاقت ور اور روشن تھا کہ مَیں اس پلنگ سے اُچھل کر فرش پر گِر گیا اور کوئی آدھا گھنٹہ تک بے ہوش اور بے سُدھ پڑا رہا جب تھوڑا سا ہوش آیا مَیں زور زور سے کہنے لگا کہ بس اللہ میاں بس۔‘‘

حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ کا نصیحت کرنے کا انداز بہت ہی پیارا تھا اور اثر انگیز تھا۔ جس دن دو تین نوجوان ننگے سر نماز پڑھ رہے ہوتے تو نماز کے بعد توجہ دلاتے کہ ننگے سر نماز پڑھنا اچھا نہیں اس سلسلہ میں نوجوان خاص طور پر پابندی کیا کریں۔ یہ جماعتی روایات ہیں کہ ننگے سر نہیں رہنا۔ اسی طرح قربانی کی عید سے پہلے حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ احباب کو توجہ دلاتے تھے کہ کس قسم کا جانور قربانی کے لائق ہے وغیرہ۔

محترمہ نبیلہ رفیق فوزی روزنامہ الفضل میں لکھتی ہیں:

’’عاجزہ کے ماموں حضرت مولانا نذیر احمد مبشرؒ تھے۔ ماموں جان کی طبیعت کا ایک خاص پہلو، ان کی حد سے زیادہ انکساری، سادگی اور غریب مزاجی تھی۔ اپنی پھٹی ہوئی جرابیں خود سیتے۔ اس وقت تک نئی جراب نہ لیتے جب تک پہلی پیوند لگانے کے قابل بھی نہ رہ جاتی۔

ہمارا گھر مسجد اقصیٰ کے پاس ہے۔ ایک مرتبہ گرمیوں میں رمضان کے بابرکت ایام میں جمعہ کے بعد ماموں جان ہمارے ہاں آئے۔ چونکہ ان کو دوبارہ افطاری پر جامعہ احمدیہ آنا تھا ابا جی (ڈاکٹر بشیر احمد صاحب) نے ان کو بہت اصرار کے بعد گھر ٹھہرا لیا۔ میں نے Dessert

Cooler کے آگے ان کا بستر لگا دیا۔فرمانے لگے تم مجھے اتنے ٹھنڈے کمرے میں لیٹنے کا کہہ رہی ہو تا کہ مجھے خدا بھول جائے۔ بہت کوشش کے بعد ہم بہنوں نے ماموں جان کو ٹھنڈے کمرے میں لیٹنے پر مجبور کیا۔مگر تھوڑی ہی دیر بعد استغفار پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

کچھ دیر کے بعد اباجی نے مجھے کہا کہ دو بالٹیاں تازہ پانی کی بھر کر غسلخانے میں رکھ دو تا کہ مولوی صاحب نہالیں۔ ماموں جان نہا کر نکلے تو ایک بالٹی غسلخانے کے کونے میں پڑی ہوئی تھی ،صرف ایک استعمال کی ہوئی تھی۔میں نے حیران ہو کر پوچھا، ماموں جان آپ صرف ایک بالٹی سے کیوں نہائے ہیں۔ماموں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ، اور فرمانے لگے تم مجھے کیا سمجھتی ہو! اتنے پانی سے تو بھینس نہاتی ہے۔ یہ سن کر میری ہنسی نکل گئی۔تو فرمانے لگے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دریا کے کنارے بیٹھ کر کپڑے دھونے والے دھوبی کو بھی احتیاط سے پانی استعمال کرنے کی تاکید کی ہے۔بظاہر تو ہم ماموں جان کی ایسی باتیں سن کر ہنس پڑتے ،آپس میں ایک دوسرے کو ماموں جان کی باتیں سناتے رہتے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ دل میں ہمیشہ ایک فخر کا احساس رہتا کہ ایسا روحانی وجود ہمارا اپنا رشتہ دار ہے اور ہم انہیں ماموں کہتے ہیں۔آخری دنوں میں جب کہ اعصابی کمزوری بری طرح غلبہ پا چکی تھی۔کوئی اور بات سنتے یا نہ سنتے ، جہاں جماعت کی بات کی فوراً چوکنّے ہو جاتے اور پورا پورا حصہ لیتے۔‘‘

اپنی بہن کا بیان لکھنے کے بعد مجھے کچھ اور باتیں یاد آ گئی ہیں جو درج ذیل ہیں:

ماموں جان کی خاکساری اور عاجزی کے ضمن میں ایک بات جو مجھے یاد ہے کہتی چلوں کہ جب کبھی خلیفۂ وقت ربوہ سے باہر ہوتے تو اکثر ماموں جان کو جمعۃ المبارک پڑھانے کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ٹھیک وقت پر جماعت کی گاڑی آپ کو مسجد لے جانے کے لئے آ پہنچتی مگر آپ نے کبھی کسی سخت موسم میں بھی یہ پیشکش قبول نہ کی۔اور جماعت کی گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے سخت گرمی میں پیدل چل کر مسجد تشریف لاتے اور جمعہ پڑھا کر اسی طرح پیدل گھر واپس جاتے۔حضرت ماموں جان کا نہ صرف جماعت کے ساتھ عاجزانہ رویہ تھا بلکہ گھر والوں کے

ساتھ بھی ایسا ہی سلوک تھا۔حتیٰ کہ اپنے بیٹوں کی گاڑی میں نہ بیٹھتے تھے۔کہا کرتے تھے مَیں کوئی ان کا محتاج ہوں۔

آپ نہایت سادہ لباس پہنتے۔جوتے بھی پرانے،آرام دہ اور گھِسے ہوئے۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مَیں نے ان کو کبھی نئی شیروانی میں نہیں دیکھا۔ہم بچوں پر ان کا اتنا رعب تھا کہ ہم نے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ جب وہ گھر آیا کرتے تھے تو ہم بچے ان کو دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔امی آپ کے پُرانے کپڑے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھیں اور کبھی کہہ بھی دیتی تھیں۔ماموں ہنسا کرتے تھے۔ان کا جواب مختصر سا ہوتا تھا:

''ان مقولوں اور نصائح کو اپنے پاس ہی رکھو۔ان کا مجھے کوئی فائدہ نہیں۔''

ماموں جان اپنے اصولوں کے حصار میں جکڑے ہوئے تھے۔ایک مرتبہ ہمارے ایک عزیز کی بیٹی کی شادی تھی۔ان کے ہاں نکاح پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے اور نکاح کے بعد یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ مَیں بیٹی کے گھر سے کھانا نہیں کھاتا۔ان کے ساتھ تمام مہمان بھی اٹھ گئے۔ماموں نذیر احمد مبشرؓ کی باتیں کرتے چلے جاؤ دل نہیں بھرتا۔شادی بیاہ کے موقعہ پر بھی گانے گانا پسند نہ تھا۔

ایک مرتبہ انہوں نے امی کو بتایا کہ''مجھے تین مرتبہ ربوہ شہر کے بارے میں الہامی آواز سُنائی دی:

Rabwah is the third greatest city in the world.

آپ ہمارے لئے سراپا شفقت تھے اور دعاؤں کا خزانہ تھے۔ایک مرتبہ ہماری بہن نادرہ نے ان سے دعا کی درخواست کی تو ناراض ہو کر بولے کیا تم سے پوچھ کر کرنی ہے۔ان کا دراصل مطلب تھا کہ مَیں تم لوگوں کو دعا میں کبھی نہیں بھولتا۔ان میں اتنی حیا تھی کہ ٹی وی پر بھی اگر عورت خبریں پڑھ رہی ہوتی تو ٹی وی کی طرف نظر نہ اُٹھا کر دیکھتے تھے۔ہم کہا کرتے تھے آپ ہمارے پاس یورپ سیر کے لئے آئیں تو ان کا جواب تھا کہ مَیں ان ملکوں میں جانا پسند نہیں کرتا۔ وہاں حیا نہیں ہے۔آپ یوں تو ہر کسی سے محبت کرتے تھے مگر مجھ پر ان کی ہمیشہ نظرِ کرم رہی۔ان

کی طبیعت میں جھجک تھی۔ جب ہم لوگ ان سے ملنے جاتے تو اُٹھ کر پیار وغیرہ نہ کرتے تھے مگر شاید واحد مَیں تھی جس کے لئے کھڑے ہو کر سر پر پیار دیا کرتے۔ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے۔ رعشہ کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔

یادداشت نہایت کمزور ہو گئی۔ ایک قسم کی معذوری کی کیفیت تھی۔ اس حالت میں ممانی آمنہ صاحبہ کی خدمت قابلِ قدر تھی نیز ان کے بیٹے بھائی منیر احمد صاحب اور بہو طاہرہ صاحبہ نے بے لوث خدمت کی توفیق پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آخر ایک لمبا عرصہ صاحبِ فراش رہ کر 23 فروری 1997ء کو احمدیت پر جان چھڑکنے والا، نڈر داعی الی اللہ، بے لوث خدمات کرنے والا یہ عالمِ دین اور فقیہہ ہمارے لئے صراطِ مستقیم تعمیر کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آپ کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے خطبہ کے دوران ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا جو بعد میں آپ کے کتبہ پر تحریر کئے گئے۔

کتبہ قبر قطعہ نمبر 12 نذیر احمد مبشر سابق مبلغ غانا مغربی افریقہ

ولادت 1910 وفات 97-02-23 عمر 87 سال

مرحوم نے ساری زندگی خدمتِ دین میں گذاری اور سچائی اور پاکیزگی کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھے۔ تعلق باللہ میں آپنے اپنا ایک عجیب مقام بنایا۔ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ جماعت ان کی خدمات کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ احمدیت کی تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں سُنہری باب تھے۔

آمنہ بیگم اہلیہ مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؒ مبلغ گھانا

ہماری ممانی جان حضرت بھائی محمود احمد کی پہلوٹھی اولاد تھیں۔ آپ 1914ء میں پیدا ہوئیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ نے آپ کا نام رکھا۔ ایک مجاہد دین کی اہلیہ ہونے کی وجہ سے جماعت میں آپ کی بہت عزت اور قدر و منزلت تھی۔ خلفاء کے ساتھ محبت اور اطاعت ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ ممانی جان ابتدائی صحابہ کی اولاد تھیں۔ انہوں نے اپنے والد سے حضرت مسیح موعودؑ کی ملاقاتوں کا آنکھوں دیکھا حال سنا۔ ان کے عہد مبارک کے سینکڑوں ایمان افروز قصے سنے۔ ان کی تربیت چونکہ خاص دینی ماحول میں ہوئی تھی اس لئے ہم نے ان کو علم و فضل میں بھی نمایاں دیکھا۔ آپ کو باقاعدہ سکول جانے کا موقعہ نہ مل سکا۔ گھر میں قرآن پڑھا۔ تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا گھر میں ہی سیکھا تھا پھر اس کے بعد ذاتی کوشش تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اللہ تعالیٰ نے آپ کی سعی میں ایسی برکت ڈالی کہ آپ سلیس اردو لکھنے لگیں پھر قادیان کے دینیات سکول میں آپ نے عربی عمدہ طریقے سے سیکھی۔ اس کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کیا اور خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے یونیورسٹی میں دوئم رہیں۔ اردو زبان میں ان کے خطوط پڑھ کر ہم کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ خاتون مدرسے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ نہ صرف دینی علم بلکہ ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ شعر کہنے کا بھی شوق تھا۔ حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح میں اشعار کہے نیز اردو میں نظمیں کہیں۔ اخبار الفضل میں ان کے علمی مضامین پڑھنے کو ملتے۔ مطالعے کی عادت تھی۔ حضرت مسیح موعودؑ کی کتب اور جماعت کے دوسرے رسائل و جرائد کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتیں۔ جماعت کے ساتھ ہر قسم کا تعلق نبھاتیں۔ قرآن کا تلفظ درست کروانا اور لجنہ کو ترجمہ پڑھوانا آپ کی ذمہ داری تھی۔ خدمت خلق میں پیش پیش تھیں۔ ہمسایوں کا خیال اور خبر گیری اپنا فرض سمجھتیں۔

جب آپ کا نکاح ہوا تو ماموں نذیر احمد مبشرؒ مجاہد بن کر مغربی افریقہ چلے گئے۔ ان دنوں

جماعت کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ نامساعد حالات کی وجہ سے ابتدائی مبلغین کو بہت قربانیاں دینی پڑیں۔ ماموں نذیر احمد مبشر تقریباً 18 برس بعد وطن لوٹے اس حال میں کہ جوانی کا زمانہ گزر گیا تھا۔ ممانی جان نے اتنا لمبا عرصہ انتظار میں گذار دیا۔ پھر تقریباً ایک برس بعد شادی ہوئی۔ شادی کے بعد بڑا بیٹا پیدا ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ برس کا قلیل عرصہ ہی اکٹھے ساتھ رہے تھے کہ ماموں کو دوبارہ راہِ خدا میں سفر اختیار کرنا پڑا۔ ممانی جان ایک دفعہ پھر اکیلی رہ گئیں۔ ماموں جان کی عدم موجودگی میں آپ کے ہاں بچی پیدا ہوئی جو چند ماہ زندہ رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ممانی جان نے نہایت صبر سے اس صدمے کو برداشت کیا۔ پھر ایک لمبے عرصہ کے بعد ماموں دوبارہ تشریف لائے تو خدا تعالیٰ نے آپ کو ایک اور بیٹے سے نوازا۔ یہ دونوں بیٹے محترم ڈاکٹر نصیر احمد اور محترم ڈاکٹر منیر احمد ہیں۔ آپ کی سیرت کا نمایاں پہلو عبادت اور خدا تعالیٰ سے خاص تعلق تھا۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھیں۔

آپ گھانا میں چند سال رہیں۔ وہاں کے سینکڑوں افریقی احمدی بچوں، بچیوں اور خواتین کو قرآن کریم پڑھایا اور علم کی طرف ان کو راغب کیا۔ اس کے علاوہ خواتین کو سلائی کا ہنر سکھایا۔ ان کی وجہ سے کئی خواتین کو روزی ملی۔ آپ کی شاگرد خواتین میں سے بعض ایسی بھی تھیں جن کو احمدیہ ووکیشنل سکول میں ملازمت ملی۔ ممانی جان ایک عرصہ گھانا کے احمدیہ مشن salt pand میں رہیں۔ اس وقت جماعت کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ جماعت کے پاس وسائل بھی کم تھے۔

مجاہدین کی تنخواہیں بھی نہایت معمولی تھیں۔ آپ اگرچہ بہت خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مگر خرچ کی تنگی کے باعث خوشی سے دین کی راہ میں اپنے خاوند کا ساتھ دیا اور ایک لمبا عرصہ چھوٹے بچوں کے ساتھ مغربی افریقہ جیسے پس ماندہ ملک میں نہایت صبر سے گذارہ کیا۔ ان کو کبھی گلہ کرتے نہیں سنا گیا۔ کبھی ناشکری کے الفاظ ان کے منہ پر نہ آئے۔

ہماری امی کے ساتھ ان کو بہت محبت تھی۔ امی بھی ان کو میری ماں میری ماں پکارا کرتیں۔ میں نے ساری عمر اس بات کا مشاہدہ کیا کہ امی کو اپنی اس بھاوج کے ساتھ سب سے بڑھ کر محبت تھی۔

ہمارے ننھیال کے باغات سے پھل آتا تھا۔طبیعت میں جفاکشی اتنی تھی کہ بھاری تھیلا اُٹھا کراسی وقت ہمیں دینے آتی تھیں۔الیس اللہ کی انگوٹھیاں ان کے پسندیدہ تحائف تھے۔عورتوں اور مردوں کی الگ الگ انگوٹھیاں رکھی ہوتی تھیں۔بچوں کوعیدی لینے کا شوق ہوتا ہے۔جب ہم بچے تھے تو ممانی کا دستور تھا کہ عید سے ایک دن پہلے ہمیں خوبصورت تحفے دے کر جاتیں۔مجھے سویڈن میں بھی ان کی طرف سے تحائف آتے رہے۔میں ان کو دعا کیلئے خط لکھا کرتی تھی۔میرے ہر خط کا جواب دیا۔مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ ان کے ہاں چند دن ٹھہری۔اس دوران ممانی جان کی سبز رنگ کی تسبیح گم ہوگئی۔وہ تسبیح بہت خوبصورت تھی۔میں بار بار اس کوشوق سے دیکھتی تھی۔میں بھی بچہ ہی تھی۔انہوں نے سمجھا کہ میں نے چھپالی ہے۔بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھتیں یا ڈانٹ ڈپٹ کرتیں، بازار سے سبز رنگ کا ہار خرید کر مجھے دیا۔میں وہ ہار پا کر بہت خوش ہوئی۔اگلے ہی دن ان کی گمی ہوئی تسبیح مل گئی۔پھر انہوں نے امی جان کا بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔یہ تھا میری ممانی جان کا حسن اخلاق۔

افریقہ کے لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے انگریزی سیکھی۔انہوں نے گھانا کی بچیوں اور خواتین کے ساتھ بہت محبت کی اوران کی اپنی اولاد کی طرح تربیت کی۔ممانی جان 19 جولائی 2006ء کو کچھ عرصہ بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔

اگر آج آپ گھانا جائیں اور اگر آپ کو Saltpand جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں کی خواتین اپنے بچوں کو ہمارے ماموں اور ممانی کی محبتوں کی کہانیاں سناتیں ہیں۔ان کو آج بھی وہاں بزرگ کا درجہ دیا جاتا ہے۔اور وہ بچوں کے دل میں ان بزرگوں کی محبت ڈال کر ان کے احسانات کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔اللہ تعالیٰ ہماری ان بزرگ ہستیوں کے درجات بلند فرمائے۔جو دعائیں انہوں نے ہم سب کے لئے کی تھیں ان کو قبولیت بخشے۔آمین۔ (بحوالہ الفضل)

اُستانی محمودہ بیگم صاحبہ

اہلیہ محترم اللہ بخش صاحب مالو کے ضلع سیالکوٹ

ولادت 1906 وفات 1968 عرصہ خدمت 1925 تا 1960

محترمہ محمودہ بیگم صاحبہ اہلیہ محترم اللہ بخش صاحب، حضرت مہر غلام علی صاحبؓ ابتدائی صحابی کی بیٹی تھیں۔ تاریخ میں ان کا نام احمدیہ گرلز سکول سیالکوٹ کے حوالے سے زندہ رہے گا جہاں آپ نے لمبا عرصہ بے لوث خدمت کی۔

محترمہ محمودہ بیگم صاحبہ کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کو احمدیہ سکول کی ابتدائی معلمہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ اس مدرسے کے بانیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ آپ تجربہ کار ٹیچر تھیں اور باقاعدہ اُستانی کی تعلیم اور تربیت حاصل کر چکی تھیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر پیش کر دیا اور انتھک محنت سے احمدی لڑکیوں کو مفت پڑھایا۔ ان کی اس خدمت کا ذکر تاریخ لجنہ اماء اللہ حصّہ اوّل میں یوں ملتا ہے:

''احمدیہ سکول سیالکوٹ کا قیام 1925ء میں عمل میں لایا گیا۔ لجنہ کی دو ممبرات آنریری طور پر دینیات طالبات کو پڑھاتی تھیں۔ اس مدرسے کے قیام کا اصل مقصد مسلمان لڑکیوں کو مسیحی مذہب کے اثر سے، جو مسیحی مدارس سیالکوٹ کے ذریعہ ہو رہا تھا، بچانا تھا۔ ابتداء میں یہ مدرسہ عارضی عمارت میں آنریری اُستانیوں کے ایثار سے چلایا گیا۔ یہ آنریری اُستانیاں محمودہ بیگم صاحبہ بنت حضرت مہر غلام علیؓ صاحب صحابی اور محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ (تایا زاد بہن) بنت حضرت مہر غلام حسینؓ صاحب صحابی تھیں۔

(تاریخ لجنہ اماء اللہ حصّہ اوّل صفحہ ۶۱۲)

ایک سال تک مذکورہ بالا اساتذہ نے مفت پڑھایا اور سکول کی بنیاد بنائی اور جب گورنمنٹ

کی طرف سے مدد ملنے لگی تو نصف تنخواہ گورنمنٹ سے ملتی اور نصف ادارہ کی طرف سے مگر ہزاروں سلام ہوں ان قربانیاں کرنے والیوں پر۔ وہ رجسٹر پر ''پوری تنخواہ وصول پائی'' کے الفاظ لکھتیں مگر نصف تنخواہ واپس چندہ میں دے دیتیں۔

(تقریر بموقعہ 50 سالہ جشن احمدیہ گرلز سکول۔ سیالکوٹ)

ابتداء میں جب جماعت کے پاس ذرائع کم اور نہایت قلیل آمدن تھی۔ عام لوگوں کے وسائل بھی بہت کم تھے۔ آپ نے جماعت سے تنخواہ نہ لی۔ آپ کو احمدیہ گرلز سکول سیالکوٹ میں لمبا عرصہ خدمت کی توفیق ملی۔ شادی کے بعد 'مالوکے' گاؤں چلی گئیں اور وہاں علم پھیلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھیں۔

چونکہ انگریزوں کا دور تھا اور سیالکوٹ کا علاقہ عیسائیت کا گڑھ تھا۔ موضع مالوکے بھی عیسائیوں کے زیرِ اثر تھا۔ یہاں عیسائیوں کے پرائمری سکول تھے۔ مسلمانوں کی غفلت کا یہ عالَم تھا کہ انہوں نے اپنی بچیوں کے لئے ایک بھی سکول نہ کھولا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر محترمہ محمودہ بیگم صاحبہ نے کوشش کر کے مسلمان لڑکیوں کے سکول کے لئے گورنمنٹ سے منظوری لے لی اور مالوکے کے قریب قلعہ کالروالا ضلع سیالکوٹ میں ایک پرائمری سکول کھولا اور خود ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ بعد میں محترمہ امۃ الرشید بنت حکیم فیروز دین، محترمہ سعیدہ بیگم صاحبہ، محترمہ امۃ الرشید اہلیہ راجہ یعقوب صاحب بھی اس کارِ خیر کو بجالانے میں کمر بستہ ہو گئیں۔ وقت گذرتا رہا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد ایک ٹرینڈ ٹیچر محترمہ خورشید جو کہ عیسائی تھیں گورنمنٹ کی طرف سے تعینات کی گئی۔ وہاں کے لوگوں کا آپ کو خوب تعاون حاصل رہا۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو عیسائی سکولوں سے اٹھا کر آپ کے سکول میں بھجوا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی محنت رنگ لائی اور سکول کی عمارت بھر گئی۔ لوگ آپ کے اس اقدام سے بہت خوش تھے۔ آج یہ ادارہ گرلز کالج کا درجہ پا چُکا ہے۔ الحمدللہ۔

آپ کی فرض شناسی کا یہ عالَم تھا کہ کبھی ناغہ نہ کرتی تھیں۔ چھوٹے سے شِیر خوار بچے کو چھوڑ کر

سکول چلی جاتی تھیں۔ بچے کی دیکھ بھال سے زیادہ ان کو احمدیہ گرلز سکول عزیز تھا۔ بارشوں کے دنوں میں قلعہ کالروالا سے مالو کے کا رستہ پانی اور کیچڑ سے بھر جاتا۔ مگر وہ ہمت نہ ہارتیں اور اس حالت میں سفر جاری رکھتیں کہ گھٹنوں تک کپڑے کیچڑ اور پانی سے بھیگ جاتے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے 35 سال خدمتِ دین اور خدمتِ خلق کی توفیق پائی۔ انہوں نے ساری عمر بہت آزمائشیں دیکھیں مگر ثابت قدم رہیں۔ نہایت عاجزہ اور نیک خاتون تھیں۔ باقاعدگی سے نماز تہجد پڑھنے والی اور خشوع وخضوع سے دعائیں کرنے والی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں اکثر تسبیح ہوتی اور ہونٹ ذکرِ الٰہی سے ہلتے رہتے۔ مجھے بچپنے میں ان کی موٹے منکوں والی تسبیح، عبادات اور ذکرِ الٰہی سے ہلتے ہوئے ہونٹ بہت اچھی طرح یاد ہیں۔ ہماری امی ان سے عمر میں بہت چھوٹی تھیں۔ ان کو امی سے بہت محبت تھی اور اس تعلق سے ہم سب سے بھی نہایت شفقت کا سلوک کرتیں۔ ہم جلسہ سالانہ پر ان کے آنے کا شدت سے انتظار کرتے۔ جلسہ سالانہ کے علاوہ ہر اہم موقعہ پر مرکز تشریف لاتیں۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی وفات پر آپ تشریف لائیں تو میں نے ان کے ساتھ جا کر حضور کا چہرہ دیکھا۔ ہمیشہ جلسہ سالانہ قادیان اور جلسہ سالانہ ربوہ میں بھی شامل ہوتیں۔ آپ کے تین بیٹے محترم طارق احمد تبسم، مکرم خالد صاحب اور نصیر احمد بھلّی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وصیت کرنے کی توفیق پائی۔ وفات سے پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ تقریباً بائیس دن فضل عمر ہسپتال میں رہ کر اللہ کو جاملیں۔ بہشتی مقبرہ قطعہ نمبر 2 ربوہ میں دفن ہیں۔

نوٹ ۔ جب مَیں دادا جان کے حالات لکھ رہی تھی تو میرا دل بہت اُداس ہوا اور زبانِ قلم پر یہ اشعار حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے رفیقوں کی یاد میں آ گئے جو درج ذیل ہیں:

میرے پیارے نہ جانے کہاں کھو گئے

میرے پیارے نہ جانے کہاں کھو گئے
ایسے روٹھے کہ بس اجنبی ہو گئے
چھوڑ کر شاہ و حشمت گدا ہو گئے
جو دُلارے تھے مر کر امر ہو گئے

تھے عاشق نرالے یا دیوانے تھے
کٹھن راستوں پر وہ مستانہ تھے
خاک پر بیٹھے تھے جو شاہانہ تھے
ہائے افسوس کہتے یہ فرزانہ تھے

کبھی تارہ بن کے چمکے کبھی مہتاب تھے
کبھی کہکشاں میں سجے کبھی آفتاب تھے
کبھی خوشبو کی طرح لپٹے کبھی گُلاب تھے
کبھی مشعل بنے کبھی زندگی بخش آب تھے

تھے پُرخطا عاصی، خدا نما بن گئے
شہداء ہو گئے فقہا بن گئے
علماء بنے اور مسیح کے عصا بن گئے
صلحا ہو گئے خلفاء بن گئے

پا پیادہ سفر اس پہ خالی شکم
ظلمت و آندھیوں کے سہے سب ستم
دیں کی نصرت کو اُٹھتے تھے جن کے قدم
ربّنا، کر مسیح کے رفیقوں پہ اپنا رحم

جِن کے ہونٹوں سے عرفاں کے چشمے بہے
راستہ پُرخطر خشتِ باراں سہے
لب پہ مُسکاں لئے سوئے مقتل چلے
جِن کے خوں سے بزمِ نگاراں سجے

نوری چادر اوڑھے چُھپ گئے وہ کہاں
کتھا اُنکی کیسے ہو مُجھ سے بیاں
دشت وصحرا و جنگلات میں ہوں سرگرداں
ابدی مسافر کے نقشِ پا ڈھونڈوں کہاں؟

خاندانی حالات

والد صاحب کی زبانی

(تحریر کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ایم۔سی)

بار ہا یہ خیال میرے دل میں موجزن ہوا کہ اپنے خاندانی حالات محفوظ کر دوں۔ میری قوم جو اس وقت پنجاب میں با اثر ہے، تمام کی تمام کو اپنے جدامجد کا علم نہیں۔ کوئی اپنے جدِّ امجد راجپوت بتاتا ہے، کوئی قریش، کوئی بنی اسرائیل لیکن یقینی ثبوت کہیں سے نہیں ملتا۔ گو اس وقت میری قوم ایک با اثر ورسوخ، وزارتوں کی حامل، بڑے بڑے عہدوں پر فائض ہے اور پنجاب میں بڑی قوموں میں شمار ہوتی ہے لیکن پھر بھی ایک طبقہ ایسا ہے کہ جو اس وقت بھی گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہا ہے جیسا کہ کچھ عرصہ قبل مجموعی قوم تھی۔ یہی حال میرے خاندان کا رہا ہے۔ میرے اجداد راجپوت قوم سے اپنے آپ کو بتاتے ہیں۔ اسی طرح ہماری قوم میں ذات کی تقسیم ہے۔ یہ بھی قیاساً درست معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم دراصل بنی اسرائیل ہو۔ بنی اسرائیل جب ہندوستان آئے اور یہاں آ کر مختلف جگہوں پر قابض ہوئے اور اپنی ریاستیں بنائیں تو راجپوت کہلائے۔

(ابا جی کے قلم سے لکھی گئی ان چند سطور کے آگے مَیں اپنے دادا جان اور اپنے آبائی گاؤں کے بارے میں کچھ عرض کروں گی)

حضرت چوہدری میاں مہر الدین صاحب رضی اللہ عنہ
صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام

لوگ اپنی نسل کی تحقیق کرتے ہوئے اپنا سلسلہ نسب کئی پشتوں تک ملاتے چلے جاتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں ہماری نسل ہمارے دادا جان مرحوم سے شروع ہوئی کیونکہ یہی ایک بزرگ تھے جنہوں نے اپنا سر مہدیٔ دوراں کے آگے جھکا دیا اور تا مرگ احمدیت پر قائم رہے۔

شاید ان کی قربانی کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور آج دادا جان کی نسل بوبک متر کے چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر نہ صرف پاکستان میں بلکہ انگلستان، امریکہ، کینیڈا، جرمنی، ناروے، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، انڈیا اور آسٹریلیا میں پھیل چکی ہے۔ دادا جان کی ایک ہی بہن تھی جن کا نام سکینہ تھا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے احمدیت کے نور سے منور ہوئیں۔

ہمارے آبائی گاؤں بوبک متر کا جغرافیہ یوں ہے کہ یہ ظفروال سے تین کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس سے کشمیر کی سرحد صرف پانچ میل دور ہے۔ یہیں دادا جان کی زرعی زمینیں اور آبائی گھر ہے۔ آج بھی سبھی کچھ اسی طرح ہے۔ کھیت، کھلیان، ہل، زرعی آلات، رہٹ والا کنواں، حویلی، یادیں بس مکین چل دیئے مگر ان کی خوشبو باقی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے ان کی پُرسوز دعائیں اور آہیں آج بھی فضا میں سُنائی دیتی ہیں۔ دادا جان کا پیشہ زراعت تھا۔ محنت کی خوب عادت تھی۔ ان کی فصل دوسرے کسانوں سے بہت زیادہ مقدار میں ہوتی تھی۔ دادا جان اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ بچوں کو معاشی مسائل کے باوجود پڑھایا۔ آپ اپنی اولاد اور نسلوں کے لئے خدا تعالیٰ کے حضور یوں دعا کرتے ''اے اللہ میرے بچوں کو اس گاؤں سے نکال لے۔'' منزل کٹھن تھی۔ وسائل نہایت محدود اور کم تھے۔ وہ اپنی زندگی میں گاؤں سے نکلنے میں کامیاب نہ

ہو سکے۔آپ کی وفات کے بعد ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔اور آپ کی اولاد پڑھ لکھ کر اچھے عہدوں پر فائز ہوئی۔الحمدللہ۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔

حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد کی خبر ملی تو آپ کی سعید روح بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عین جوانی یعنی 25-26 سال کی عمر میں 1902ء میں بیعت کر کے سلسلہ عالیہ میں داخل ہوئے۔ چاروں طرف سے مخالفت ہوئی۔مگر اس بہادر نوجوان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ بچوں کی دینی تربیت میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ایک بیٹے نذیر احمد کی زندگی وقف کی اور اسے جامعہ احمدیہ قادیان میں بھجوایا۔اپنی اولاد کے دل میں احمدیت کی نہ صرف محبت بلکہ نہایت درجہ غیرت بھی پیدا کی اور یہ صفت ان کے ساتھ لحد تک رہی۔

اپنی توفیق کے مطابق مالی قربانی کرتے رہتے۔آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھے۔جماعتی اجتماعات میں شوق سے حصہ لیتے۔قلیل آمدنی کے باوجود بھی وصیت کی۔تقریباً 58-59 برس کی عمر میں داداجان کی روح اپنے مولا کریم سے جاملی۔ اس وقت صرف ابا جی برسرروزگار تھے۔یا ایک بڑی بیٹی محترمہ نُور زینب صاحبہ شادی شدہ تھیں۔باقی ساری اولاد کم عمر تھی اور زیرتعلیم تھی۔آپ بہشتی مقبرہ قادیان قطعہ نمبر 1۔حصہ نمبر 7۔قبر نمبر 3 میں دفن ہیں۔

مکرم محترم ملک صلاح الدین صاحب مؤلف اصحاب احمد اپنی کتاب اصحاب احمد جلد اوّل مطبوعہ 1955ء میں تحریر فرماتے ہیں:

خاندانی حالات

مکرم میاں مہرالدین صاحب ارائیں خاندان میں پیدا ہوئے۔آباء واجداد شہر دہلی میں تعلیم کا کام کرتے تھے جہاں سے نقل مکانی کر کے ضلع سیالکوٹ میں آباد ہو گئے تھے۔سکھوں کے عہد حکومت میں یہ خاندان ایک گاؤں نواں پنڈ نامی میں جو کہ موضع ظفروال (ضلع

سیالکوٹ) سے ایک میل جانب شمال مشرق میں واقع ہے آباد تھا جہاں سے انہیں ہجرت کرنی پڑی۔ چنانچہ آپ کے پڑ دادا میاں سلطان بخش صاحب ظفروال سے تین میل کے فاصلہ پر موضع بوبک (متر) میں آباد ہو گئے۔ اس عہد کے حالات کو مدنظر رکھ کر یہ باور کرنے کے یقینی وجوہ موجود ہیں کہ اس خاندان کے مملوکہ دیہات پر ارباب حکومت نے قبضہ کر کے انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا یا حالات پیش آمدہ کے مدنظر وہ خود ہی ہجرت کر گئے۔

میاں سلطان بخش صاحب قرآن دان و فارسی دان تھے اور دادا میاں مراد بخش صاحب اپنے علاقہ میں ذی عزّت عالم اور زاہد عابد تھے۔ بہت ہی صفائی پسند تھے۔ زمین کو کاشت کرتے تھے۔ باہر کھیتوں میں بھی قرآن مجید ساتھ رکھتے تھے اور جب بھی موقعہ میسر ہوتا تلاوت اور مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ آپ اکثر اردو بولتے تھے۔ آپ کی علم دوستی اس امر سے ظاہر ہے کہ آپ مرض الموت میں رو دیئے اور فرمانے لگے کہ میرے اکلوتے بیٹے کی شادی ایک جاہل عورت سے ہوئی ہے۔ اب ہمارے خاندان سے علم اڑ جائے گا۔ میاں مراد بخش صاحب چونکہ طبعاً کاشتکاری سے نفرت رکھتے تھے۔ اس لئے باوجودیکہ ان کے والد کے قبضہ میں بہت زیادہ اراضی تھی۔ انہوں نے 1865ء کے سرکاری بندوبست کے وقت اکثر حصہ اراضی، جس پر براہ راست تصرف نہ تھا، اپنی ملکیت لکھوانے سے انکار کر دیا۔ تاہم جو زمین قبضہ میں رہ گئی وہ بھی ان کے باعزت گذارہ کے لئے کافی تھی۔ علاوہ ازیں آپ کی گذر بسر بکری، گائے اور بھینس کی پرورش پر تھی۔

میاں مہرالدین صاحب کے والد صاحب کی وفات 1894ء کے قریب ایک حادثہ سے ہوئی۔ ایک رات چور مکان میں گھس آئے اور ان کی اہلیہ کے زیورات چھیننے کی کوشش کی وہ بہت طاقتور تھیں اور ان سے زیور چھین لینا چوروں کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے چوروں کا خوب مقابلہ کیا اور شور مچایا۔ ان کے خاوند نے چوروں کا تعاقب کیا۔ وہ دیوار پھاند گئے۔ پھر بھی انہوں نے پیچھا نہ چھوڑا اور دیوار پھاندی۔ لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ انہوں نے آپ کو لاٹھیوں سے اس قدر مارا کہ آپ جانبر نہ ہو سکے۔ چونکہ گندم نکالنے کے دن تھے اور لوگ باہر کھلواڑوں میں

تھے اس لئے بروقت کوئی بھی مدد کو نہ پہنچ سکا۔

ولادت اور تعلیم

میاں مہرالدین صاحبؒ بکرمی مطابق 1876ء میں ''موضع بوبک متر'' مذکور میں پیدا ہوئے۔ باوجودیکہ آپ کے والد بزرگوار کو بچوں کو تعلیم دلانے کا بہت شوق تھا چنانچہ آپ نے تھوڑا سا عرصہ ایک قریب کے گاؤں کی مسجد میں قرآن مجید کا ترجمہ وغیرہ جتنی تعلیم عام طور پر مساجد میں دی جاتی تھی حاصل کی اور بعدازاں نامعلوم وجوہات کی بناء پر آپ کو پڑھائی ترک کرنی پڑی۔ لیکن مطالعہ کا شوق کافی تھا اس لئے لکھنے پڑھنے میں کافی مہارت تھی اور سلسلہ کی کتب اور مسائل دینیہ سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔

اپنے بچوں کو سکول کے بعد کے وقت میں گھر پر خود پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اب مویشیوں کے چرانے کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ کاشتکاری وغیرہ کے کام کاج کی عمر کو پہنچے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار کی وفات کا حادثہ جانکاہ پیش آ گیا۔ آپ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں جوان والدہ اور بہن بھائیوں کی پرورش اور ساہوکار کے قرضہ کا بارگراں آپ کے ناتواں کندھوں پر آ پڑا۔ ایسی مشکلات مرد متوکّل اور جواں ہمت کے لئے سوہانِ روح بننے کی بجائے اس کی سعی عمل کو تیز تر کرنے کا موجب ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ آپ تلاش روزگار میں باہر نکل جاتے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے چند ماہ میں ہی حالت سدھر گئی۔ قرض اتر گیا اور خوشحالی عود کر آئی۔

اہلی زندگی

والد صاحب کی وفات کے قریب آپ نے شادی کی تھی۔ لیکن یہ عورت جاہل مطلق، دین سے بے پرواہ اور زبان دراز نکلی اور جب نباہ کی کوئی صورت نہ نکلی تو پانچ سال کے بعد مجبوراً آپ کو ابغض الحلال (طلاق) کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس بیوی سے آپ کی کوئی اولاد نہیں۔ بہن بھائیوں

کی شادیوں سے فارغ ہوکر چوبیس سال کی عمر میں 1900ء کے قریب آپ نے محترمہ غلام فاطمہ دختر منشی حاکم دین صاحب احمدی قوم ارائیں سکنہ موضع درگانوالی ضلع سیالکوٹ سے شادی کی۔ موصوفہ زندہ نہیں۔آپ کی جس اولاد کو خدمت دین کا موقعہ ملا وہ موصوفہ کے بطن سے ہے۔

حلیہ اور قبول احمدیت سے قبل کی زندگی

آپ خوبصورت جوان تھے۔قد درمیانہ، بال گھنگریالے اور حد درجہ سیاہ، آنکھیں ہلکی نیلگوں، ناک موٹا، داڑھی گھنی، رنگ سانولا،جسم گٹھا ہوا مضبوط، جفاکش اور محنت کرنے کے عادی۔حد درجہ صفائی پسند۔باوجود خوبصورت اور جوان ہونے کے آپ اوائل عمر سے ہی خدا ترس اور نماز روزہ کے پابند تھے اور شب بیدار۔عبادت کے شوق میں درود و وظائف پڑھتے ہوئے راتیں جاگ کر گذار دیتے۔ایک دو بار چلہ کشی بھی کی۔آپ کے حسن اخلاق،ایمانداری اور راست گفتاری کی وجہ سے گاؤں کے اکثر لوگوں کو آپ سے بے حد عقیدت تھی اور مریدوں کی طرح آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔پہلے آپ حنفی المذہب تھے لیکن آپ کی دوسری اہلیہ محترمہ وہابی تھیں۔ان کے اثر سے آپ نے کتب کا مطالعہ کرکے وہابی طریق اختیار کرلیا تھا اور پیر پرستی بہت حد تک ترک کردی تھی۔

قبول احمدیت

آپ روپیہ کی وصولی کے لئے لائل پور(فیصل آباد) گئے ہوئے تھے۔گھر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ آپ کے برادر نسبتی مکرم حکیم مولوی اللہ دتا صاحب (ولد منشی حاکم دین صاحب) سکنہ درگانوالی ضلع سیالکوٹ تین چار سال سے دل سے احمدیت کے قائل ہو چکے ہیں گو ابھی اس کا اظہار نہیں کیا۔1902ء کے قریب چوہدری غلام حسن صاحبؓ سیالکوٹ نے بھی احمدیت قبول کرلی اور اپنے ہم زلف میاں مہرالدینؓ صاحب کو خط کے ذریعہ تلقین کی۔چنانچہ میاں مہرالدین صاحبؓ

نے مع اہل خانہ بیعت کر لی بلکہ اہلیہ محترمہ کو بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے 1904ء میں سیالکوٹ تشریف لانے پر زیارت کا موقع مل گیا۔ چوہدری صاحب اور میاں صاحب کی دستی بیعت کے معاً بعد حکیم صاحب اور باقی اقارب کو بھی بیعت کی توفیق مل گئی۔

قادیان کا سفر اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت

آپ بیان کرتے تھے: ''حضور جب (1904) میں سیالکوٹ تشریف لے گئے اور کرشن ہونے کا دعوی بیان کیا تو اس تقریر میں حضور کا رعب اور جلال مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ مجھے دوسروں کے چہرے سیاہ نظر آتے تھے اور حضور کا چہرہ نور وجلال سے پُرنظر آتا تھا۔''

ویرکا نارووال ریلوے لائن کھلنے سے قبل آپ قادیان اکثر پیدل آیا کرتے اور سال میں دو تین دفعہ ضرور آتے۔ قادیان ہجرت کر آنے کی تڑپ تھی۔ زمین بھی خرید کی۔ لیکن مالی مشکلات سدراہ ہو گئیں۔ جلسہ سالانہ پر بھی تشریف لاتے۔ اپنے علاقے کے امیر تھے ہر سال مشاورت میں تشریف لاتے۔ ہر سال کی رپورٹ کارگزاری مشاورت میں ان کا نام درج ہے۔

(داداجان کی وفات کے بعد اباجی نے ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو درج ذیل ہے)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک مخلص صحابی چودہری مہر الدین صاحب رضی اللہ عنہ مرحوم کے حالاتِ زندگی

از قلم ڈاکٹر بشیر احمد صاحب

عاجز کے والد چوہدری مہر الدین رضی اللہ عنہ بکرمی مطابق 1876 میں اپنے گاؤں موضع بوبک (متر) ظفر وال ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر سے ہی متقی اور پرہیز گار تھے۔ نماز تہجد باقاعدہ ادا کرتے اور خدا اور رسول کی محبت میں سرگرداں رہتے۔ چلّہ کشی بھی کی۔ درود و وظائف کی خاص لگن تھی۔ آپ کی ایمانداری اور سچ بولنے پر لوگوں کو کامل یقین تھا۔ آغاز شباب میں ہی لوگ آپ کو ولی اللہ سمجھتے اور شائقین کا جمگھٹا اکثر آپ کی صحبت میں رہتا۔

آپ کے ہم زلف چوہدری غلام حسن صاحب رضی اللہ عنہ نمبردار سیالکوٹ نے احمدیت قبول کر کے ان کو خط لکھا۔ والد صاحب سیالکوٹ گئے اور جب باتیں سُنیں تو بغیر کسی چُوں و چرا کے اسی وقت اگست 1902ء میں مشرف بہ احمدیت ہو گئے۔ احمدیت کا نشہ مستانہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ گاؤں میں واپس آتے ہی تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ اس پر مخالفت کا ایک طوفان اُٹھا۔ جو آپ کے پاؤں چومتے تھے اور جو آپ کی صحبت میں بیٹھنا فخر سمجھتے تھے وہ آپ کے سایہ تک سے پرہیز کرنے لگے۔ گاؤں کی مسجد میں، جہاں آپ نماز تہجد ادا کیا کرتے تھے، جانے سے روک دیئے گئے۔ امام مسجد نے لوگوں کو آپ کے خلاف بہت بھڑکایا۔ لیکن قدرتِ ایزدی نے چند ہی روز میں اسے ذلیل کر کے گاؤں سے نکال دیا۔ دوسرا امام جو آیا اس نے بھی مخالفت میں حد ہی کر دی۔ مکمل بائیکاٹ کا فتویٰ دے دیا۔ ایک دن اس نے زدوکوب کرانے کا منصوبہ باندھا۔ گاؤں

کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور والد صاحب مرحوم کو عشاء کے بعد بلا بھیجا کہ آ کر مباحثہ کر لیں۔ والد صاحب خوشی خوشی چند کتب لے کر گئے مگر وہاں رنگ ہی اور دیکھا۔ بھانپ تو گئے لیکن خدا تعالیٰ پر توکل کر کے بیٹھ گئے۔ گفتگو حیات و وفاتِ مسیح ناصری پر شروع ہوئی۔ امام صاحب جاہل مطلق تھے۔ مباحثہ خاک کرتے آپے سے باہر ہو کر ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ ایک کتاب بھی پھاڑ ڈالی اور لوگوں کو حملہ کے لئے للکارا لیکن خدا حافظ تھا۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ والد صاحب مرحوم گھر واپس آتے ہی دعا میں مشغول ہو گئے۔ اور تمام رات خدا کے حضور عرض و نیاز میں گذار دی۔ اللہ تعالیٰ نے بروقت امداد کی۔ چند ہی روز کے بعد امام صاحب بدچلنی میں پکڑے گئے اور پِٹ کر روتے ہوئے نہایت ذلّت سے گاؤں سے نکل گئے۔

اسی طرز کے کئی اور واقعات ہیں۔ قصہ کوتاہ آخر زندگی تک آپ کو مخالفوں نے ہر رنگ میں تکلیف پہنچائی۔ مالی و جانی نقصان کے علاوہ عزت و آبرو پر شدید حملے کئے لیکن آپ نے قابلِ تقلید حوصلہ اور تقویتِ ایمان دکھائی۔ آپ میں عفو کا مادہ بھی کمال تھا۔ اشد ترین دشمنوں کو فوراً معاف کر دیتے اور وقت پڑنے پر حتی الوسع امداد کرتے۔ گاؤں کے ایک شخص نے، جس کو یتیمی کی حالت میں آپ نے بہت امداد دی تھی، آپ کی عزت پر حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو محفوظ رکھا۔ پولیس نے ملزم کا چالان کر دیا اور سارے گاؤں نے اس کی امداد کی مگر جُرم ثابت ہو گیا۔ مجسٹریٹ صاحب کئی سال قید کی سزا سُنانا چاہتے تھے۔ اس وقت ملزم معافی کا طلبگار ہوا اور باوجود مجسٹریٹ صاحب کی ناراضگی کے آپ نے معاف کر دیا اور ملزم کو برائے نام سزا ہوئی۔

غالباً اس علاقہ میں آپ پہلے احمدی تھے۔ وہ دن بھی عجیب پُر کیف و سرور تھے۔ دور دور سے احمدی دوست آپ کی ملاقات اور حوصلہ افزائی کے لئے تشریف لاتے تھے۔ قریباً ہر روز ایک دو مہمان آ جاتے۔ سیالکوٹ ظفروال والی سڑک پر آپ کا گاؤں ہے۔ آنے جانے والے احمدی احباب اور مبلغین سلسلہ کی خدمت کا موقع ملتا رہتا۔ آپ فخریہ فرمایا کرتے تھے:

''میرا گھر اللہ تعالیٰ نے احمدیوں کے لئے ڈاک بنگلہ بنایا ہے''

تبلیغ کی خاص دُھن تھی۔ جو ملتا کچھ نہ کچھ سُنا دیتے۔ کتبِ سلسلہ خرید لاتے اور تھوڑا سا اشتیاق ظاہر کرنیوالے کو بھی دے دیتے پھر واپس نہ لیتے۔ اخبار کا مطالعہ باقاعدہ فرماتے۔ اخبار ہر وقت جیب میں رکھتے اور لوگوں کو بھی سُناتے۔

ویرکا ناروال ریلوے لائن کے کھلنے سے قبل آپ اکثر قادیان پیدل جایا کرتے۔ سال میں دو تین دفعہ ضرور جاتے قادیان ہجرت کر جانے کی تڑپ تھی زمین بھی خریدی۔ کئی تجاویز سوچیں لیکن مالی مشکلات نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ رات کے ایک دو بجے تہجد کے لئے اُٹھنا آپ کا معمول تھا۔ بچوں کو صبح چار پانچ بجے جگا دیتے۔ فرمایا کرتے ''ابھی سے ان کو عادت پڑے گی تو بڑے ہو کر عابد بنیں گے۔'' آپ کا معمول تھا کہ دعا بلند آواز سے کرتے۔ اس قدر سوز و گداز سے دعا کرتے کہ سننے والے بھی کانپ جاتے۔ اولاد، دیگر عزیزوں، دوستوں، حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ، اخبار میں شائع شُدہ درخواست کنندگان دعا اور کل احمدیوں کے لئے دعا کرتے۔ کسی دوست عزیز یا سلسلہ پر جب کوئی تکلیف سنتے تو اسی وقت دعا میں مشغول ہو جاتے۔ دعا سے آپ کو عشق تھا۔ دعا کرتے کرتے آپ تھکتے ہی نہ تھے۔

اولاد کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال رکھتے۔ حتیٰ المقدور ہر ایک کو خود تعلیم دیتے۔ لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا اور قرآن کریم خود پڑھایا۔ ایک لڑکی کو تین پارہ تک قرآن کریم حفظ کرایا لیکن وہ فوت ہو گئی۔ ہمیں فرمایا کرتے ''تمہاری ڈاکٹریوں، نوکریوں اور تعلیم سے مجھے تسکین نہیں ہو سکتی جب تک تم خادمِ دین نہ بنو''۔

برادرم چوہدری نذیر احمد مرحوم نے جب تحریکِ جدید میں کام کرنا شروع کیا تھا تو آپ پھولے نہ سماتے۔ وہ دو تین دفعہ چھٹی لے کر گھر آیا تو بہت ناراض ہوئے۔ مرض الموت میں آپ بیمار تھے۔ نذیر احمد مرحوم دو روز کی رخصت پر کسی کام سے گھر آیا۔ اس نے بصد منّت آپ کی تیمارداری کرنی چاہی لیکن آپ نے فرمایا ''مجھے تمہاری خدمت کی ضرورت نہیں۔ جاؤ اور اپنے امام کے قدموں کی خاک بن جاؤ۔'' چنانچہ آپ نے مرحوم کو قادیان واپس بھیج دیا۔

26 اگست آپ کو معمولی بخار ہوا۔ چار پانچ روز تک چلتے پھرتے رہے پھر حالت بگڑ گئی۔ مکرمہ والدہ محترمہ نے بار بار کہا کہ اپنے بیٹے ڈاکٹر بشیر احمد کو خبر کر دو لیکن آپ انکار کرتے رہے۔ والدہ محترمہ انکار کی وجہ دریافت کرتیں تو فرماتے کہ ضرورت نہیں۔ غالباً آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب سفرِ آخرت لازمی ہے۔لین دین اور دیگر معاملات میں مفصل ہدایات دے دیں۔ وصیت کے متعلق فرمایا ''فلاں قطعہ زمین مجھے سب سے زیادہ پیارا ہے وصیت میں وہی دینا'' ایک روپیہ کسی ہندو کا کئی سال ہوئے دینا تھا جو آپ کو بھول چکا تھا اور وہ ہندو بھی فوت چکا تھا۔ قدرتاً مرض الموت میں یاد آ گیا اور اس کی ادائیگی کی تاکید فرمائی۔

6 ستمبر کو حالت نازک ہوگئی۔ ایک تار مجھے اور ایک تار چوہدری نذیر احمد مرحوم کو قادیان دیا گیا۔ اسی دن عصر کے وقت والد صاحب مرحوم نے غیر معمولی آواز سے نیم بے ہوشی کی حالت میں فرمایا ''وہ گر گیا، گر گیا او نیک بخت'' غالباً آپ کو برادرم نذیر احمد مرحوم کی شہادت کا واقعہ کشفی طور پر دکھلایا گیا۔ یہ عین وہی وقت تھا جب مرحوم نذیر احمد کو چند گھڑ سواروں نے گھر آتے ہوئے راستہ میں قادیان کے قریب کچل دیا۔ اس کے بعد آپ بے ہوش ہو گئے اور تین بجے صبح اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ عین اسی وقت برادرم چوہدری نذیر احمد مرحوم نے بھی اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اسطرح پر یہ دونوں سعید روحیں سفرِ آخرت میں ہم سفر ہوگئیں۔

فنا ہر ایک نفس کو ہے۔ صدمات از قسم مذکورہ بالا عام ہوتے ہیں اور زمانہ آہستہ آہستہ ان کا نقش بھی دلوں سے مٹا دیتا ہے۔ لیکن والد مرحوم کی اَن تھک اور پُر از سوز و گداز دعاؤں سے محروم ہوجانا ہمارے لئے ایک ایسا صدمہ ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے اور مدتوں یہ داغ سینہ سے نہیں مٹے گا۔ پیارے آقا و امام سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز بزرگانِ سلسلہ اور احمدی احباب سے عاجزانہ درخواست ہے کہ مرحومین کی مغفرت کے لئے دعا کریں اور ہمارے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہماری والدہ محترمہ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور وہ خود ہمارا حامی و ناصر ہو۔ (بحوالہ روزنامہ الفضل قادیان دارالامان مورخہ 14 دسمبر 1935ء)

(احقر ڈاکٹر بشیر احمد میڈیکل آفیسر۔ موچھ ضلع میانوالی)

دادا جان چونکہ موصی تھے اس لئے ان کو بہشتی مقبرہ قادیان میں قطعہ نمبر 1 حصہ نمبر 7 قبر نمبر 3 میں دفنایا گیا۔ (آپ کی وفات پر اباجی کی طرف سے احباب جماعتِ احمدیہ کی خدمت میں جو دُعائے درخواست شائع ہوئی وہ درج ذیل ہے:)

دُعائے مغفرت

بندہ کے والد چودہری مہرالدین صاحب 30 یوم بعارضہ بخار بیمار رہ کر 35-09-7 بروز سنیچر صبح 3 بجے فوت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ مرحوم اس علاقہ میں سب سے پرانے احمدی اور نہایت ہی مخلص، متقی، اور پُرجوش احمدی تھے۔ مرحوم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پُرانے صحابیوں میں سے تھے۔ بندہ کا چھوٹا بھائی نذیر احمد جو وقف کنندگان تحریک جدید میں سے تھا اور دفتر تحریک جدید میں کام کرتا تھا۔ قادیان سے آتے ہوئے راستہ میں شر پسندوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ احباب ان ہر دو مرحومین کے لئے دُعائے مغفرت کریں۔

(خاکسار ڈاکٹر بشیر احمد میڈیکل آفیسر)　　　　(بحوالہ روزنامہ الفضل)

رفیقۂ حیات محترمہ غلام فاطمہ صاحبہ

دادا جان کو پھر اللہ تعالیٰ نے بہت محبت اور وفا کرنے والی شریک حیات عطا فرمائی۔ گویا دنیا میں ہی جنت مل گئی۔ ہماری دادی جان کا نام غلام فاطمہ تھا۔ ان کے والد کا نام حاکم دین تھا۔ ان کو بچپن میں ان کی کسی بھابی وغیرہ نے طعنہ دیا۔ بہت حساس طبیعت تھی۔ یہ طعنہ سن کر گھر چھوڑ دیا اور گھر بدری کے بعد پتہ نہیں کیسے تعلیم حاصل کی اور کوئٹہ صوبہ بلوچستان میں امیر منشی ہو گئے۔ بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے استاد رکھے۔ دادی جان فارسی، اردو کے علاوہ قرآن کریم کا ترجمہ بھی جانتی تھیں۔ ان کی زبان بہت شستہ تھی۔ نہایت فصیح و بلیغ اردو بولتی تھیں۔

جب شادی کے بعد آپ بوبک گاؤں گئی ہیں تو وہاں کوئی خاتون پڑھی لکھی نہ تھی۔ آپ کے

دم سے گاؤں والوں کے نصیب کھل گئے۔ تعلیم کی وجہ سے ان کی بہت عزت تھی۔ پھر آپ نے ان لوگوں کو ایک بڑا فائدہ اور پہنچایا کہ ارد گرد کی بچیوں اور خواتین کو قرآن پاک پڑھایا۔ گھر میں تنگی تھی۔ سوت کات کر تھوڑی بہت آمدنی پیدا کرتیں۔

آپ نے اپنے خاوند محترم میاں مہرالدین کے ساتھ ہی 1902ء میں بیعت کی۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھیں۔ 1904ء میں جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام سیالکوٹ تشریف لائے تو دادی جان کو بھی ان کی زیارت کا موقعہ مل گیا۔ دادی جان نے اپنی بساط کے مطابق اپنے شوہر کی بہت خدمت کی، ان کا ساتھ دیا۔ جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ اس ماں کا دل بہت بہادر تھا جس نے اپنے کمسن بچوں کو تین کوس کے فاصلے پر سکول بھیجا۔ موسم کی سختیاں، لمبا پیدل سفر، بچے چھ سال کی عمر میں صبح سویرے اٹھتے اور سکول کو پیدل چل پڑتے۔ راستے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر راستہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بچے ٹھنڈی ہوا دیکھ کر درخت کے سہارے سستانے کو بیٹھ جاتے اور خراٹے لینے لگتے۔ کسی بیل گاڑی والے کا گذر ہوتا تو وہ اٹھا کر چھکڑے میں لا دلیتا اور سوئے ہوئے بچے کو گھر چھوڑ جاتا۔ صبح چار بجے کے نکلے ہوئے بچے شام ڈھلے گھر آتے۔ گاؤں کی کم علم خواتین طعنے دیتیں اور کہتیں ان بچوں کے گلے میں کشکول ڈال دو۔ مانگ کر گزارہ کرلیں گے ان کو چھوٹی عمر میں اتنے کوس کے سفر پر بھجوانا ظلم ہے۔ مگر دادی جان کو کسی کی قطعاً پرواہ نہ تھی۔ بچے تھک کر آتے تو دادی جان ہر روز ان کو نہلاتیں تا کہ وہ تازہ دم ہوجائیں۔ سکول کا کام کرواتیں۔ سکول سے چھٹی ممنوع تھی۔ چونکہ وہ خود پڑھی لکھی تھیں اس لئے انہوں نے اتنی تکلیف کے باوجود اپنے بچوں کو تعلیم دی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگوں کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔ ہمارے حق میں ان کی دعائیں قبول فرمائے۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کا نام روشن کرسکیں۔ آمین۔ ایک لمبا عرصہ صاحب فراش رہ کر اپنے بیٹے محترم نور احمد کے ہاں وفات پائی۔ آپ کی تدفین بہشتی مقبرہ ربوہ قطعہ نمبر 3 میں ہوئی۔

نوٹ: ہمارے ابا جی نے اپنی والدہ کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو لجنہ اماء اللہ کے رسالہ مصباح میں چھپ چکا ہے۔ یہ مضمون ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

میری امی محترمہ فاطمہ بی بی صاحبہؓ

(کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب۔ ایم سی۔ (بحوالہ، مصباح۔ فروری 1970ء)

میری امی مجھے میرے بچپن میں نہایت میٹھی میٹھی آسان فہم زبان میں دین کی باتیں کہانیوں کے رنگ میں سنایا کرتی تھیں۔ جو آج تک میرے ذہن نشین ہیں اور جن کی بدولت میرے دل میں بچپن ہی سے دینِ اسلام اور احمدیت کی محبت راسخ ہو گئی تھی۔ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ مرحومہ مجھے سنایا کرتی تھیں کہ کب اور کس طرح انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت کا شرف حاصل کیا اور بڑی پیاری پیاری باتیں حضرت مسیح موعود کے دعویٰ کے متعلق سنایا کرتی تھیں۔ میری والدہ محترمہ کا اسمِ گرامی فاطمہ بی بی تھا۔ آپ مکرم جناب منشی حاکم دین صاحب سکنہ موضع درگاہ والی ضلع سیالکوٹ کی دختر نیک اختر تھیں۔ آپ کے والد محترم ان کے بچپن کے زمانہ میں کوئٹہ چھاؤنی میں انگریز افسروں کو اردو وغیرہ پڑھایا کرتے تھے اور میر منشی کہلاتے تھے۔ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے گھر پر استاد رکھ کر نہایت مستحسن انتظام کر رکھا تھا۔ میرے والد بزرگوار میاں مہر دین صاحبؓ موضع بوبک تحصیل ظفروال ضلع سیالکوٹ کے ایک متوسط زمیندار تھے۔ ہمارے بچپن کے زمانہ میں ہمارے گاؤں میں کوئی بھی فرد لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا بلکہ اردگرد کے دیہات میں بھی شاذ ہی کوئی پڑھا لکھا ملتا تھا۔ اس لئے اکثر لوگ اس غرض کے لئے میرے والدین کے پاس آیا کرتے تھے۔ چونکہ والد صاحب باہر کام کاج میں مصروف ہوتے تھے۔ اس لئے یہ ڈیوٹی میری والدہ ہی کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ ان دنوں ہمارے علاقہ میں سوائے ظفروال کے اردگرد کوئی سکول نہ تھا۔ اس لئے بہت سی لڑکیاں قرآن کریم اور اردو پڑھنے کے لئے والدہ کے پاس آجایا کرتی تھیں۔

والدہ کے حُسنِ سلوک کا شہرہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے بچپن کے زمانہ میں ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارا گھر ایک اچھا خاصہ مدرسہ ہے۔ اس درس وتدریس کے ساتھ ساتھ میٹھی میٹھی باتوں کے ذریعہ احمدیت کی تبلیغ بھی ہوا کرتی تھی۔ میرا تأثر یہ ہے کہ تقریباً ہر لڑکی احمدیت سے واقف ہوجایا کرتی تھی۔ اس خدمت کے علاوہ میری والدہ کی عادت تھی کہ بہت سی ضروری ادویات گھر میں رکھا کرتی تھیں اور ہر ضرورت مند کو مفت مہیا کردیا کرتی تھیں۔

کتنے پیارے تھے وہ دن۔ کتنی پیاری تھیں میری بے بے جی۔ سبھی لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ زمانہ بدل گیا نہ ہم وہاں رہے نہ میری امی نہ وہ لوگ۔ ان دنوں کی یاد ہی دل میں کسک پیدا کردیتی ہے۔ ظفروال ان دنوں تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا۔ ظفروال سے جانبِ غرب دو میل کے فاصلہ پر میرا گاؤں تھا۔ سیالکوٹ جانے والی سڑک ہمارے گھر کے قریب سے گذرتی تھی۔ واقف کار مسافر ہمارے گھر کے قریب سڑک پر شیشم کے درختوں کی چھاؤں کے نیچے تھوڑی دیر ستاتے اور ہماری والدہ ٹھنڈے شکر کے شربت یا میٹھی لسی یا مصری کے شربت سے مسافروں کی تواضع کرتی تھیں۔ ظفروال میں ان دنوں کافی احمدیہ جماعت تھی اور بعض دفعہ مبلغین بھی اس راستہ سے گذرا کرتے تھے۔ جن کا علم میرے والد محترم کو قبل از وقت ہوجایا کرتا تھا اور میری والدہ بڑی ہی خوشی وچاہت سے ان مقدس مہمانوں کی تواضع پراٹھے، چائے، دودھ، لسّی وغیرہ سے کیا کرتی تھیں۔

دودھ ہمارے ہاں بکثرت ہوا کرتا تھا۔ اب تو نہ وہ دودھ رہے نہ مکھن نہ لسی۔ ایک دفعہ حضرت نانا جان یعنی (حضرت میر ناصر نواب صاحبؓ) نے چند احمدی احباب کے ہمراہ ہمارے گھر کو شرف بخشا۔ آپ چندہ مسجد نور، اور چندہ نور ہسپتال جمع کرنے کے لئے ظفروال جا رہے تھے۔ مَیں بالکل چھوٹا سا تھا۔ لیکن مجھے وہ وقت جو بعد دوپہر کا تھا اچھی طرح یاد ہے۔ حضرت نانا جان ہمارے دالان میں کھڑے تھے۔ جہاں مَیں نے مصافحہ کیا اور پیار بھی لیا تھا۔ میری والدہ نے حضرت کی چائے اور پراٹھے سے خاطر کی۔ وہ پراٹھے حضرت میر ناصر نواب صاحب کو بڑی دیر تک یاد رہے۔ جب بھی میرے والد صاحب کی قادیان میں حضور سے

ملاقات ہوتی چائے اور پراٹھوں کا ذکر ضرور فرماتے۔ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ان دنوں کی چائے آج کل کی کالی اور فیشنی چائے نہ ہوتی تھی بلکہ کشمیری چائے تھی۔ اب تو شاید ہی کسی کو اس کی شکل یاد ہو چہ جائیکہ اس کا خوشگوار ذائقہ۔ وہ چائے نہایت لذیذ غذائیت سے پُر اور خوشبودار مشروب ہوا کرتا تھا۔

ظفروال مڈل سکول میں پڑھنے کے لئے بہت سے لڑکے اردگرد کے گاؤں چھور، کوٹلی، ہنجلی، ٹھروو غیرہ سے آیا کرتے تھے۔ چونکہ ہمارا گھر راستہ میں پڑ رہا تھا اس لئے آتے جاتے ہمارے گھر ٹھہر جایا کرتے تھے۔ بسا اوقات رات یا دو پہر بھی گزار لیا کرتے تھے اور میری والدہ ان طالبِ علموں کی بہت محبت سے تواضع کیا کرتی تھیں۔ ان طالبِ علموں میں زیادہ تعداد ہندو لڑکوں کی ہوا کرتی تھی۔ مکرم چوہدری شاہ نواز صاحب (شاہنواز لمیٹڈ والے) چوہدری رشید احمد صاحب، چوہدری محمد اسلم صاحب وغیرہ کے لئے تو ہمارا گھر ان کا اپنا گھر تھا۔

میری والدہؓ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت دیگر افرادِ خاندان کے ہمراہ جو قریباً چالیس افراد تھے 1902ء میں کی تھی۔ 1904ء میں جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سیالکوٹ تشریف فرما ہو کر کرشن کا دعوی کیا تو میری والدہ بھی والد صاحب کے ہمراہ حضورؑ کی زیارت کے لئے سیالکوٹ تشریف لے گئیں۔

سنایا کرتی تھیں کہ حضورؑ ایک کمرہ میں ٹہلتے ٹہلتے لکھ رہے تھے۔ دونوں طرف دواتیں رکھی ہوئی تھیں اور ہر دو طرف قلم ڈبو لیا کرتے تھے۔ حضور سے دستی بیعت سیالکوٹ میں کی۔ اس وقت میرا بڑا بھائی عبدالواحد مرحوم (جو کہ بچپن میں وفات پا گیا) والدہ کی گود میں تھا۔ جس کے سر پر حضور نے شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ میری والدہ محترمہ چند مرتبہ براستہ سیالکوٹ وزیر آباد، لاہور، قادیان تشریف لے گئیں۔

نارووال ریلوے لائن بننے سے قبل ایک مرتبہ براستہ ڈیرہ بابا نانک، کلانور، بٹالہ ایک قافلہ کے ہمراہ پیدل بھی تشریف لے گئیں اور پیدل ہی واپس آئیں۔ اس سفر کی کوفت کے ساتھ جو لذت ہوا کرتی تھی وہ وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے اس زمانہ کے قافلوں کے ساتھ قادیان کا

سفر کیا ہو۔ میرے والد محترم تو اکثر پیدل ہی جایا کرتے تھے۔

مَیں نے خود اپنا سب سے پہلا سفرِ قادیان پیدل ہی طے کیا تھا۔ میرے ہمراہ چوہدری شاہ نواز صاحب اوران کے والد بزرگوار اور دیگر اہلِ قافلہ تھے۔ جو لطف مجھے اس سفر میں آیا تھا اس کے بعد مجھے کسی سفر میں نہیں آیا۔ راستہ میں جس محبت اور اخلاص سے ہمارے میزبان بھائیوں نے ہماری تواضع کی وہ مزا میری قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔

میری والدہ مرحومہؓ کے پاس عورتیں اپنے کام کاج کے سلسلہ میں اکثر آیا کرتی تھیں اور والدہ کسی نہ کسی طریق سے تبلیغِ احمدیت کیا کرتی تھیں۔ گھریلو زندگی نہایت خوشگوار تھی۔ والدہ والد صاحب کے سامنے بڑی مؤدب رہتی تھیں۔ بڑی ذہین اور زیرک عورت تھیں۔ ہر ایک اہم بات اپنی مرضی کے مطابق والد صاحب سے منوا لیا کرتی تھیں۔ نماز روزہ میں بڑی باقاعدہ تھیں۔ تہجد گزار تھیں۔ اپنے بچوں کو نماز کی عادت بچپن ہی سے سختی سے ڈالی۔ زمیندار گھروں میں عورت کی زندگی نہایت ہی مصروف ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ کام کر رہی ہوتیں اپنے بچوں کو ساتھ ساتھ پڑھاتی بھی جاتیں اور دوسری بچیوں کو بھی۔ مَیں ان کی اس صلاحیت پر آج بھی حیران ہوا کرتا ہوں کہ اس قدر مصروفیت کے دوران وہ کئی کئی بچوں کو پڑھاتی بھی رہتی تھیں۔ مرحومہ نے ستر برس کی کامیاب زندگی پائی۔ دینی لحاظ سے بھی اور دنیاوی لحاظ سے بھی۔ چندوں میں باقاعدہ تھیں۔

مرحومہ موصیہ تھیں۔ اپنی وصیت اپنی زندگی میں ہی ادا کر دی تھی۔ تحریکِ جدید میں بھی حصہ لیتی رہیں۔ تمام بچوں کی پڑھائی اور شادیاں وغیرہ ان کی زندگی میں ہی تکمیل کو پہنچ گئی تھیں۔ میرے بھائی نور احمد کے پاس کاکول میں زندگی کے آخری ایام گذارے جب کہ مَیں قادیان میں درویش تھا۔ جنازہ ربوہ کے بہشتی مقبرہ میں لایا گیا جہاں آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ حضرت صاحبزادہ میاں بشیر احمد صاحب کی تار کے ذریعہ مجھے قادیان میں اطلاع ملی۔ جہاں ہم سب درویش بھائیوں نے مرحومہ کا جنازہ غائب مسجد مبارک میں پڑھا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔۔۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ

والد محترم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد ایم سی گولبازار ربوہ

سابق درویش قادیان

ہمارے ابا جی 27 جولائی 1906ء کو بروز بدھ اپنے آبائی گاؤں بوبک متر میں پیدا ہوئے۔ بوبک ظفر وال سیالکوٹ میں واقع ہے۔ یہ ایک دور افتادہ گاؤں ہے جہاں اس زمانے میں زندگی کی واجبی سہولیات بھی نہ ہوتی تھیں۔ ارد گرد کسانوں کے گھر تھے چونکہ بھارت کی سرحد پر تھا اس لئے جنگ میں دشمن کا پہلا نشانہ بن جاتا۔ 1965ء کی جنگ میں یہاں ٹینکوں کی جنگ لڑی گئی۔

ابا جی جب دو سال کی عمر کو پہنچے تو دادا جان حضرت مہر الدین ؓ صحابی نہایت شوق سے بیٹے کو لے کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت کے لئے گئے۔ اس حوالے سے ابا جی کو حضور کی زیارت پر فخر تھا۔ آپ نے قرآن پاک گھر میں ہی پڑھا۔ نماز کی عادت پڑنا والدین کے احسانات عظیمہ میں سے ایک تھا۔ پانچ برس کے ہوئے تو ظفر وال سکول میں داخل ہوئے جو گھر سے تقریباً تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ آپ کے گاؤں میں کوئی احمدی گھر نہ تھا، ساتھ والے گاؤں میں مکرم چوہدری شاہ نواز صاحب (شیزان لمٹیڈ)، ان کے بھائی مکرم چوہدری نصیر احمد صاحب اور مکرم چوہدری اسلم صاحب رہتے تھے۔ وہ سب بھائی راستے میں ابا جی کو بھی ساتھ لیتے ہوئے سکول کا رخ کرتے۔ راستہ تین کوس تھا اور موسم کی سختیوں میں اور بھی لمبا محسوس ہوتا۔

چونکہ آپ کی والدہ پڑھی لکھی تھیں۔ علم کی قدر و قیمت پہچانتی تھیں اس لئے انہوں نے راستے کی تکالیف کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بچوں کو سکول بھجوایا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگوں کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ حسین بچپن اور بے فکری کا لڑکپن ہنستے گاتے، کبڈی کھیلتے، ڈنڈ پیلتے، بیٹھکیں نکالتے، دوڑیں لگاتے، ورزش کرتے اور والد کا ہاتھ بٹاتے گذر گیا۔ ظفر وال سکول سے آپ نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب حضرت چوہدری مہر الدین صحابی حضرت مسیح موعود علیہ

السلام چونکہ احمدیت کے لئے بہت جوش رکھتے تھے، انہوں نے بیٹے کو قادیان مزید تعلیم کے لئے بھیج دیا۔ اباجی کی عمر چھوٹی تھی وہاں کوئی دوست نہ تھا، جلد اداس ہو گئے، پھر آپ کو تین ماہ کے بعد واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد آپ کو سیالکوٹ میں ہندی ہائی سکول میں ڈال دیا گیا جہاں گاؤں کے پرانے دوست موجود تھے۔ مسلمان لڑکوں کے علاوہ مختلف قریبی گاؤں کے ہندو سکھ اور عیسائی طالب علم بھی تھے۔ یہاں رہ کر آپ نے مزید تعلیم حاصل کی۔

زمانہ تعلیم کے دوران دعا کی قبولیت کے نظارے

دادا جان کو شوق تھا کہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنا ہوا دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کی مراد بھر آئی اور پھر وہ وقت بھی آیا جب اباجی نے ملٹری میڈیکل کالج آگرہ میں داخلے کی درخواست دی۔ اس کالج میں داخلہ ملنا بھی ایک معجزے سے کم نہ تھا۔

ملٹری کالج میں داخلہ کے وقت گیارہ سو امیدوار اپنی درخواستیں لئے کھڑے تھے مگر وہاں صرف پچیس نشستیں تھیں۔ سارے ہندوستان سے ایک سے ایک بڑھ کے قابل طالب علم آئے ہوئے تھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان اور عیسائی ہر مذہب اور ہر طبقے کے طالب علم تھے۔ اباجی کالج میں داخلے کی شرائط پر پورے اترتے تھے۔

پرنسپل صاحب نے لڑکوں سے انٹرویو لینا شروع کیا۔ صرف 25 نشستیں تھیں جن کے لئے 25 طالبِ علم چُنے جانے تھے بے چارے پرنسپل صاحب بہت پریشان تھے کس کو چُنے کس کو گھر بھیجیں۔ آخر پرنسپل صاحب کو ایک ترکیب سُوجھی۔ کافی دیر کے بعد وہ باہر آئے اور یوں گویا ہوئے: ''مجھے کسی سے بیر نہیں، مَیں نے پر ماتما پر نظر رکھتے ہوئے نہایت ایمانداری سے ان 100 درخواستوں کو علیحدہ کیا ہے۔'' پھر اس اللہ کے بندے نے ان ایک سو منتخب شدہ لڑکوں کی قطار بنائی اور معذرت کرتے ہوئے کہا: ''تم سب میرے لیے برابر ہو۔ میرے لئے چناؤ نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن بھی۔ مَیں آنکھوں پر پٹی باندھ لیتا ہوں۔ جس لڑکے کو مَیں نے ہاتھ

لگا دیا اس کو پکڑ کر باہر کر دیا جائے گا وہ سمجھ لے کہ اس کو چُن لیا گیا یعنی اسے داخلہ دے دیا جائے گا۔‘‘ سوعد دلڑکوں کی اس قطار میں ابا جی بھی شامل تھے۔

ابا جی وہاں اکیلے ہی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ کم عمری تھی، نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس مشکل وقت کا حال ابا جی کی زبانی سُنیئے:

’’مَیں سخت ڈرا، ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میرے لئے نہایت مشکل وقت تھا۔ سارے مشکل مراحل سے بخوبی گذرنے کے بعد اب ایک اور انوکھی قسم کا امتحان آ پڑا۔ میں نے نہایت زاری اور درد و الحاح کے ساتھ دعا کرنی شروع کر دی۔ سورۃ الفاتحہ اور جو بھی قرآنی سورۃ آتی تھی پڑھ ڈالی۔ کچھ سُجھائی نہ دے رہا تھا۔ قطار میں ہندو، سکھ، مسلمان، اور عیسائی لڑکے کھڑے تھے۔ ہر کوئی سہما ہوا تھا، اپنے عقیدے، گیان اور مذہب کے مطابق سب دعائیں اور اپنی عبادت کر رہے تھے۔ امید و ناامیدی کی کیفیت تھی۔ یوں سمجھ لیں مَیں کشتی میں بیٹھا طوفان کی زد میں تھا۔ پھر میرے سامنے پرنسپل صاحب نے آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی اور یہ یقین کر لیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آ رہا اور پھر ہماری بنی ہوئی قطار کی طرف ٹٹول ٹٹول کر آہستہ آہستہ محتاط قدم اٹھانے لگے۔ وہ چند قدم چلنے کے بعد کسی ایک لڑکے کو دبوچ لیتے اور قطار سے الگ کر دیتے۔ میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ امید اور خوف کے ملے جلے جذبات تھے۔ میری زیرِ لب آہ و زاری کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ دل نے کہا اللہ پر حسن ظنی کرتے ہوئے مانگ۔ حدیث میں ہے کہ تیرے گمان کے مطابق تجھے ملے گا۔ مَیں اللہ تعالیٰ سے اپنی سمجھ اور توفیق کے مطابق محبت، لجاجت اور شوقِ تمنا سے دردِ دِل سے دعا کرنے لگا۔ کبھی ’’رَبِّ كُلُّ شَيْءٍ خَادِمُكَ رَبِّ فَاحْفَظْنِي وَانْصُرْنِي وَارْحَمْنِي‘‘ پڑھتا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے یہ اسم اعظم ہے۔ بے چینی بڑھی تو حضرت موسیٰ کی دعا یاد آ گئی ’’رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ‘‘ پھر درود شریف پڑھنا شروع کر دیا کیونکہ یہ قبولیت دعا کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ خوف اور دہشت سے میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ پرنسپل صاحب قریب آتے

جاتے تھے اور میرے جسم پر جیسے لرزہ طاری ہوتا جاتا تھا۔ حلق بھی خشک ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے میرے صحابی والدین کے پُرنُور چہرے پھر رہے تھے جو شوقِ تمنا اور امید کے ساتھ گھر میں میرے لئے سجدہ ریز تھے۔ چشمِ تصوّر میں مَیں ان کی گریہ وزاری کو سُن رہا تھا جنہوں نے مجھے بھی دُعا کا سلیقہ سکھایا تھا۔ اپنے رب سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے کا طریقہ بتایا تھا۔ قادر وقدیر سے اپنی بات منوانے کا راز بتایا تھا۔ اپنے والدین کی یاد نے مجھے اور بھی مضبوط کر دیا۔ جیسے میرے اندر بجلی بھر گئی اور مَیں پہلے سے زیادہ جوش سے اللہ تعالیٰ کو پُکارنے لگا ''اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ'' کا مضمون مجھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی برکت سے سمجھ آیا تھا۔ اچانک پرنسپل صاحب نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ کر مجھے باہر کھینچ لیا۔ گویا کوئی غیبی ہاتھ ہو جیسے رحمت کی برسات ہوا اور اب میں ارحم الراحمین کے فضل سے ان طالب علموں میں سے ایک تھا جن کو داخلہ مل چکا تھا، الحمدللہ۔ جب 25 لڑکوں کی تعداد پوری ہوگئی تو پرنسپل صاحب محترم عبدالرحمن صاحب نے آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ یوں ہمارے بزرگوں کی دعائیں رنگ لائیں اور مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا جو ایک معجزہ سے کم نہ تھا''

پھر میڈیکل کالج میں اباجی کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ شروع میں موٹی موٹی کتابیں دیکھ کر گھبرا گئے اور واپس جانے کو تیار ہو گئے، والد کو خط لکھ دیا اللہ تعالیٰ کا سہارا، والدین کی دعائیں، دوستوں کی پیار بھری تسلیاں، ان سب عناصر نے مل کر اباجی کے قدم مضبوط کر دیئے۔ تقریباً دو سال کے بعد ان کو تحقیق و تجسس کا شعور آ چکا تھا۔ شوق سے پڑھائی میں مشغول ہو گئے۔ آپ کو باقاعدہ ورزش کی عادت تھی۔ اباجی کا معمول تھا ہر روز صبح سویرے اٹھتے، تہجد پڑھنے کے بعد فجر کی نماز پڑھتے، قرآن پڑھتے پھر دوڑتے ہوئے کالج کے گراؤنڈ کے تین چکر کاٹتے۔ یہ فاصلہ دو میل کے قریب بن جاتا تھا۔ نہا دھو کر ناشتہ کر کے کالج چلے جاتے تھے۔ ایک عمل جو وہ ہر وقت کرتے تھے وہ ان کی زیرلب دعائیں تھیں۔ کالج باقاعدگی سے جانا، ہر روز مطالعہ کرنا، مشکل سبق دوبارہ دوستوں سے پوچھ کر پڑھنا یہی ان کی کامیابیوں کے راز تھے۔

طاعون اور ایمان کا مظاہرہ

دورانِ تعلیم جبکہ آپ میڈیکل کالج آگرہ میں تھے ہندوستان میں جزوی طور پر طاعون پھیل گئی۔ اگرچہ طاعون کی عبرت ناک تباہی سے ہر کوئی واقف تھا جو کہ دومرتبہ 1800ء میں حضرت امام مہدی کے وقت میں پھیلی تھی۔ اباجی ڈرے نہ پرواہ کی، چونکہ انگریز کا زمانہ تھا فوراً حکومت کی طرف سے احتیاطی تدبیر کے لئے علاقے میں ہر ایک کو طاعون کا ٹیکہ لگوانے کا حکم جاری ہوا اور سختی سے جائزہ لیا گیا کہ کالج میں کوئی طالبِ علم ایسا نہ رہے جس نے ٹیکہ نہ لگوایا ہو۔ ظاہری بات تھی طاعون جیسا موذی مرض جو ایک وباء تھی اور اچھوت کی بیماری تھی پھر اپنے خوفناک پَر پھیلانے کو تھی۔ ابھی کچھ ہی عرصہ گذرا تھا لاکھوں موتیں ہوئی تھیں اور شہروں کے شہر خالی ہو گئے تھے۔ اب ویسی خوفناک طاعون تو نہ تھی۔ علاقائی بیماری سمجھ لیجئے لیکن اس کا دور لمبا بھی ہوسکتا تھا اور ماضی کی طرح تباہ کن بھی ہوسکتی تھی، اس لئے حکومت محتاط تھی۔ اباجی نے ٹیکہ لگوانے اور ہر قسم کی احتیاطی تدابیر کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ہم جماعت لڑکوں نے بھی سمجھایا تمہارا دماغ چل گیا ہے کیوں اپنا مستقبل خراب کرتے ہو، جانتے بوجھتے ہوئے موت کے مُنہ میں جانا کون سی عقلمندی ہے؟ کوئی آوازہ کس رہا ہے بڑا نیک بنتا ہے کوئی کہتا ہے اسکے اندر بھگوان اتر آیا ہے، ایک طرف سے آواز آتی ہے پرماتما جی ہمارا مستقبل بتاتے جائیے۔ اباجی کو خدا پر یقین تھا اور یہ بھی صدق دل سے مانتے تھے کہ امام مہدی بھی سچے ہیں۔ اس بات پر بھی یقین تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بات پوری ہوگی اور مخلص احمدیوں کو، جو حضور کو دل و جان سے مانتے اور خدا کے اس فرستادہ پر کامل یقین رکھتے ہیں، طاعون نہیں ہوگی۔ اباجی کم عمر نوجوان طالبِ علم تھے مگر عقیدہ بہت پختہ تھا۔ انہوں نے گوارا ہی نہ کیا کہ ٹیکے لگانے والے ڈسپنسر کے پاس جائیں۔ نہایت لاپرواہی سے بیٹھے رہے جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ اردگرد کے علاقے میں چند موتیں ہوئیں تو خوف پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ کالج کا عملہ اور زیادہ محتاط ہو گیا۔ لڑکوں کی حاضری

لگا کر ان کو ٹیکہ لگا یا گیا تا کہ کوئی رہ نہ جائے ،۔ابا جی کی باری آئی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اور ان پر کامل یقین کرتے ہوئے استاد کے آگے صاف انکار کر دیا۔ بظاہر یہ استاد کی بے ادبی تھی مگر آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے حکم کا احترام تھا۔ استاد نے اوپر رپورٹ کر دی۔ ابا جی کی پیشی ہو گئی۔ پرنسپل صاحب نے بلا لیا۔لڑکے بھی چوکنا ہو گئے۔ جب آپ پرنسپل کے دفتر کی جانب جا رہے تھے تو کالج میں عجب نظارہ دیکھنے کو ملا۔آپ کے ہم جماعت زیر لب ہنس رہے تھے، پیشگی خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ ہر شاگرد پرنسپل صاحب کی عزت کرتا تھا۔ ابا جی پر بھی ان کا بہت رعب تھا۔ جب ابا جی کو بلاوہ آیا تو آپ پرنسپل صاحب کے دفتر کی طرف یوں چلے جیسے ایک فاتح جرنیل چلتا ہے۔ یہ بھی معلوم تھا کیوں بلایا ہے مگر اپنے عقیدے میں نہایت مضبوط اور بہت نڈر تھے۔آپ نے نتائج کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ ابا جی جانتے تھے کہ پرنسپل صاحب کس قسم کا مزاج رکھتے تھے۔ان کو دیکھتے ہی وہ سخت برہم ہوئے، نہایت درشتی سے بولے ''تم کالج کے اصول توڑ رہے ہو، کیا تمہیں حکم ماننے کی عادت نہیں؟ مَیں تمہیں گھر بھجوا دوں گا'' ابا جی پر پرنسپل صاحب کی اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا آپ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا:

''مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کیونکہ طاعون میرے مُرشد کی سچائی ثابت کرنے آئی ہے۔ طاعون میرے امام کی نصرت کو آئی ہے۔ان کے حق میں آسمانی نشان ہے۔میرے مُرشد نے بتایا ہے، مجھے طاعون نہیں ہوگی۔آپ جو کچھ بھی کر لیں۔مَیں ٹیکہ نہیں لگواؤں گا کیونکہ میرے مرشد نے کہا ہے کہ میری جماعت کے لوگوں کو طاعون نہیں ہوگی۔ یہ طاعون میرے لئے نہیں بلکہ آپ لوگوں کے لئے خطرناک ہوگی۔میرا اس بات پر ایمان ہے کہ مجھے طاعون نہیں ہوگی۔طاعون کی یہ بیماری میرے مُرشد کی تائید کے لئے آئی ہے۔ مجھے طاعون سے کوئی خوف نہیں۔''

پرنسپل صاحب حیدر آباد دکن کے ایک روایتی باشندے تھے، ابا جی کی یہ جرأت دیکھ کر حیران رہ گئے۔آپ کا ایمان اور خدا تعالیٰ پر یقین دیکھ کر ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پھر ٹیکہ

لگوانے کی ضد چھوڑ دی اور گھر بھجوانے کا خیال بھی جانے دیا۔ پرنسپل صاحب پر آپ کی ایمانی حالت کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ آپ کو سزا دینی بھول گئے مگر اب انہوں نے غصہ یوں نکالا کہ حکم دے دیا ''بشیر کو طاعون کے سیریس مریضوں کے وارڈ میں ڈیوٹی پر لگا دو'' ابا جی شکریہ کہہ کر سینہ تانے ہوئے پرنسپل صاحب کے دفتر سے باہر آ گئے۔ جس وارڈ میں آپ کو بھجوایا گیا وہاں ہر روز ایک یا دو جنازے اٹھتے تھے۔ آپ وہاں بغیر ڈرے اللہ کے بھروسے پر فرض ادا کرتے رہے۔ آپ کے استاد اور دوسرے طالب علم کسی حادثے کے منتظر ہی رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کیا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔ آپ کو ماننے والے طاعون سے محفوظ رہے۔ الحمدللہ۔

دعا کا ایک اور معجزہ

وقت بہت تیزی سے گذر گیا۔ میڈیکل کا آخری سال آ پہنچا۔ ابا جی کو محنت کی خوب عادت تھی۔ دل لگا کر پڑھتے تھے۔ ہر منزل اچھے نمبروں سے پار کی۔ جب آخری امتحان ہوا تو ایک پرچہ اچھا نہ کر پائے۔ اپنے والد کو لکھ بھیجا کہ مَیں ایک مضمون میں کامیاب نہیں ہوسکوں گا، 3 ماہ کے بعد اس مضمون کا دوبارہ امتحان ہوگا لہٰذا اگلے 3 ماہ کا عرصہ مجھے یہیں رہ کر تیاری کرنا ہوگی۔ والد صاحب نے جواب دیا تم جو چاہے گمان کرو، مَیں اس وقت تک دعا نہیں چھوڑوں گا جب تک نتیجہ نہیں آ جاتا۔ والدہ بھی بہت دعا گو بزرگ تھیں۔ ان کا دل اداس تھا چنانچہ دونوں ماں باپ نے خدائے رحیم و کریم کے آگے سر جھکا دیئے۔ ادھر ابا جی بھی پوری تندہی سے مطالعہ اور عبادت میں مصروف تھے۔ نتیجہ کا دن آ پہنچا۔ ابا جی کا ذہن تیار تھا کہ اس مضمون میں کامیابی نہیں ہوگی۔ استاد نے آپ کا نام پکارا، بہت تعریف کی اور کہا تم اس پرچے میں اول آئے ہو، امید ہے تم نہایت اچھے سرجن بنو گے اور مریضوں کے ساتھ تمہارا برتاؤ بہت اچھا ہوگا۔ دعا کی تاثیر کیا کیا رنگ لائی۔ اللہ کے کرم سے اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہوئے۔ کالج کا حسین دور ختم

ہوا۔ اباجی کہا کرتے تھے کہ کالج ختم کرنے کے بعد سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے جب مَیں نے اپنے دوستوں کو چھوڑا تو آگرہ سے لے کر گھر تک تمام راستہ گاڑی میں بیٹھ کر اُداسی سے روتا رہا۔

ملازمت

تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ملازمت ملنی مشکل تھی۔ کہنے کو تو انگریز راج تھا مگر معمولات زندگی میں فوقیت غیر مسلموں کی ہی تھی۔ تعلیم عام طور پر ہندوؤں میں زیادہ تھی وہ کثیر تعداد میں تھے۔ عام طور پر غیر مسلم افسر ہوتا تھا جب کوئی نوکری نکلتی تھی تو غیر مسلم لڑکے رکھ لئے جاتے تھے۔ مسلمان بے چارے انتظار کی گھڑیاں گنتے رہتے۔ آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ بیکار تھے اور معاش کی تلاش میں تھے۔ آخر کار مجبور ہو کر گھر سے بہت دور دریا خان ضلع میانوالی میں ملازمت اختیار کر لی۔ ایک سال کے بعد آپ کی شادی ماموں زاد محترمہ عائشہ بی بی سے ہو گئی جو ہماری بڑی والدہ تھیں۔ محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھیں۔

اس وقت کی تنخواہ میں اچھا گذارہ ہو جاتا تھا۔ میانوالی کے سادہ لوح لوگوں نے آپ سے بہت محبت کی۔ ڈاکٹر کا پیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دکھی انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہے اس لئے اللہ کے فضلوں سے عوام الناس سے عقیدت اور محبت خود بخود ہی ملتی ہے۔ آپ خوش مزاج تھے، ہر ایک کو دوست بنانا جانتے تھے، ہر طبقے کے ساتھ گھل مل جاتے تھے۔ دریا خان کے دو وڈیروں کے ساتھ ان کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ انہوں نے ایک خدمت گار آپ کی مستقل خدمت کے لئے بھیج رکھا تھا۔ ان کی طرف سے دودھ دینے والی بھینس بطور تحفہ اباجی کے گھر کے کھونٹے پر بندھی رہتی تھی۔ جب بھینس سوکھ جاتی، واپس بھیج دیتے تھے۔ خان جی دودھ دینے والی ایک اور بھینس بھجوا دیتے تھے۔ ان دونوں خان سرداروں کے ساتھ دوستی آپ کے چلے آنے کے بعد بھی برقرار رہی۔ ہر سال موسمِ گرما میں وہ ہمارے ہاں ربوہ میں نوکروں چاکروں سمیت آیا کرتے

تھے۔اس کے علاوہ خان صاحب آم کے موسم میں نہایت عمدہ آم کی بڑی بڑی پیٹیاں بھجوایا کرتے تھے۔ ہم بچوں کو خان چاچا کے ساتھ کوئی سروکار نہ تھا مگر قلمی اور سندھڑی آموں کا بے چینی سے انتظار کرتے۔

کھیل اور غیر نصابی سرگرمیاں

آپ کی طبیعت میں چُستی بہت زیادہ تھی۔ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ہر روز صبح شام لمبی سیر کرنے کی عادت تھی۔ ساری مروجہ کھیلیں کھیلتے۔ دوڑ میں اوّل رہتے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے دوڑ کا طریقہ پوچھا۔ تکنیک بتانے کے علاوہ مجھے سمجھایا کہ ہر میدان میں عقل اور حکمت عملی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے مجھے یوں سمجھایا کہ:

''ایک دفعہ میں دوسو گز کی دوڑ لگا رہا تھا۔ (وہ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اسوقت لمبائی کا پیمانہ گز رائج تھا) میں اور ایک اورلڑکا ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ کوئی دو تین گز کا فاصلہ باقی تھا۔ ہم دونوں کی دوڑ برابر تھی۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے دماغ میں کوندا اور میں نے منزل کے قریب پہنچ کر پوری قوت سے زوردار چھلانگ لگائی اور دھاگے کو چھولیا۔ یوں میں اوّل رہا۔''

ابا جی کی صحت نہایت اچھی تھی۔ قد بھی خوب تھا۔ جسم پھرتیلا تھا۔ طاقت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ اپنی جوانی میں جان دار ہستی تھے۔ اور سب سے بڑی بات نڈر بہت تھے۔ کبڈی میں پچھاڑنے میں ماہر تھے۔ pool walt یعنی اونچی چھلانگ جو ڈنڈا پکڑ کر لگائی جاتی ہے کے champion تھے۔ زمانۂ تعلیم کے آخری سال تک انکا ریکارڈ کوئی نہ توڑ سکا۔ بینی (کلائی) پکڑنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔

آپ غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب شوق رکھتے تھے۔ طبیعت میں بہت چُستی تھی۔ آواز خوبصورت تھی۔ جوانی میں وارث شاہ کی ہیر نہایت خوبصورت انداز سے پڑھتے تھے۔ لوک گیت اور لوک نغمے گانے کا شوق تھا۔ بنسری خوب بجا لیتے تھے۔ گھڑسواری کا بہت شوق تھا۔

شکاری کتوں کے ساتھ جنگلوں میں جا کر خرگوشوں کا شکار کرنا ان کا معمول تھا۔ بندوق کا نشانہ بھی خوب تھا۔ کبڈی مہارت سے کھیلتے تھے۔

والد اور جوان بھائی کی وفات اور انقلاب زندگی

آپ کی زندگی نہایت خوش وخرم گذر رہی تھی کہ ایک دن آپ کی والدہ کی ٹیلیگرام آئی ''والد بیمار ہیں جلد پہنچو'' جب دادا جان کی بیماری کی اطلاع ملی تو ابا جی جو کہ موسیقی کے بہت دلدادہ تھے ایک ٹیلے پر بیٹھے بانسری بجا رہے تھے۔ ابا جی نے تار پڑھی اور بانسری وہیں توڑ کر پھینک دی اور پھر کبھی بانسری کو ہاتھ نہ لگایا۔ بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور گاؤں کا رخ کیا۔ راستے کی سہولیات نہ تھیں، لمبا اور کٹھن سفر۔ بس ظفروال شہر تک جاتی تھی آگے تین میل کا پیدل راستہ تھا۔ بس سے اترے۔ ایک ہاتھ میں سامان تھا گود میں بچہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھانے لگے اور تائی اماں (ہماری بڑی والدہ جو تائی اماں کے نام سے جانی جاتی تھیں) سے بہت آگے نکل گئے۔ راستے میں پگڈنڈی پر گاؤں سے آنے والی ایک خاتون نے تائی اماں کو بتا دیا کہ تمہارے گھر میں موت کا ڈیرہ ہے۔ یہ خبر سن کر ان کی جسم سے جان نکل گئی۔ غم سے قدم بھاری ہو گئے۔ بار بار ابا جی رک رک کر کہتے ''تیز چلو۔ تیز چلو'' وہ ابا جی کو بُری خبر سنانے کا حوصلہ نہ رکھتیں تھیں۔ جوں جوں گھر قریب آتا جاتا ابا جی کی تیزی میں اضافہ ہوتا گیا اور یوں گھر تک فاصلہ کم ہوتا گیا اب دروازہ سامنے تھا۔ آپ نہایت جوش سے آگے بڑھے اور دھڑام سے دروازہ کھول کر دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ دالان کی طرف بڑھے جہاں عام طور پر دادا جان کی چارپائی ہوتی تھی۔ چارپائی خالی پڑی تھی سب کچھ سمجھ گئے۔ نہایت عُجلت سے دوسرا سوال کیا: کیا نذیر احمد آ گیا تھا؟ کیا وہ والد صاحب کو قادیان لے گیا؟ چونکہ دادا جان موصی تھے اس لئے ان کو قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفنایا جانا تھا۔ سب خاموش تھے۔ کسی میں بھی آپ کے سوالوں کا جواب دینے کی ہمت نہ تھی۔ ابا جی کبھی ایک کو دیکھتے کبھی دوسرے کو۔ گھر میں غم کا پہاڑ ٹوٹا ہوا تھا۔ سناٹا ہی

سناٹا تھا پھر دادی جان اُٹھیں بیٹے کی بلائیں لیں، پیار کیا صبر کی تلقین کی۔اس کے بعد آپ کے آگے قادیان سے آئی ہوئی ٹیلیگرام رکھ دی گئی۔آپ والد کی بیماری کی خبر سُن کر گھر سے چلے تھے مگر یہاں والد اور بیس سالہ جوان بھائی کی دردناک موتوں نے آپ کا سواگت کیا۔ابا جی نے والدہ اور بہن بھائیوں کو تسلی دی۔کوئی لفظ بے صبری کا نہ کہا۔گاؤں میں موت پر بین ڈالنے کا رواج تھا۔لوگ منتظر تھے ابا جی کی آمد کی خبر سُن کر سارا گاؤں اُمڈ آیا تھا مگر دادا جان کے گھر میں علم کی روشنی بھی تھی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت میں شامل ہونے کے بعد بدعات سے پرہیز بھی۔یہاں جاہلیت کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔ہاں بس اتنا ضرور تھا کہ کچھ دیر کے بعد ابا جی چھت پر چلے گئے اور دیوانوں کی طرح تیز تیز چکر کاٹتے رہے۔یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔رات گہری ہوتی گئی ایک ایک کر کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانا شروع ہو گئے۔اور رات بھیگتی رہی۔غموں اور اداسیوں کا عجب سورج طلوع ہوا۔

نوٹ:۔آپ کے چھوٹے بھائی نذیر احمد صاحب جو واقفِ زندگی تھے اور قادیان میں دفتر تحریکِ جدید میں کام کرتے تھے۔جب ان کو والد کی بیماری کی اطلاع ملی تو سائیکل پر گھر کو چل پڑے۔وڈالہ کے قریب گھڑسواروں نے روند ڈالا۔ان کو ایک احمدی محترم فتح محمد صاحب نے دیکھ لیا۔محترم نذیر احمد صاحب کو ہسپتال لے جایا گیا مگر آپ جانبر نہ ہو سکے۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔یوں تحریک جدید کا پہلا شہید جس نے باغ احمد میں پہلا پھول کھلایا تھا، ایک نئی تاریخ کی بنیاد رکھتے ہوئے چل بسا۔

محترم فتح محمد صاحب نے بتایا کہ ''مَیں نے اس نوجوان کو قادیان کی گلیوں میں دیکھا تھا'' یہ صاحب ہماری دادی کے گھر کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئے۔ورنہ گاؤں کے لوگ محترم نذیر احمد شہید کو اجنبی مسافر سمجھ کر شاید بے گور و کفن مٹی کے سپرد کر دیتے اور کسی قبرستان میں ایک اجنبی مسافر کی بے نام کتبے والی قبر کا اضافہ ہو جاتا یا پھر ہندو سمجھ کر ارتھی جلائی جاتی ہڈیاں توڑی جاتیں اور راکھ گنگا میں بہا دی جاتی۔گھر والوں کے لئے میرے چچا کی گمشدگی حیران کن مُعمّہ بن جاتی

(اللہ تعالیٰ فتح محمد صاحب اوران کی نسلوں پر اپنے فضل ورحمت کی بارش نازل فرمائے)

قادیان کی جماعت نے دادی جان کے گھر چچا جان کی وفات کی اطلاع بذریعہ ٹیلیگرام بھیجی۔ اب آبائی گاؤں بوبک کے ڈاکخانہ والوں کا حال سنئے۔انہوں نے تار روک لیا۔ان کا مقصد تھا کہ گھر والے دادا جان کی آخری رسومات سے فارغ ہو جائیں پھر ان کو ان کے جوان بیٹے کی موت کی خبر دی جائے۔ڈاکخانہ کا عملہ غیر احمدی تھا،بہشتی مقبرہ کی اہمیت نہ جانتا تھا۔وہ حیران تھے کہ جنازے میں دیر کیوں ہو رہی تھی؟ تدفین کی رسومات کیوں نہیں ادا کی گئیں؟ کافی انتظار کے بعد انہوں نے پوچھا تو ان کو پتہ چلا کہ گھر میں آپ کے بیٹے نذیر احمد صاحب کا انتظار ہو رہا تھا تو ڈاکخانہ والوں نے آخر کار مجبوراً چچا نذیر احمد کی وفات کی ٹیلیگرام دے دی۔ایک وفات کا سانحہ کیا کم تھا کہ دوسری قیامت بھی ٹوٹ پڑی۔

دادا جان کو امانت کے طور پر گاؤں میں ہی دفن کر دیا گیا اور دوسرے چچاؤں سمیت عزیز و اقارب قادیان پہنچے۔افسوس ہمارے چچا نذیر کو بھی قادیان میں بہشتی مقبرہ میں دفنایا جا چکا تھا۔ اقرباء میں سے کوئی بھی ان کے جنازے میں شامل نہ ہوا۔

اس سانحے کے بعد اباجی کی زندگی یکسر بدل گئی۔والد کی وفات کے بعد زمین کی کاشت اور آمد بند ہو گئی۔بہن بھائی بھی کمسن تھے۔اب ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر تھی۔اپنے بچے بھی تھے۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حسب توفیق والدہ اور تمام بہن بھائیوں کی مدد کی اور ان کی ذمّہ داریاں ادا کرنے کی توفیق پائی،الحمدللہ۔

آپ نے ضلع میانوالی میں بطور میڈیکل آفیسر 8 برس ملازمت کی۔

جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔آپ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے اور ملک سے باہر برما کے محاذ پر بھیج دیئے گئے۔آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھے۔

فوجی خدمات و اعزاز

جنگ عظیم دوئم جو کہ 1939ء میں زوروں پر تھی اب مزید پھیلتی جا رہی تھی۔ ابا جی نے بتراسی کیمپ صوبہ سرحد اور صبیلی پور جنوبی ہند میں جنگ کے لئے تربیت حاصل کی۔ 1942ء میں آپ کو بلاوہ آ گیا۔مگر پچھلی ملا زمت پر lesion قائم رہا اور بطور ڈاکٹر بھرتی ہو گئے۔ پنجاب رجمنٹ 4/14 میں تقرری ہوئی۔ دوسرے سال ترقی کر کے کیپٹن بن گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل شامل حال تھا۔ تیسرے سال یعنی تقریباً جنگ عظیم دوئم کے خاتمے سے صرف ایک سال قبل ان کو Far East Asian command یعنی برما سے آگے جو جنگلات Thai Land تک جاتے ہیں وہاں محاز پر بھیجا گیا۔ یہاں جاپانیوں کے خلاف صف آرائی تھی۔ یہیں ابا جی کی قسمت کا ستارہ چمکا اور آپ خیر الراحمین کے فضل و کرم سے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے Military cross کے تمغہ سے نوازے گئے۔

دراصل ابا جی کا کام جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کرنا تھا اور فوجیوں کے لئے صاف پانی کا انتظام کرنا اور حفظان صحت کے باقی اصولوں پر خاطر خواہ عمل کروانا ہوتا تھا۔ جب فوج کسی مقررہ جگہ پر پڑاؤ ڈالتی تو کچھ گھنٹے پہلے ابا جی کو بھیجا جاتا تا کہ وہ انتظامات کروا سکیں۔ میلوں کا سفر ہوتا جو پیدل کیا جاتا۔

ایک دن جاپانیوں نے شدید حملہ کر دیا۔حملہ اتنا اچانک تھا کہ ان کی رجمنٹ کے جوان پسپا ہو گئے۔ ابا جی زخمیوں کے خیمہ سے نکلے اور دیوانہ وار بھاگتے ہوئے مورچے میں پہنچے اور گولے داغنے شروع کر دئے۔ مورچے پر کوئی بھی نہ رہا آپ اکیلے ہی ڈٹے رہے۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ ”اس وقت مَیں درود شریف پڑھتا جاتا تھا اور خدا تعالیٰ سے دعائیں کرتا جاتا تھا۔ اور نہایت سرعت اور جوش کے ساتھ دشمن پر گولے پھینکتا جاتا تھا۔ مجھ اکیلے میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی۔ میرے چاروں طرف گولے ہی گولے پھٹ رہے تھے۔ آگ اور دھواں

جنگل میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے مگر میں فرشتوں کے پَروں تلے محفوظ کھڑا اپنا فرض سرانجام دے رہا تھا آخر کار مَیں اپنے ہسپتال کو بچانے میں کامیاب ہوگیا۔'' میرے افسر نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''میں تمھارے سینے پر میڈل دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اور یوں جنگ میں بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرنے والے غازیوں کا انعام ''ملٹری کراس'' آپ کو ملا۔ فالحمدللہ علی ذالک۔

انگریز قانون کے مطابق اعزاز پانے والوں کو اراضی ملا کرتی تھی اس کے لئے انگریزوں نے خاص طور پر زرخیز زمینیں چنی ہوئی تھیں۔ بہترین گاؤں بنائے گئے تھے۔ چنانچہ ابا جی کو ایک نہایت خوبصورت گاؤں دسوھہ ضلع فیصل آباد میں زرعی اراضی عطا کی گئی تھی۔ 1946ء کو کامیاب و کامران صحیح سلامت گھر واپس آ گئے الحمدللہ۔ دوبارہ ملازمت کے لئے درخواست دے دی۔ سیالکوٹ چونکہ اپنا وطن تھا وہیں رہنا چاہتے تھے۔

جنگ کے دوران ملائکہ کی حفاظت

جنگ عظیم دوئم زوروں پر تھی۔ فوجیوں کی زندگی جنگ میں بہت ارزاں ہوتی ہے لیکن جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے؟ ایسا ہی ایک واقعہ ہماری بہن امۃ الآخر نے مجھے لکھا ہے:

جنگ کا زمانہ تھا۔ ابا جی محاذ پر تھے۔ امی ہندوستان میں گریہ وزاری میں وقت کاٹتی تھیں۔ صدقات بھی کثرت سے دیا کرتی تھیں۔ ایک دن ہوا یوں کہ پانچ فوجی افسر جن میں ہمارے ابا جی بھی شامل تھے جیپ میں اکٹھے کسی محاذ پر بھیجے گئے۔ نہایت دشوار گذار پہاڑی رستہ تھا۔ بل کھاتے ہوئے اجنبی راستے کا تعین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ گھنے جنگل میں رکاوٹیں اور خطرات کو جاننا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اچانک دو پہاڑوں کے درمیان خلاء آ گیا۔ نیچے گہری کھائی تھی۔ جیپ کی رفتار بہت تیز تھی۔ ڈرائیور گاڑی کو روک نہ سکتا تھا۔ موت سامنے ناچ رہی تھی۔ جیپ نے فضا میں چھلانگ لگائی اور دوسرے پہاڑ تک پہنچ گئی۔ پلک جھپکتے میں موت کا ساز زندگی میں تبدیل ہوگیا۔ پانچوں مسافروں کے لئے بھی یہ واقعہ کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر

دیکھ رہے تھے کیا واقعی ہم بچ نکلے؟ ہمارے والدین کی دعائیں سنی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہر گام شامل حال رہا، الحمدللہ۔

ابا جی کو نماز کی عادت بچپن سے ہی تھی۔ یہ ان کے والدین کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان تھا۔ ہر نماز وقت پر قائم کیا کرتے۔ محاذ پر ایک مرتبہ آپ اپنے ایک سکھ دوست کے ساتھ ایک ہی بستر پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ اس دوست کے ساتھ آپ کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ اکثر اکٹھے رہتے اور گپوں کا دور چلا کرتا۔ ابھی دونوں بیٹھے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ نمازِ عصر کا وقت ہو گیا۔ ابا جی وضو کرنے کے لئے اور نماز کی ادائیگی کے لئے اٹھ کر کچھ دور چلے گئے۔ اتنے میں دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ ابا جی نے مڑ کر دیکھا۔ عین اس جگہ جہاں دونوں دوست بیٹھے ہوئے تھے گولہ پھٹا مٹی اور دھوئیں کے غبار میں آپ کے سکھ دوست کے جسم کے ٹکڑے بھی اڑتے دکھائی دیئے۔ اس دن نماز کی برکت سے آپ کی جان بچ گئی۔ الحمدللہ۔ ابا جی کو اس ساتھی کے ساتھ بہت محبت تھی آپ اس کا ذکر بہت یاس و حسرت سے کیا کرتے۔ جب بھی اس کا حال سُناتے، اداس ہو جاتے۔

جنگ عظیم دوئم میں آپ برما کے محاذ پر تھے۔ بے تحاشا گولہ باری ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ ایک مرتبہ ابا جی کی چھاؤنی پر حملہ ہوا۔ آپ اپنے مورچے سے اٹھ کر باہر گئے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک گولہ عین آپ کی خندق پر گرا۔ آپ نے اپنے آپ کو زمین پر گرا لیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو آپ کے بستر کی دھجیاں فضا میں اڑتی دکھائی دیں۔ اسی جگہ پر چند لمحے پہلے آپ خود موجود تھے۔

برما کے محاذ کا ہی ایک اور واقعہ ہے جب آپ کی بٹالین کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ آپ نے اپنا بستر لپیٹا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مادہ سانپ ہے جس نے بستر کے نیچے بچے دے رکھے ہیں اور نہ جانے کب سے رہائش پذیر ہے۔ ابا جی نے اس کو کہا تم نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا میں بھی تمہیں کچھ نہ کہوں گا اور خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔

1945ء میں جنگ کے خاتمہ کا اعلان ہوا تو فوجوں کو آہستہ آہستہ سرحدوں سے واپس بُلا لیا گیا اور سپاہیوں کو گھروں میں واپس بھجوا دیا گیا۔ جنگ کی ہولناکیوں کے بعد زندگی معمول پر آ گئی اور یوں ابا جی نے وطن واپس آ کر نئی زندگی شروع کرنے کی ٹھانی۔

خدا کی خاطر قربانی

ہماری امی بیان کرتی ہیں کہ جب ہم دونوں 1946ء کے جلسہ سالانہ پر قادیان گئے جلسہ کے آخری دن رات کے وقت آپ کے ابا جان کے دل میں ایک سکیم آئی۔ انہوں نے چند منٹ میں اپنے خیالات کا اظہار صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ہمیں افریقہ میں ہسپتال کھولنے چاہئیں جو خدمت خلق کے علاوہ دعوت الی اللہ کی غرض کو بھی پورا کریں گے اور اپنے خط میں عیسائیوں کی طبّی مساعی کی مثالیں بھی دیں۔ نیز اس خط میں آپ نے اپنے آپ کو اس کارخیر کے لئے پیش کیا۔ یعنی حضور کی خدمت میں وقف کی درخواست پیش کر دی۔ تحریر مکمل کرنے کے بعد مجھے وہ تحریر دکھائی۔ میں نے کہا سوچ لیں۔ دعائیں کر لیں۔ دو بیویاں ڈھیروں بچے اس کے علاوہ دوسری ذمّہ داریاں، کیسے کام چلے گا۔ ہنس کر فرمانے لگے ”دانے تو خدا نے دے دیئے اوپر کا خرچ بھی اللہ تعالیٰ پورا کرے گا بہت دنیا کما لی ہے اب دین کی فکر کرنی چاہیئے۔“ صرف یہی نہیں ڈاکٹر صاحب نے حضور کو خط میں لکھا کہ ”ہمیں وقف عارضی کرنا چاہیئے اور اس کارخیر کے لئے مَیں سب سے پہلے افریقہ کے لئے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔“

پھر امی جان ابا جی کی عرضی لے کر حضور کے پاس پہنچیں۔ حضور نے درخواست پڑھ کر فرمایا۔ ”ڈاکٹر کو کہنا وقف میں بہت تکلیفیں ہوتی ہیں۔ بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہ اعلیٰ جگہ پر فائز رہا ہے“۔ تاہم افریقہ کے ممالک میں وقف عارضی کی تجویز کو حضور نے بہت پسند فرمایا مگر اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ ابا جی اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے درمیان خدا تعالیٰ گواہ

ہے کہ انہوں نے وقف عارضی کی تحریک کی۔ اگرچہ اس وقت فوراً یہ تحریک نہ چلی۔ (مَیں سمجھتی ہوں کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث کے مطابق جو کوئی اچھی تحریک کرتا ہے اور جب تک وہ تحریک جاری رہتی ہے اور نیکی کا عمل جاری رہتا ہے تحریک کرنے والے کو اس کا ثواب ملتا رہتا ہے) ہمارے ابا جی کو اس تحریک میں حصہ ملتا رہے گا انشاء اللہ۔ اور پھر قادیان کے جلسہ سے واپس اپنے گاؤں بوبک مترآ گئے۔

1947ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ جنوری کا آخری ہفتہ تھا۔ ایک دن ابا جی کو حضور کا خط ملا۔ حضور آپ کو کشمیر بھجوانا چاہتے تھے یعنی حضور نے آپ کا وقف قبول کر لیا تھا۔ ابا جی کی زندگی کا نیا سفر تھا، اک انوکھا باب تھا جس کو کھولنے چلے تھے۔ چاہتے تو پاکستان کے کسی بھی بڑے شہر میں کلینک کھول سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہاتھ میں شِفا بھی بہت تھی۔ جہاں جاتے عقیدت مند، محبت کرنے والی دُکھی انسانیت کا گروہ تیار ہو جاتا۔ مگر آپ نے دنیا جہان کی نعمتوں کو ٹھکرا کر خدا کے رستے کا قصد کیا۔ اس وقت آپ کو اپنے بیوی بچوں کے علاوہ کئی دوسرے اقرباء کی کفالت کی ذمہ داری بھی ادا کرنا تھی۔ ایسے وقت میں زندگی وقف کرنا بہت بڑا مجاہدہ تھا۔ ملٹری کی طرف سے تقریباً 9 سو روپیہ تنخواہ تھی۔ دوسری سہولیات اس کے علاوہ تھیں مگر جب وقف کیا تو صرف 50 روپیہ مشاہرہ ملا جو بعد میں 150 روپیہ ہو گیا۔

ابا جی محاذ سے لوٹے تو نوکری کے سلسلہ میں ان کا تبادلہ دور دراز علاقوں میں ہو جانے کی توقع تھی۔ اس لئے انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی اور سول سروس کا ارادہ کیا۔ کیونکہ گورنمنٹ تو ایک ہی تھی۔ قانون یہ تھا جو ملٹری کو چھوڑ کر گورنمنٹ سروس میں آتا تھا اس کو ریٹائر ہونے کے بعد پینشن اور gratuity دونوں اکٹھی مل جایا کرتی تھیں۔ ابا جی کا بھی یہی ارادہ تھا ریٹائرمنٹ لے کر آپ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے ملاقات کرنے کے لئے گئے۔ اور حضور کو اپنے مستقبل کی پلاننگ کے بارے میں بتایا۔ حضورؓ نے فرمایا:

”کہیں اور نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے اپنا فضلِ عمر ہسپتال جو بن رہا

ہے آپ وہاں کام کریں گے۔ مگر جلد ہی حضور کی طرف سے آپ کو کشمیر بھجوا دیا گیا۔''

سفر کشمیر اور وادی میں سکونت

حضورؓ کی طرف سے حکم نامہ آ گیا تھا کہ ''سرینگر کشمیر جاؤ۔ وہاں جا کر اپنا کلینک کھولو۔ اپنی گرہ سے روپیہ لگاؤ آمدن میں سے نصف اپنے ذاتی خرچ کے لئے رکھو اور باقی نصف انجمن احمدیہ کو بھیج دو۔ اس آمدنی کے علاوہ واقفین کا مشاہرہ یعنی 125 روپیہ ماہوار الگ ملتا رہے گا'' آپ کو وہاں بھجوانے کا مقصد بہائیت کے مذہب کا مقابلہ کرنا تھا۔ نیز بہائیت کے مقابلہ کی ایک ماہ کی ٹریننگ کے لئے آپ کو قادیان رہنے کا حکم ہوا۔ حضورؓ کی طرف سے یہ بھی ہدایت تھی کہ افسران سے رابطہ قائم کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کا پتہ معلوم کیا جائے۔

چنانچہ آپ قادیان سے تربیت لے کر حسب حکم 31 مارچ 1947 کو کشمیر سرینگر پہنچ گئے۔ ہری سنگھ ہائی سٹریٹ میں گھر لے لیا اور 10 ٹینکی کدل میں شفا خانہ کھول لیا۔ نیا کام، اجنبی شہر، غریب خلقت اور وسائل کی کمی کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خاص فضل اور ابا جی کی محنت کے باعث پہلے ماہ کی آمد 900 روپیہ تھی۔ چنانچہ آپ نے 450 روپیہ قادیان حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں بھیج دیا اور باقی گھر کے اخراجات کے لئے رکھ لئے۔ آپ بہت خوش تھے۔ فرماتے اب مجھے فکر نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک روپیہ دے گا تو اٹھنی خدا تعالیٰ کی ہو گی۔ یونہی خدمتِ دین کا موقعہ ملے گا۔ حضورؓ نے روپیہ وصول کرنے کے بعد فرمایا ''اب انجمن کو روپیہ نہ بھیجا جائے انجمن کا حصہ بھی کلینک میں ڈالا جائے اور کلینک کو بڑھایا جائے نیز مزید دوائیاں خریدی جائیں۔''

جماعت کا مقصد شفا خانہ کو ترقی دینا تھا۔ اور کلینک کے ذریعہ خدمت دین اور خدمت خلق کرنا تھا۔ سب سے اہم بات کشمیریوں کی مدد کرنا تھا۔ تھوڑی سی ہی مدت میں ابا جی کی دور و نزدیک شہرت ہو گئی۔ مریضوں کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ قریبی قصبوں اور دیہاتوں سے بھی لوگ

آنے لگے۔مگر بدنصیبی، بلوے شروع ہوگئے سارے ملک میں خون خرابہ اور خانہ جنگی کا سماں بندھ گیا۔پھر پانچویں ماہ پاکستان بن گیا۔اب ان کو پاکستان آنا ہی تھا۔میری باجی فاخرہ اہلیہ مرزا سعید صاحب کشمیر کی پیدائش ہیں۔وہ صرف 20 روز کی تھیں جب سارے کنبے کو کشمیر سے ہجرت کرنا پڑی۔ اباجی اللہ کے فضل و کرم سے بحفاظت پاکستان میں داخل ہوئے اور بیوی بچوں کو بوبک گاؤں چھوڑ کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔حضورؓ نے فرمایا''دوبارہ کشمیر چلے جاؤ۔''اب حالات مخدوش تھے۔پہلے کی طرح آزادی سے سفر نہ کر سکتے تھے۔راستہ پُرخطر ہوگیا تھا۔کوہ مری کے راستہ دوبارہ کشمیر پہنچ گئے۔

کشمیر سے واپسی

اس پرآشوب وقت میں خطرات ہی خطرات تھے۔کوئی سمجھ نہ آتی تھی کون دوست ہے کون دُشمن۔جاسوسوں نے اپنا جال پھیلا رکھا تھا وہ اباجی کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔پولیس چوکی بھی کلینک کے ساتھ ہی تھی۔پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ آپ کی گرفتاری کا حکم نامہ آ پہنچا اس وقت جو تھانیدار متعین تھا ایک نیک بخت سید مسلمان تھا جو اباجی کے ساتھ بہت ہمدردی رکھتا تھا اوران کی عزت بھی بہت کرتا تھا۔اس تھانیدار نے اباجی کی حمایت میں رپورٹ لکھ کر بھیج دی اوراس بارے میں اباجی کو بھی آگاہ کر دیا۔چار مرتبہ یہ شریف النفس اور ہمدرد پولیس افسر یونہی کرتا رہا۔پانچویں مرتبہ وارنٹ آئے تو اس تھانیدار کو بھی سخت سرزنش ہوئی۔وہ اسی وقت گھبرایا ہوا اباجی کے پاس آیا اور نہایت راز داری سے کہا کہ فوراً یہاں سے نکل جائیں۔اللہ تعالیٰ اس فرشتہ سیرت انسان کو اپنی رحمتوں کی چادر میں ڈھانپ لے۔جو احسان اس نے ہمارے والد صاحب پر کیا اللہ تعالیٰ اسے اس کا اجر عظیم دے۔

اباجی کو ایک طرف جان کا خطرہ تھا۔دوسری طرف یہ بھی احساس تھا کہ زندگی وقف کر چکے تھے۔حضور کی اجازت کے بغیر کیسے یہ جگہ چھوڑ دیتے۔چنانچہ حضور کو اطلاع کی گئی۔محترم خواجہ

غلام نبی گلکار کے ذریعہ حضور کی خدمت میں درخواست کی گئی اور صورت حال بتائی گئی۔حضور کی طرف سے فوراً اجازت مل گئی۔اباجی کے ساتھ پانچ احباب اور بھی تھے جو سرینگر سے باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔عجب کشمکش تھی کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔سب اپنے رب کے حضور دعائیں کر رہے تھے۔یاالٰہی تو ہی ہم کمزوروں کی رہنمائی فرما اور اس مشکل سے نکال لے۔اس مصیبت کی گھڑی میں کیا کِیا جائے اس مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ کو یہ نظّارہ دکھایا کہ حضور اقدس حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ حویلیاں کی پہاڑی پر کھڑے ہیں اور بلند آواز سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں۔’’اس طرف سے آجاؤ‘‘ یہ اشارہ بھی خوب رہنمائی تھا۔اللہ تعالیٰ پر حسن ظنی کرتے ہوئے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔چند گھنٹوں میں خاموشی اور راز داری سے کلینک سمیٹا۔گھر کا سامان محترم سید سردار احمد صاحب کے گھر ڈالا۔خیال یہ تھا کہ دوبارہ اسی شہر میں آکر آباد ہوں گے۔فسادات کی فضا صاف ہو جائے گی تو پھر آنا ہوگا۔تیاری مکمل کی۔گرم لباس پہنا اور سرزمین کشمیر کو خدا حافظ کہتے ہوئے دوسرے پانچ احباب کی معیت میں ٹانگے پر سوار ہو کر حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے دن کے پچھلے پہر چل پڑے۔دن ہی دن میں نکل جانا چاہتے تھے تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ رات کو نکلنا اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ہر طرف پہرہ تھا۔سرحد پار کرنا بہت کٹھن مرحلہ تھا۔

روشنی میں سفر پر جانے والوں پر زیادہ شک نہیں کیا جاتا کیونکہ جرائم کا اندھیرے کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے۔عقل مندی یہی تھی کہ ابھی اجالا ہو اور وہ نکل جائیں۔قدم قدم پر سپاہی پہرہ پر کھڑے تھے۔سرینگر سے باہر نکلنے کی پابندی تھی۔جگہ جگہ روکاوٹیں تھیں۔سنتری آواز دے کر پوچھتا کون ہے؟ ٹانگے والا کمال ہوشیاری سے جواب دیتا۔ڈاکٹر بشیر صاحب جارہے ہیں۔ان کو مریض دیکھنا ہے۔ڈاکٹر کا نام سن کر وہ مزید تفتیش نہ کرتے اور اتنا بھی نہ پوچھتے کہ ساتھ والے دوسرے سوار کون کون سے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان سپاہیوں کی آنکھوں اور دلوں پر پردہ ڈال دیا۔اور نہایت کڑے پہروں میں سے ان سب کو بحفاظت نکال دیا۔ٹانگے والے نے سرحد پار

کروادی۔اب ٹانگے والا آگے نہیں جا سکتا تھا۔ پہاڑ کی بلندی تھی۔وہ اپنا معقول معاوضہ لے کر واپس لوٹ گیا۔اور یہ مختصر سا قافلہ شام کے اندھیرے میں چڑھائیاں چڑھنے لگا۔اب اس جگہ کسی سواری گدھا یا خچر کا بھی امکان نہ تھا۔بس اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے ہمت اور استقامت ہی کے بل بوتے پر چلے جا رہے تھے۔ٹھنڈا موسم، یخ ہواؤں کے جھکڑ، سردی اور برف باری ان سب عناصر نے مل کر ان کے سفر کو اور بھی مشکل بنا دیا تھا۔کئی مرتبہ لوگوں کی ہمت ٹوٹی مگر ابا جی جن کا عزم بہت جواں تھا ٹھہرنے کو بھی نہ مانتے تھے۔باقی لوگ تھک کر ٹھہر گئے مگر ابا جی تھوڑا استا کر آگے سفر جاری رکھتے اور مسلسل چلتے رہے آخر کار برفوں پر سے پھسلتے ہوئے 18 دسمبر کی صبح کولا ہور پہنچ کر سیدھے اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ اس وقت ناشتہ کر رہے تھے۔ان کو ابا جی کے آنے کی اطلاع ملی تو تیزی میں جوتی بھی نہ پہنی اور ننگے پاؤں اس حالت میں باہر بھاگتے ہوئے آئے۔کشمیر کا محاذ ان کے لئے کتنا اہم تھا؟اس کا اندازہ اس چھوٹی سی بات سے لگایا جا سکتا ہے۔حضور نے کشمیر کے حالات دریافت کئے۔ابا جی نے بتایا کہ قبائلی نہ صرف کشمیر میں داخل ہو چکے تھے بلکہ گلبرگ تک قابض ہو گئے تھے۔حضور نے بے ساختہ پڑھا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن ''ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں'' پھر آپ نے فرمایا ''گھر جا کر بیوی بچوں کو مل آؤ۔ میں تمہیں قادیان بھجوانا چاہتا ہوں'' چنانچہ آپ اپنے گاؤں کو چل دیئے۔یہ 1947ء کا سال تھا۔ پاکستان اور ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔لُٹے پِٹے لوگ آباد ہونے کی کوشش کر رہے تھے جماعت کا لاہور میں عارضی قیام تھا۔پھر 28-27-26 دسمبر کو لاہور میں جلسہ سالانہ منعقد کیا گیا۔آپ نے جلسہ میں شرکت کی۔

تاریخ سری نگر

''اگرچہ احمدیت پھیل رہی تھی۔لوگ کشاں کشاں جماعت میں داخل ہو چکے تھے مگر ان کے اندر جو عجیب وغریب خیالات راسخ ہو چکے تھے وہ نہایت گمراہ کن تھے اور اسلام کی تعلیم کے خلاف

تھے۔ کشمیر میں بہائیت کا بہت زور تھا۔ بہائی مذہب سے تعلق رکھنے والے اپنی تبلیغ میں سرگرم عمل تھے اور گمراہ کن باتیں پھیلاتے پھرتے تھے۔ سرینگر کی جماعت کی تربیت کی خاص ضرورت تھی اس لئے مرکز سے اس بارہ میں کوششیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر کیپٹن بشیر احمد صاحب (ایم۔سی) حال گولبازار ربوہ بھی تقسیم سے قبل 1946ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی ہدایت کے مطابق سری نگر میں بھیجے گئے تھے۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب نے بعد ملازمت اپنے آپ کو دینی خدمات کے لئے وقف کر دیا تھا۔ آپ نے شہید گنج چوک سرینگر میں کلینک کھول کر کام شروع کیا۔ کلینک کے کام سے فارغ ہو کر آپ جماعتی تربیت میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔

سری نگر میں جماعت کے احباب بکھرے ہوئے تھے اور مسجد میں نماز باجماعت نہیں ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر بشیر صاحب احباب کے گھروں میں جا جا کر کوشش کرتے تھے کہ دوست مسجد میں نماز باجماعت ادا کیا کریں۔ پھر ہفتہ وار اجلاسوں میں تربیتی مضامین سنائے جاتے تھے۔ لجنہ اماءاللہ کے اجلاس بھی مسجد میں ہونے لگے۔ آپ کی بیوی مبارکہ قمر صاحبہ لجنہ کی صدر تھیں اور امۃ المھدی صاحبہ اہلیہ ڈاکٹر بشیر محمود صاحب سیکرٹری لجنہ مقرر ہوئی تھیں۔ مستورات کے اجلاسوں سے احمدی مستورات میں بھی بیداری پیدا ہوئی۔

جماعتی تنظیم کے استحکام کی یہ کوششیں ابھی جاری تھیں کہ وادی کشمیر میں فسادات اور انتشار کے آثار شروع ہو گئے۔ 14 اگست 1947ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا بیان ہے کہ میرے لئے چونکہ ان حالات میں وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ امام جماعت کی ہدایات کے مطابق میں نے اپنا اہل وعیال سرینگر سے سیالکوٹ منتقل کیا۔ انہی دنوں ایک بزرگ نے اپنی خواب بیان کی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ حویلیاں (ہزارہ) کے پاس ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر احباب کشمیر کو پکار رہے ہیں کہ ”اس طرف آجاؤ۔ اس طرف آجاؤ“۔ اس اثناء میں مجھے شام کو مہربان افسروں نے ہدایت کی کہ وہ جلد یہاں سے نکل جائیں۔ امام جماعت کی ہدایت بھی مجھے مظفر آباد پہنچنے کے بارے میں مل چکی

تھی۔ چنانچہ کلینک کا سامان چھوڑ کر مظفر آباد کی طرف روانہ ہوا۔ برف باری کے دوران راستہ میں محترم معراج محمد خان صاحب کے یہاں گذاری۔ وہاں سے مظفر آباد اور مظفر آباد سے لاہور پہنچا جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں حالات کی رپورٹ کر دی۔''

(تاریخ سری نگر، اقتباس از تاریخ احمدیت جموں وکشمیر) مصنف مکرم محمد اسد اللہ قریشی، مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ)

پُر آشوب حالات

جنگ آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہندو، سکھ اور مسلمان مل کر غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ بظاہر انگریز کی کمر ٹوٹتی نظر آتی تھی۔ چنانچہ قائداعظم نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ آزاد ملک کا مطالبہ کیا جو ہندوؤں کو قطعاً منظور نہ تھا۔ قراردادِ پاکستان اگرچہ کچھ عرصہ قبل منظور ہو چکی تھی۔ آپس میں دنگا فساد اور قتل و غارت شروع نہیں ہوا تھا مگر آہستہ آہستہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلنے لگی۔ پہلے چند واقعات ہوئے۔ پھر فساد زور پکڑ گئے اور مسلمان اپنے گھروں میں غیر محفوظ ہو گئے۔ حالات مزید خراب ہو گئے آخر قادیان بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس واقعہ کا ذکر تاریخ احمدیت میں یوں ملتا ہے:

''قادیان کے ماحول میں فساد کا پہلا واقعہ 24-25 جولائی 1947ء (وفا 1326 ہش) کی درمیانی شب کو پیش آیا۔ پچیس تیس شر پسندوں نے وڈالا گرنتھیاں اسٹیشن پر قادیان کی طرف جانے والی گاڑی کو روک کر اس پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے ڈرائیور اور پانچ چھ اشخاص زخمی ہو گئے۔ فائرمین نے نہایت ہوشیاری سے گاڑی چلا دی اور اس طرح گاڑی کو قادیان لے آنے میں کامیاب ہو گیا۔

12 اگست (ظہور) 1947ء کو قادیان میں ریل بند کر دی گئی اور ساتھ ہی ڈاک کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اور پھر جلد ہی تار کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔

17 اگست کو ریڈ کلف ایوارڈ کے فیصلہ کے مطابق قادیان کو ہندوستان یونین میں شامل کر دیا

گیا اور قادیان ''بھاری خدائی امتحان'' میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ اگلے روز ہی 18 اگست کو ضلع گورداسپور کے مسلمان دیہات پر شر پسندوں کے حملوں کا آغاز ہوا جس کے ساتھ قتل و غارت، لوٹ مار، اغوا اور آتش زنی کے بھیانک حادثات شامل تھے اور یہ سلسلہ روز بروز زیادہ وسیع اور خطرناک ہوتا گیا۔ حتی کہ بالآخر ضلع بھر کے سب مسلمان دیہات قتل و غارت کے ذریعہ خالی کرائے گئے۔ انہی ایام میں شر پسندوں نے قادیان کے اِرد گرد سب راستے بند کر دیئے اور نہروں کے پُل برباد کرنے شروع کر دیئے اور آمد و رفت پُر خطر اور مخدوش ہو گئی۔

پھر 12 اگست کو قادیان سے غربی جانب واقع احمدی گاؤں پر شر پسندوں نے حملہ کیا جس کے نتیجہ میں قریباً 50 آدمی شہید اور 39 افراد زخمی ہوئے اور لُوٹ مار کے بعد گاؤں خالی کرا لیا گیا۔

(تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ 719۔720)

23/اگست کو قادیان سے شمالی جانب احمدی گاؤں فیض اللہ چک پر ہزاروں مسلح شر پسندوں نے پولیس اور ملٹری کی موجودگی میں حملہ کیا جس سے بہت سے احمدی اور غیر احمدی شہید ہوئے اور کئی مسلمان عورتیں اغوا کر لی گئیں اور سارا گاؤں معہ ملحقہ دیہات کے خالی کرا لیا گیا اور ایک احمدی جو فیض اللہ چک کی خیریت دریافت کرنے کے لئے موٹر پر جا رہا تھا اس کے ڈرائیور کو گولی سے زخمی کر کے موٹر ضبط کر لی گئی۔ (تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ 728)

قادیان کے تعلقات حالات کے خراب ہو جانے کی وجہ سے سب طرح سے بالکل کٹ گئے تھے نہ تو قادیان کی خبر ہی باہر جا سکتی تھی اور نہ باہر کی خبر قادیان میں آ سکتی تھی۔ ان خبروں کو بھیجنے اور لانے کا واحد ذریعہ جہاز تھے جو کہ قادیان آتے اور جاتے تھے۔ ایسے حالات میں ستم گری یہ کی گئی کہ 25 اگست کو ان دونوں جہازوں کا قادیان آنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

(تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ 729)

قادیان کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ باوجود اس ظلم اور سفا کی کے جس کے ذریعہ احمدیوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد حالات بد سے بدتر

ہوتے چلے گئے۔نفرت وتعصب اس قدر بڑھا کہ مسلمانوں کی زندگی کی کوئی قیمت نہ رہی۔

اس کٹھن سفر میں تقریباً دس لاکھ مسلمان شہید ہو گئے تھے۔مگر حضور کی حکمت عملی اور مناسب کاروائیوں سے قادیان اور اردگرد سے ہزاروں نفوس خیرو عافیت سے پاکستان پہنچ گئے۔قادیان کے اردگرد فسادات کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔اُس وقت کا حال محترم بشیر احمد مہار صاحب درویش قادیان کی زبانی سنیے:

''آزادی کے اعلان سے قبل ہی ہندوستان میں فسادات بھڑک اُٹھے تھے اور آزادی کے اعلان کے بعد تو ایک طوفان برپا ہو گیا تھا۔قادیان کے گرداگرد 25 -20 میل کے سرکل میں جس قدر مسلمان آباد تھے وہ اپنے گاؤں چھوڑ کر حفاظت کی خاطر قادیان چلے آئے تھے۔قادیان میں کوئی سرکاری ریلیف کیمپ نہیں تھا۔ان ہزاروں افراد کیلئے جو پناہ کی غرض سے قادیان آگئے تھے ایک بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔اس موقعہ پر سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ نے پھر ایک بار احمدی خدام کو قادیان میں خدمت کے لئے بلایا۔قادیان آنے کے بعد کئی دیہات میں خدمتِ خلق کا کام کرتا رہا۔وہاں کے احمدی احباب کو بحفاظت قادیان لانا ہوتا تھا۔احمدیوں کے ساتھ بعض غیر احمدی بھی شامل ہو جاتے تھے۔اس وقت کوئی تمیز نہیں تھی کہ کون کیا ہے؟ دُکھی انسانیت کو راحت پہنچانا مدِّ نظر تھا۔اِردگرد کے دیہات خالی ہو گئے تو قادیان میں میری ڈیوٹی بہشتی مقبرہ میں مزارِ مبارک کے پہرہ پر لگا دی گئی۔وہاں اور بھی خدام میرے ساتھ تھے۔یہ دن بہت سخت تھے۔پتہ نہیں ہوتا تھا کہ آج دن کی شام ہمیں دیکھنا نصیب ہو گی یا نہیں اور اگر رات آجاتی تو پتہ نہ تھا کہ کل کا دن ہم پر طلوع ہو گا۔اُسی حال میں دن گذرتے تھے۔''

14 اگست 1947ء کو برصغیر تقسیم ہوا تو قادیان ہندوستان میں رہ گیا۔حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی ''داغِ ہجرت''۔جس وقت یہ پیشگوئی فرمائی گئی تھی ہندوستان کے بٹوارے کا تو کسی کو خیال تک نہ تھا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر اطلاع دی کہ قادیان سے ہماری جماعت کو ہجرت کرنا پڑے گی۔اور ایک وقت آئے گا کہ جماعت کو

قادیان چھوڑنا ہوگا گو دوسرے خدائی الہامات اور پیش خبریوں سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ قادیان کو کلی طور پر نہ چھوڑنا پڑے گا بلکہ وہ حصہ جو ''الدّار'' کے نام سے موسوم ہے یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مکانات ''اِنِّیْ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّار'' کے خدائی وعدہ کے مطابق خاص طور پر خدا کی حفاظت میں رہے گا۔ (بحوالہ۔مختصر تاریخ مرکز احمدیت)

رسالہ مشکوٰۃ اس حالت کا یوں نقشہ کھینچتا ہے:

''اس وقت شہر میں اکثر اوقات کرفیو رہتا تھا۔شہر اور بہشتی مقبرے کے درمیان تعلق منقطع ہو چکا تھا۔ پُل پر پولیس کا پہرہ ہوتا تھا کہ کوئی بھی شہر سے بہشتی مقبرہ کی طرف نہ آجا سکے۔لنگر خانہ سے کھانا لے جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔وہاں نہ ہمیں دودھ میسر تھا نہ پتی نہ گُڑ یا شکر، نہ چائے بنائی جا سکتی تھی نہ روٹی نہ سالن بس فاقہ کشی کا عالم تھا۔صرف پانی پر گذارہ تھا۔کرفیو میں وقفہ کے دوران ناصر آباد کے مکانوں سے کچھ گندم حاصل کر لی گئی تھی۔اس کی گھنگنیاں ابال کر کھا لیتے تھے۔ چند یوم بعد ناصر آباد سے ایک چکی مُیسر آ گئی۔اس کے دونوں پاٹ ہم اُٹھا کر لے گئے تھے اور پھر ان کو ایک چادر پر رکھ کر آٹا پیس لیا کرتے اور روٹی بنا کر صرف نمک سے ہی کھا لیتے۔ آہستہ آہستہ حالات سدھرنے لگے۔'' (رسالہ مشکوٰۃ۔جون 2004)

جب حالات بہت زیادہ بگڑے تو یہی فیصلہ کیا گیا کہ 313 کی تعداد ''الدّار'' کی حفاظت کے لئے یہیں رہے گی۔جماعت نے افسران بالا سے رابطہ کر کے مُسلّح فوج کے پہرے میں احمدی اور تمام غیر احمدی پناہ گزینوں کو ملٹری کے ٹرکوں میں لاد کر پاکستان بھجوا دیا۔آخری قافلہ 16 نومبر 1947ء کو روانہ ہوا۔ہر قافلہ کی روانگی کے وقت درد والحاح سے دعا کی جاتی۔مگر آج کے دن یہاں سے آخری قافلہ چلنا تھا۔آج سب کے جذبات ہی کچھ اور تھے۔جانے والے جدائی کے لئے تڑپ رہے تھے اور پیچھے رہ جانے والے تخت گاہ مسیح کی حفاظت کا اہم فریضہ ادا کرنے کے لئے اپنے سر کٹوانے کو تیار تھے۔روانگی کے وقت مولانا جلال الدین صاحب شمسؓ احبابِ قافلہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ:

''اے قادیان کی مُقدس سرزمین! تُوہمیں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے پیاری ہے لیکن حالات کے تقاضا سے ہم یہاں سے نکلنے پر مجبور ہیں اس لئے ہم تجھ پر سلامتی بھیجتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔''

اس قافلے کی روانگی کے بعد جو لوگ پیچھے رہ گئے وہی درویش بھائی کہلائے۔اسی دن سے دورِدرویشی کا آغاز ہوا۔

قادیان روانگی۔دورِدرویشی

ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔تقسیمِ ملک کا معاہدہ پُرامن طور پر طے پایا تھا مگر بعد میں فسادات بھڑک اُٹھے۔نفرت کی اس آگ میں لاکھوں افراد بھینٹ چڑھے۔1947ء کا سال آزادوطن یعنی پاکستان کوان گنت مہاجرین کی قربانی کا سندیسہ دیتے ہوئے ختم ہوگیا۔

نئے سال کا سُورج طلوع ہوا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ جماعت کوترقی دینے کے لئے ہرممکن کوشاں رہتے۔قادیان کو بچانا اور اس پر قبضہ برقرار رکھنا اس وقت کی اہم ترین ضروریات میں سے تھا۔حکومت ہندوستان سے یہ معاہدہ طے پایا تھا کہ قادیان کی حفاظت کے لئے ایک وقت میں صرف 313 جانثار ٹھہر سکیں گے اور ہر 3 ماہ کے بعد ان کا تبادلہ ہوجائے گا۔یوں مکرم ڈاکٹر قاضی محمود احمد شہید (جن کو بعد میں شقی القلب دشمن نے کوئٹہ میں نہایت بے دردی سے شہید کردیا) کی جگہ ابّاجی کو مقرر کیا گیا۔3 جنوری 1948ء کو آپ کو ایک سبزی والے ٹرک میں بٹھا کر قادیان کے لئے بھیجا گیا۔دونوں ملکوں کے درمیان ہر قسم کی ٹریفک بند تھی۔گاڑی یا بس کا تصور نہ تھا۔سبزی کا ٹرک بہت بڑی غنیمت تھا۔قادیان کے باشندوں کو خبر مل چکی تھی کہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب آرہے ہیں۔اہل قادیان بہشتی مقبرہ میں آنے والے ڈاکٹر کو خوش آمدید کہنے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔یوں محبت وعقیدت کے ساتھ آپ کا استقبال کیا گیا۔

اس وقت تک یہ قیاس تھا کہ ایک قلیل مدت تک قیام ہوگا مگر جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے تحت حکومت نے یہ اجازت منسوخ کردی۔اب جو لوگ وہاں تھے واپس نہ آسکتے تھے۔یہ خبر

ساری جماعت کے لئے تکلیف دہ تھی۔اباجی کا گھر اور کلینک سری نگر میں، بیوی بچے پاکستان میں اور آپ آقا کے حکم پر قادیان میں تھے۔حضورؓ کا فرمان کہ وقف میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے درست ثابت ہوا۔اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ ثابت قدم رہے الحمدللہ۔اس وقت 12 نفوس کی کفالت کی ذمہ داری اباجی کے کندھوں پر تھی۔قادیان کے بعض غیر مسلم باشندوں کی مخالفت مدتوں سے چلی آرہی تھی۔ان کی ہمیشہ سے کوشش تھی کہ قادیان کو خالی کروا کر اس پر قبضہ کرلیا جائے اور احمدیوں کو ہر طرح سے تنگ کر کے بھاگ جانے پر مجبور کیا جائے۔آزمائش کا یہ دور اس وقت طول پکڑ گیا جب ریڈ کلف ایکٹ کے تحت قادیان کو بھارت کا حصہ بنا دیا گیا۔مخالف طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہتے۔تقسیمِ مُلک کے عمل سے گویا ان کا خواب پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔ان کا خیال تھا اب اس علاقے میں کوئی مسلمان نہ رہے گا۔درویش جان ہتھیلی پر رکھے مسیح محمدی کے تخت گاہ کی حفاظت کے لئے کمر بستہ تھے۔

سوشل بائیکاٹ

دونوں ملک نئے نئے ٹوٹ کر بنے تھے اور دنیا پر ان کے نئے نقشے معرض وجود میں آئے تھے۔نفرت کی آگ ابھی بھڑک رہی تھی۔لاقانونیت عام تھی۔حکومتیں سنبھل نہ پائی تھیں۔خانہ جنگی اور مہاجرین کے انخلاء پر عجب داستانیں لکھی جا چکی تھیں۔بظاہر جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن سرد جنگ کی آگ مٹانے کے لئے سالوں کی مدت چاہئے تھی۔قادیان کے محدود رقبے میں اب نسبتاً امن تھا۔اگرچہ شر پسندوں نے وہاں بھی لوٹ مار مچائی مگر کم پیمانے پر۔اگرچہ قادیان کی حفاظت کی ذمہ داری ہندوستان کی حکومت نے لی تھی مگر پھر بھی حالات بہت مخدوش تھے۔ہر وقت جان کا خطرہ تھا۔اس دارالامان کی حفاظت کے لئے درویش جان ہتھیلی پر رکھ کر دن رات پہرہ دیتے۔جب دشمن نے دیکھا کہ ان کی کوئی ترکیب کامیاب نہیں ہوئی تو ان کو احمدیوں کا ناطقہ بند کرنے کی سوجھی۔قادیان کے درویش صرف اسی بستی میں محصور ہو کر رہ گئے۔ان کو باہر جانے کی یا کسی غیر کو قادیان کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔غیروں نے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

قادیان کے دروازے تو کھلے تھے مگر اندر آنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ کوئی بھولا بھٹکا راہی آنکلتا تو جوشیلے جوان اس کو روکتے۔

اس وقت کے درویش ان حالات کو یوں بیان کرتے ہیں:

''درویشان کو بعض ضرورت کی چیزیں خرید کرنے کے لئے محلہ سے باہر جانا ہوتا تھا۔ حالات کشیدہ تھے۔ بعض اوقات کسی نہ کسی کے قتل ہونے کی اطلاع بھی مِل جاتی تھی۔ جماعت نے احمد یہ چوک سے کچھ آگے بازار کی طرف ایک دفتر ''دفتر بازار'' کے نام سے قائم کیا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ جب بھی کوئی درویش محلہ سے باہر جائے وہ اپنا نام وہاں نوٹ کروائے اور جب واپس آئے تو اپنا نام کٹوادے۔ تا کہ اس بات کا علم رہے کہ جو شخص بازار گیا تھا وہ واپس آ گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض اوقات پولیس بھی کبھی شک کی بناء پر اور کبھی شرارتاً لوگوں کو پکڑ لیا کرتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ حفاظتی تدبیر اختیار کی گئی تھی۔ ایک وقت میں چار آدمی مل کر بازار جایا کرتے تھے یہ پوزیشن 1950ء تک رہی۔ (بحوالہ دورِ درویشی اور درویشان)

''سوشل بائیکاٹ کا اثر احمد یہ شفاخانہ پر بھی ہوا۔ اور شفاخانہ بائیکاٹ ختم کرنے کا باعث بھی بنا۔ اس وقت شفاخانہ میں جس قدر بھی غیر مسلم مریض داخل تھے سب چلے گئے اور غیر مسلموں کی آمد بالکل بند ہوگئی۔ اس زمانہ میں محترم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب انچارج شفاخانہ ہوا کرتے تھے (آپ نے ساڑھے سات سال تک احمد یہ شفاخانہ میں رہ کر مخلوق خدا کی خدمت کی۔ آپ کی مریضوں سے شفقت و مروت کا اثر آج تک باقی ہے۔ آج بھی کئی غیر مسلم لوگ ان کو یاد کرتے ہیں) (بحوالہ دورِ درویشی اور درویشان)

یہ شفاخانہ جس کی بنیاد میجر ڈاکٹر محمود احمد کے ہاتھوں پڑی اور جس کو ترقی دینے میں کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب نے ساڑھے سات سال محنت شاقہ سے کام لیا تھا۔ اب تک نہایت کامیابی سے چل رہا ہے اور خدمت خلق میں مصروف عمل ہے۔ (تاریخ احمدیت جلد 13 صفحہ 64 تا 67)

اس کے علاوہ احمد یہ شفاخانہ کی خدمات کا ذکر مولانا ظفر احمد صاحب کی کتاب (دورِ درویشی

اوردرویشان۔صفحہ 115-116)میں بھی تفصیل سے ملتا ہے۔

ذیل میں ایک مضمون درج کیا جاتا جوکہ 6مارچ 1998ءروزنامہ الفضل ربوہ میں ''ایک احمدیہ ہفت روزہ میں شائع ہونے والا مضمون'' کے نام سے چھپا۔اس کے علاوہ اس مضمون کا کچھ حصّہ تاریخِ احمدیت میں بھی لکھا گیا۔ یہ مضمون ہمارے والد صاحب ڈاکٹر بشیر احمد صاحب کی تحریر ہے یہ مضمون ''ماہنامہ درویش قادیان'' کے دسمبر 1951ءاور جنوری 1952ء کے شمارہ میں چھپ چُکا ہے۔

احمدیہ شفاخانہ قادیان

ازمکرم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ایم۔سی انچارج احمدیہ شفاخانہ قادیان

(ماہنامہ درویش قادیان۔دسمبر 1951ء۔جنوری 1952ء)

اکتوبر 1947ءمیں نور ہسپتال قادیان ہمارے قبضہ سے نکل گیا اور ہمارے لئے فرسٹ ایڈ تک کا سامان بھی میسر نہ تھا۔اس بےسروسامانی کے عالم میں میجر ڈاکٹر محمود احمد صاحب شہید مرحوم کچھ سامانِ ادویات فراہم کرکے درویش احباب کی طبی امداد کرتے رہے۔شروع جنوری 1948ءمیں مکرم میجر ڈاکٹر محمود احمد صاحب پاکستان تشریف لے گئے اور عاجز راقم کے سپرد درویشوں کی طبی نگرانی کا کام ہوا۔

اس وقت طبی سینٹر مکرم ڈاکٹر احسان علی صاحب والی دوکان میں قائم تھا۔اور ہماری حرکات صرف دارالمسیح کے علاقہ تک محدود تھیں۔قادیان کے باقی حصّوں میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔کوئی اِکّادُکّا غیر مُسلم دودھ سبزی فروخت کرنے کے لئے ہمارے علاقے میں آجایا کرتا تھا۔ مجھے کام سنبھالے ابھی چند یوم ہی گذرے تھے کہ غیر مسلموں کے ایک طبقہ نے عوام میں مخالفت کے جذبات بھڑکا کر ہمارا بائیکاٹ کردیا اور ہمارے تمام راستوں پر پکٹنگ لگادی گئی۔ جوبھی بھولا بھٹکا غیر مسلم ہمارے ساتھ لین دین کرتا ہوا دکھائی دیتا اس کو علاوہ دیگر سزا کے مبلغ پندرہ روپیہ

جرمانہ کیا جاتا۔ اس وجہ سے شفاخانہ میں کوئی بھی غیر مسلم نہ آتا تھا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ کے مکمل بائیکاٹ کے بعد ایک دن مَیں چند دوستوں کے ہمراہ بہشتی مقبرہ دعا کے لئے گیا۔ وہاں موضع ننگل کی ایک بڑھیا عورت آئی اور کہا کہ تم لوگ نیک ہو، اس مقدس مزار پر کھڑے ہو۔ میرا داماد سخت بیمار ہے۔ اس کی شفا کے لئے دعا کرو۔ میرے ساتھیوں نے کہا مائی ہم دعا بھی کریں گے لیکن تم اپنے داماد کو ہمارے ڈاکٹر کو دکھا کر دوا وغیرہ بھی دو۔ پکٹنگ کی مشکلات کے پیشِ نظر وہ دوسرے دن اپنے داماد کو چارپائی پر لٹا کر بہشتی مقبرہ کے گیٹ تک لے آئی۔ مَیں نے وہاں جا کر مریض کو دیکھا اور ایک درویش کے ذریعہ دوا بھجوا دی۔ دو تین روز بعد مریض کو افاقہ ہو گیا اور بُڑھیا پکٹنگ والوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میرے پاس دوکان پر آ گئی اور دو تین روز بعد اس کا داماد دو تین اور مریضوں کو ساتھ لے کر آ گیا اور چند ہی روز بعد آس پاس کے مہاجر بھی آنا شروع ہو گئے۔ پندرہ روز کے اندر اندر مریضوں کی تعداد 30-40 روزانہ تک پہنچ گئی۔ اس طرح پکٹنگ اور بائیکاٹ بالکل بیکار ہو کر رہ گیا۔ اور مریضوں کی آمد کے ساتھ ساتھ بعض غیر مسلم دودھ سبزی و دیگر ضروریات زندگی بیچنے کے لئے آنا بھی شروع ہو گئے۔

ڈاکٹر احسان علی صاحب کی دکان فسادات کے بعد بالکل خالی تھی۔ اس میں صرف ایک میز اور دو خالی الماریاں چند شیشیاں پڑی تھیں جن میں سے بعض میں بچی ہوئی ادویات تھیں۔ دو پرانے اور زنگ آلود چاقو اور دو ایک قینچی کے علاوہ کوئی دوسرا سامان نہ تھا۔ فرنیچر وغیرہ کا انتظام تو سٹور سے کر لیا گیا۔ ادویات اور دیگر سامان مہیا کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ دارالمسیح اور قرب وجوار کے مکانات میں سے جہاں سے بھی کوئی بوتل شیشی وغیرہ مہیا ہو سکی شفاخانہ میں جمع کر لی گئی۔ ان میں سے بعض کار آمد ادویات بھی مہیا ہو گئیں۔ اس اثناء میں گورنمنٹ کی چند ادویات رفیوجی فنڈ سے ہم درویشوں کو دی گئیں۔ اس عطیہ کو ہم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ غیر مسلم مریضوں کی حاضری روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور تمام دوائیں ختم ہو گئیں۔ اس موقعہ پر ایک معزز سکھ دوست کے ذریعہ مبلغ 80 روپیہ کی ادویات امرتسر سے منگوائی گئیں۔ ان حالات میں ایک سکھ دوست کا یہ بہت

بڑا کارنامہ تھا اور ہم پر احسانِ عظیم۔ اپریل، مئی 1948ء تک مریضوں کی تعداد 90 سے 100 تک روزانہ پہنچ گئی۔ ہمارے ذرائع آمد کوئی نہ تھے۔ فنڈ محدود تھا۔ اس لئے فکر پیدا ہوئی کہ اتنے مریضوں کے اخراجات کیسے پورے ہوسکیں گے۔ چنانچہ مَیں نے انجمن سے اس بات کی اجازت لی کہ غیر مسلم ذی استطاعت مریضوں سے علاج کے معاوضہ میں آنہ دو آنہ وصول کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے پاس سوڈیڑھ سو روپیہ جمع ہوگیا۔ جس سے مزید ادویہ اور سامان خریدا گیا اور اس طرح عوام کے علاج میں سہولت پیدا ہوگئی۔

ہم لوگ اپنے علاقہ سے باہر نہ جاسکتے تھے۔ جوں جوں مریض زیادہ آتے گئے، ان میں سے بعض کو دیکھنے کے لئے ان کے گھروں میں جانا پڑتا اور اس کے لئے خاص اہتمام کرنا پڑتا۔ پہلے تو چند درویشوں کی معیت میں جایا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ خطرہ دور ہوتا گیا اور پھر مَیں نے اکیلے ہی جانا شروع کر دیا۔ اس طرح قریبی گاؤں میں جانے کے لئے بغیر تانگہ اور تین چار ہمراہیوں کے جانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ یہ خطرہ بھی پھر رفتہ رفتہ دور ہوگیا اور مَیں تنہا ہی سب طرف مریض دیکھنے نکل کھڑا ہوتا۔ اور کچھ عرصہ بعد تو خدا کے فضل سے ہر جگہ دن ہو یا رات جانے میں کوئی رکاوٹ نہ رہ گئی۔ الحمدللہ۔

ماہ مئی 1948ء کے بعد شفاخانہ کی ساتھ والی دکان شامل کر کے اس کی توسیع عمل میں آئی۔ لیکن چند روز بعد جب وہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل والا مکان خالی کروالیا گیا۔ اس کی نچلی منزل میں دفتر کنسلٹیشن، ڈریسنگ، ڈسپنسنگ، آپریشن روم کے لئے علیحدہ علیحدہ کمرے بنالئے گئے۔ بالائی منزل میں دو کمروں کو درویشوں کے لئے بطور انڈور وارڈ بنالیا گیا اور باقی حصہ میں دو ڈسپینسر اور ایک مددگار کارکن کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ اس طرح اس مکان میں پہنچ کر اب صحیح رنگ میں شفاخانہ کی شکل نظر آنے لگی۔ چونکہ نور ہسپتال کا نام گورنمنٹ کے کاغذات میں بدستور نور ہسپتال ہی رہا۔ اس لئے مَیں نے اپنے شفاخانہ کا نام احمدیہ شفاخانہ رکھ لیا۔ اور دروازہ کے سامنے سائن بورڈ لگا دیا۔

شفاخانہ میں جو آمد متمول مریضوں سے ہوتی اس سے شفاخانہ کے لئے سامان وادویات خرید کرلی جاتیں اور خدا کے فضل سے ایک سال کے عرصہ میں عام استعمال کی ادویات وسامان شفاخانہ میں فراہم ہوگیا اور سوائے ابتدائی 80 روپیہ کے شفاخانہ کو مزید کسی سے امداد کی ضرورت پڑی نہ صدرانجمن احمدیہ کے خزانہ پر کوئی بوجھ ڈالا گیا۔ جوں جوں اردگرد کے علاقہ میں شفاخانہ کی شہرت پھیلتی گئی، مریض بھی بکثرت آنے لگے۔ بعض غیرمسلم دور دور سے محض اس غرض سے آتے تھے کہ قادیان میں رہنے والے مسلمانوں کو دیکھ آئیں گے اور دوا وغیرہ بھی لیتے آئیں گے۔ اور پھر تو خدا کے فضل سے آہستہ آہستہ ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ تمام ضلع گورداسپور کی مختلف جگہوں بلکہ ضلع امرتسر ہی نہیں شہر امرتسر سے بھی مریض آنے لگے۔ پہلے سال شفاخانہ نے کوئی غیرمسلم ان ڈور میں نہیں رکھا کیونکہ خطرہ تھا کہ کوئی حادثہ نہ ہوجائے۔ لیکن دوسرے سال شفاخانہ کے سامنے والا مکان، جس میں دوکمرے تھے، خالی کرالیا گیا۔ جگہ کی تنگی کے باعث ہم اس شعبہ کو ابھی تک زیادہ ترقی نہیں دے سکے۔

سال 1948ء میں آؤٹ ڈور مریضوں کی کل تعداد 31246 تھی اور ان ڈور مریض جو صرف ہمارے اپنے درویش بھائی تھے ان کی تعداد 16 تھی۔ سال 1949ء میں آؤٹ ڈور مریضوں کی تعداد 45349 تک پہنچ گئی اس سال انڈور 231 مریض تھے جن میں کثیر تعداد غیرمسلموں کی تھی۔ سال 1950ء میں 41790 مریضوں کا علاج آؤٹ ڈور کیا گیا اور 200 مریضوں کا علاج انڈور میں کیا گیا۔

1951ء کے اکتوبر تک کل تعداد آؤٹ ڈور کے مریضوں کی 28601 اور ان ڈور کی تعداد 200 افراد تھی۔ احمدیہ شفاخانہ کے قیام کے وقت میرے پاس دو صاحب بطور ڈسپنسر کام کرتے تھے۔ دو تین ماہ بعد ایک صاحب پاکستان چلے گئے۔ چونکہ کام زیادہ تھا اس لئے دو درویشوں کو ڈسپینسنگ کی ٹریننگ کے بعد شفاخانہ میں رکھ لیا گیا۔ ان میں سے ایک محمد احمد صاحب نسیم مالاباری اور دوسرے مبارک علی صاحب واقف زندگی تھے۔ مبارک علی صاحب تھوڑے ہی

عرصہ میں پوری ٹرینگ حاصل کر کے تسلی بخش کام کرنے لگے اور قریباً دس ماہ کام کرنے کے بعد مولوی فاضل کلاس میں داخل ہوکر یہ کام چھوڑ دیا۔ ان کی جگہ ایک اور درویش مکرم ملک بشیر احمد ناصر صاحب کو کام پر لگایا جو بہت جلد کام سیکھ کر شفاخانہ کے لئے مفید وجود ثابت ہوئے۔ مکرم غلام ربانی صاحب، مکرم ملک بشیر احمد صاحب اور محمد احمد صاحب مالاباری کو بطور ڈسپنسر کام کرنے کا موقعہ ملا۔ کیونکہ قادیان میں کوئی لیبارٹری نہ تھی اور پیشاب، پاخانہ، خون، بلغم وغیرہ ٹیسٹ کروانے کے لئے مریض کو امرتسر بھجوانا پڑتا تھا اس لئے 1951ء کے شروع میں ایک مائیکروسکوپ اور لیبارٹری کا ضروری سامان خرید کر محدود پیمانہ پر لیبارٹری کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ اس شعبہ کے لئے ٹرینڈ اسسٹنٹ ہمارے پاس نہیں تھا جس کی وجہ سے کافی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔

مستورات کی مخصوص امراض کے علاج کے لئے بڑی دقت تھی۔ اور درویشوں کے اہل و عیال کے آجانے کی وجہ سے یہ تکلیف اور بھی زیادہ نمایاں ہوگئی۔ اس کے بعد خدا کے فضل سے 1951ء میں مستورات کی مخصوص امراض کے علاج کے لئے ایک عیسائی نرس کی خدمات بھی حاصل کر لی گئیں اور امید ہے کہ کوئی مسلم نرس قریب عرصہ میں دستیاب ہو جائے گی۔

شفاخانہ کی موجودہ عمارت گو تمام ضروریات کے لئے کافی ثابت ہو رہی ہے لیکن اس کا صحن بہت ہی چھوٹا ہے۔ شفاخانہ کے اوقات میں تمام صحن بھر جاتا ہے۔ دو تین گھوڑیاں بھی عام طور پر صحن میں کھڑی ہوتی ہیں۔ بعض سیریئس (Serious) مریضوں کی چارپائیاں بھی صحن میں پڑی ہوتی ہیں۔ اس طرح بہت جمگھٹا سا ہو جاتا ہے جس کے باعث کام میں بھی روکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

ان ڈور (In-door) کے لئے ہمارے پاس جگہ ناموزوں اور ناکافی ہے اور خدا کے فضل سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد کوئی سامان پیدا فرما دے گا۔ قادیان میں اس وقت نور ہسپتال آنکھوں کے علاج کا سینٹر ہونے کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ بعض طبقوں میں ہماری مخالفت بھی کافی ہے پھر بھی خدا کے فضل سے مریضوں کی حاضری ہمارے شفاخانہ احمدیہ اور نُور ہسپتال کی یکساں ہی رہتی ہے۔

آخر میں احبابِ جماعت سے مؤدبانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمارے لئے دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں محنت و دیانت سے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے کام میں اس قدر ترقی عطا فرمائے کہ نور ہسپتال کے چھین لئے جانے سے جو نقصانِ عظیم ہمیں پہنچا تھا، اس کی تلافی کسی حد تک ہو جائے۔

یہ تھی اباجی کی وہ تحریر جس سے شفاخانہ احمدیہ کی ابتدائی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد ہر دم ساتھ تھی۔ ارحم الراحمین کی دی ہوئی توفیق سے اباجی کام کئے جاتے تھے۔ ان درویشوں کی مدد اللہ تعالیٰ غیب سے بھی کر رہا تھا۔ مومنوں کے گروہوں کو فرشتے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں اور ان سے دوسرے بھی فیض حاصل کرتے ہیں۔ اباجی کے واپس آجانے کے بعد ایک لمبے عرصہ تک وہاں کوئی ڈاکٹر نہ تھا۔ آج خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ شفا خانہ ہزاروں مریضوں کا علاج کر رہا ہے۔

احمدیہ شفاخانہ سے وابستہ ایسا ہی ایک واقعہ مکرم محترم فضل الٰہی انوری صاحب نے کمال شفقت سے مجھے بھجوایا۔ یہ واقعہ ان کی کتاب درویشان احمدیت۔ جلد پنجم میں درج ہے، جو درج ذیل ہے:

تمہارا علاج قادیان میں ہے

ایک غیر مسلم معزز دوست کی ایک تکلیف میں آسمانی رہنمائی

حدیث شریف میں مومنوں کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ لَا يَشْقٰى جَلِيسُهُمْ کہ وہ ایسے خوش بخت اور خوش نصیب لوگوں کا گروہ ہے، جن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا بھی فیضان الٰہی سے محروم نہیں رہتا۔ چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ ایک ہندو شخص کا بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح خدا کے بندوں کی صحبت اس کی ایک تکلیف دہ بیماری سے نجات کا موجب بنی۔

یہ ہندو دوست، جن کا نام دیوان کیدار ناتھ تھا، ان کے بارے میں آتا ہے کہ تقسیم ملک سے قبل جب وہ سیالکوٹ میں رہتے تھے تو بعض احمدی دوستوں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ یہ

تعلقات اتنے بڑھے کہ انہوں نے ازراہِ عقیدت حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کی فوٹو لے کر اپنے کمرے میں لگا لی۔ 1947ء میں جب تقسیم ملک ہوئی تو وہ سیالکوٹ سے گورداسپور میں آ کر مقیم ہو گئے۔ (گورداسپور وہ ضلع ہے، جس میں جماعت کا عالمی مرکز قادیان واقع ہے، جہاں پارٹیشن کے بعد سے ایک مختصر سی تعداد احمدیوں کی رہ گئی اور جو ''درویشان'' کے اعزازی لقب سے جماعت میں یاد کئے جاتے ہیں)۔

انہی ایام کی بات ہے کہ اس ہندو کو وجع مُفاصِل (یعنی جوڑوں کے درد) کی تکلیف رہنے لگ گئی۔ یہ تکلیف اتنی بڑھی کہ ان کے گھٹنوں اور پاؤں پر ورم ہو گیا، جس کے نتیجہ میں ان کے لئے اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ وہ گورداسپور کے سول ہسپتال میں علاج کے لئے بھی گئے، ادویہ اور ٹیکے بھی استعمال کئے، مگر افاقہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں مختلف احباب نے لکھا۔ ان تحریرات کو کئی اخبار اور رسائل نے چھاپا۔ ذیل میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش کیا جاتا ہے:

وہ ہندو بیان کرتا ہے:

''ایک دن مَیں شدت درد سے بہت بے چین تھا۔ حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کی وہ فوٹو، جو میرے ایک احمدی دوست نے سیالکوٹ میں مجھے دی تھی، میرے کمرے کی دیوار پر آویزاں تھی۔ چنانچہ مَیں اس کی طرف منہ کر کے نہایت آہ وزاری سے دعا کرنے لگا۔ ابھی مَیں دعا کر ہی رہا تھا کہ مجھے زور سے آواز آئی، ''تمہارا علاج قادیان میں ہے۔''

پھر وہ کیونکر قادیان پہنچے اور مامور من اللہ کی یہ مقدس بستی کس طرح ان کی شفا کا موجب بن گئی اس کی روئیداد بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں اس غیبی آواز کے کانوں میں پڑتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ میری یہ بیماری قادیان میں جا کر دور ہو گی۔ چنانچہ مَیں ایک پڑوسی سے مدد لے کر قادیان پہنچا۔ وہاں پر موجود احمدی درویشوں کو جب میں نے اپنا اور قادیان آنے کی غیبی تحریک کا حال بتا کر رہنمائی چاہی، تو انہوں نے اسی وقت احمدیہ، شفاخانہ کے انچارج کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب سے ملنے اور مشورہ کرنے کے لئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے میرا علاج شروع

کر دیا۔ آگے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو میرا علاج شروع کئے ہوئے ابھی دو دن ہی ہوئے تھے کہ میرا درد جاتا رہا اور پھر چند دنوں کے بعد ورم بھی اتر گیا اور مَیں بالکل صحت یاب ہو کر واپس آ گیا۔ (منقول از روزنامہ الفضل، ربوہ، مورخہ یکم جولائی 1955 بحوالہ تاریخ احمدیت، جلد 18)

ابا جی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تقریباً آٹھ سال خدمت خلق میں مصروف رہے۔ پھر ان کو پاکستان آنا پڑا کیونکہ ان کے پاس زرعی اراضی تھی۔ اس اراضی پر قبضے کے لئے قانوناً ایک یہ بھی شرط تھی کہ پاکستان کا شہری ہو، ورنہ جائیداد ضبط ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ ان دنوں علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ تشریف لے گئے تھے۔ ان کو وہاں جب اس نئے قانون کے پاس ہونے کی خبر ملی تو آپ نے قادیان ٹیلیگرام بھیجا کہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب کو فوراً پاکستان بھجوایا جائے اور فرمایا کہ ''انجمن کو چاہئے تھا کہ کوئی ڈاکٹر تیار کر لیتے، کب تک ایک شخص پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔'' قادیان والوں کے لئے یہ تکلیف دہ خبر تھی۔ ابا جی کے آنے کے بعد کوئی کوالیفائیڈ ڈاکٹر نہ رہا۔ شفا خانے کی حیثیت ایک ڈسپنسری کی سی رہ گئی۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے قادیان آنے پر ان سے درخواست کی گئی تو باقاعدہ ڈاکٹر کا تقرر ہوا۔ آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ شفا خانہ اپنے علاقے میں خدمت خلق کا بہترین ادارہ ہے۔

ابا جی نے دیگر خدمات کے علاوہ صدر انجمن کے ممبر کے عہدے پر فائز رہ کر بھی اپنے ربّ کی رضا کو حاصل کیا جس کا ''رسالہ الفرقان'' میں یوں ذکر ملتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر احمد صاحب نے قادیان قیام کے دوران ممبر صدر انجمن احمدیہ کی حیثیت سے خدمت کی توفیق پائی۔ (الفرقان۔ درویشان قادیان نمبر)

ابا جی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تقریباً آٹھ سال خدمت خلق میں مصروف رہے پھر ان کو پاکستان آنا پڑا کیونکہ نئے قانون کے مطابق زرعی اراضی اور دوسری جائیداد ضبط ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس سے قبل کوئی ایسا قانون نافذ نہ تھا۔ قادیان میں لمبا عرصہ خدمتِ دین وخدمتِ

خلق بجالانے کے بعد اباجی کو واپس پاکستان جانا پڑا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے قادیان سے روانگی کا وقت آ پہنچا۔ امی، اباجی اور ہم پانچ بہنیں واپس آرہے تھے۔ واہگہ کی بجائے اباجی کو کھوکھرا پار کا کٹھن اور لمبا سفر طے کرنا تھا کیونکہ ان کو پاکستان مستقل آنا تھا۔ اس لئے قانوناً کھوکھرا پار کی سرحد سے گذرنا تھا۔ قادیان کی جماعت کو اباجی سے بہت محبت تھی۔ تقریباً سبھی درویش الوداع کہنے آئے تھے۔ اباجی کا دل بھی غمزدہ تھا۔ اتنا لمبا عرصہ ان پیارے لوگوں میں رہے جن سے ہمیشہ خلوص اور محبت کی خوشبو آتی رہی۔ نہایت رقت بھری لمبی دعا ہوئی۔ درویش بھائی دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے، یہاں تک کہ ٹانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ہمارے والدین اس زمین کو چھوڑ آئے جو امامِ وقت کی تخت گاہ ہے۔ جو دنیا کا تیسرا مرکز ہے۔ جہاں اسلام ایک دفعہ پھر سے زندہ ہوا۔ جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے محب رفیق حضرت نورالدینؓ کے پہلو میں سو رہے ہیں اور اسی بہشتی مقبرہ میں آپ کے سینکڑوں جانثار بھی ابدی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔

قادیان میں قیام کے دوران ہمارے والدین کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد بہشتی مقبرہ میں دعا کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بیت الدعا اور دوسری بابرکت جگہوں پر کثرت سے جا کر ربِّ رحیم کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا کرتے تھے۔ یہ برکتیں مجبوراً چھوڑ کر 7 جولائی 1955ء کو پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے۔ آخری سانسوں تک قادیان کی محبت بھری یادوں سے دل بہلاتے رہے۔ ہر سال جلسہ پر درویشوں کا قافلہ آتا تو ہمارے والدین ہمیں لے کر ان سے ملنے جاتے۔ اس موقع پر دونوں اطراف کی خوشی قابلِ دید ہوتی۔

ہماری باجی ناصرہ رشید کا بچپن درویشی میں گذرا۔ وہ بچپن کی یادوں کو دہراتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ہم مرزا سلطان احمد صاحب کے گھر میں اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ یہ گھر بہت بڑا تھا۔ ایک کمرے میں دو بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر پر حضرت مسیح موعودؑ کا الہام ''تائی آئی'' لکھا تھا اور دوسری تصویر مرزا سلطان احمد صاحب کی تھی۔ پاکستان سے حضور

کے خاندان کے افراد قادیان آتے تو ہمارے ہاں ان تصاویر کو دیکھنے آتے۔ امی لجنہ کی صدر تھیں اس لئے ہمارے ہاں اجلاس ہوتا تھا۔ نئی دلہنیں آتیں تو امی ان کا استقبال کرنے جاتیں۔ ہمارے ہاں بہت مہمانداری ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ہاں ہندو اور سکھ خواتین آیا کرتی تھیں۔ امی ان کو تبلیغ کیا کرتیں۔ کتاب درثمین سے چولا بابا نانک نکال کر دکھاتیں۔ حضرت میاں بشیر احمدؓ نے اباجی کو لڑکیوں کا سکول کھولنے کی نصیحت کی ۔ چنانچہ اباجی نے اس سکول (نصرت گرلز سکول) کی بنیاد رکھی جو اُمِّ طاہر کے گھر کھولا گیا۔ یہ مدرسہ صرف پرائمری تک تھا۔ محترم قریشی فضل حق صاحب درویش اُستاد مقرر ہوئے۔

داخلہ لینے والیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ سکول میں صرف اردو پڑھائی جاتی تھی، ہندی رائج نہیں تھی۔ پرائمری سکول کے بعد چھٹی جماعت کے لئے دوسرے سکول میں جانا پڑتا تھا جس میں ہندی رائج تھی۔ اباجی نے میرے لئے محترم بشیر احمد صاحب کالا افغانہ کو بطور ٹیوٹر مقرر کیا۔ میں نے تھوڑے عرصہ میں ہندی سیکھ لی مگر پھر ہمیں جلد ہی پاکستان آنا پڑا۔ حضرت مرزا بشیر احمدؓ نے کئی مرتبہ ہندی میں لکھے ہوئے خطوط مجھے بھجوائے لیکن بعد میں مَیں جلد ہی یہ زبان بھول گئی۔

قادیان کی گلیوں میں گذرتے ہوئے ہمیں ہر ایک کو سلام کرنا ہوتا تھا اور سر پر دوپٹہ بھی ضرور لینا ہوتا تھا۔ کپڑا خریدنے کے لئے بزاز کو بلا لیا جاتا اور امی پردے کے پیچھے سے سودا کرتیں۔ ایک مرتبہ حضرت میاں بشیر احمدؓ کے آموں کے باغ میں سیر کو گئے۔ بعض آموں کی ٹہنیاں پھل کے بوجھ سے زمین کو چھو رہی تھیں.

ہمارے ہاں گائے بھینسیں تھیں۔ دودھ بافراغت تھا۔ صبح ہی سے لوگ لسی لینے آیا کرتے تھے۔ خاص طور پر درویش سحری کے وقت لسی لینے آتے۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ فلاں کے گھر میں کوئی بیمار ہے تو امی ان کے برتنوں میں مکھن کے پیڑے ڈال کر دیا کرتیں۔ پاکستان واپس آنے کے بعد بھی درویشوں کے ساتھ بہت تعلق رہا۔

درویشانِ قادیان کے محبت بھرے جذبات

اپریل 2007ء میں میری قادیان جانے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ میں اباجی کے حالات لکھنا چاہتی تھی۔ قادیان کے سفر کے دوران میری ملاقات حضرت صاحبزادہ میاں وسیم احمد صاحب اور کچھ دوسرے درویش احباب کے ساتھ ہوئی۔ چند لمحے انہوں نے میرے ساتھ اباجی کی یادوں کو دہرایا۔ چند دن کے بعد میں واپس پاکستان چلی گئی اور ان کی بیماری اور پھر وفات کی جانکاہ خبر ملی۔

اس موقعہ پر میں نے ان کے ساتھ کی گئی ملاقات کے بارے میں ایک مضمون لکھا اس مضمون کے چند اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد کے ساتھ ایک ملاقات

(بحوالہ روزنامہ الفضل ربوہ۔ بدر قادیان)

ابھی چند دن ہوئے ماہ اپریل میں میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ مجھے خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے قادیان دارالامان جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میاں صاحب کے ساتھ ہم سب کا روحانی رشتہ تھا۔ حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کا خاص مقام تھا۔ محبت یکطرفہ نہیں ہوا کرتی۔ لوگوں کا اظہار عقیدت تھا اور میاں صاحب کا جواب پیار ہی پیار تھا۔ مختلف نمازوں پر آتے جاتے ان پر نظر پڑتی۔ خدام ان کو گھیرے کھڑے ہیں۔ کسی نے زور سے ہاتھ پکڑ رکھے ہیں، کوئی اپنا مسئلہ بیان کر رہا ہے، کسی کو دعا کی حاجت ہے، کسی نے کان میں سرگوشی کر لی، کسی نے منہ پر گلہ کر ڈالا مگر حضرت میاں صاحب مسکرا کر ہر ایک سے شفقت کا سلوک فرماتے۔ ان سے ملنا مشکل نہ تھا۔ جب چاہا جس نے چاہا دفتر یا گھر پہنچ گیا۔

یہ نظارے دیکھ کر مجھے بھی جرأت ہوئی۔ نماز کے بعد مسجد مبارک سے باہر نکلتے ہوئے جب

وہ اپنے گھر جا رہے تھے میں نے سلام کیا اور اپنا تعارف کروایا۔ میاں صاحب نہایت خوش دلی سے ملے اور فرمایا: ''آپ آئی ہیں۔ آپ کو مَیں فلاں سال لندن جلسہ سالانہ پر بھی ملا تھا۔ جب آپ کے والدین سویڈن سے ہو کر آئے تھے۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا: ''کیا آپ کو ابھی بھی یاد ہے؟ ماشاء اللہ آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعائیں لگی ہوئی ہیں جو انہوں نے اپنی اولاد کے لئے کی تھیں۔ خاندانِ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے حافظہ کا جواب نہیں''۔ اس پر آپ مسکرا دیے اور فرمایا۔ ''مجھے وہ جگہ وہ راہداری وہ روش بھی یاد ہے جہاں ہم نے کھڑے ہو کر باتیں کی تھیں۔'' حالانکہ یہ بات اتنی پرانی ہے۔ میرے والدین کو سویڈن آئے کئی برس بیت گئے مگر میاں صاحب کو ابھی بھی یاد تھا۔ پھر ایک دن مَیں بچوں کو لے کر ان سے ملاقات کرنے گئی۔ نہایت محبت سے ملے۔ آپا جان بھی باوجود خرابیٔ طبع اندر سے تشریف لائیں۔ میرے بیٹے باسط رحمان کو دیکھ کر بیگم صاحبہ کو نہایت خوشی سے فرمایا۔ ''بیٹا آیا ہے'' میرے دونوں بچوں نے ان سے پیار لیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

عزیزم باسط رحمان کی کاپی پر آپ نے یہ نصائح لکھیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم باسط رحمن سلمہ اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے یہ سلوک ہے کہ جو اسے یاد رکھتا ہے اللہ بھی اسے یاد رکھتا ہے۔ جو اس کے قریب جاتا ہے۔ وہ اسے اپنے قریب رکھتا ہے۔ پس ہمیشہ اپنے ربّ کو یاد رکھا کرو۔ خدا تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔

والسلام۔ مرزا وسیم احمد 14-04-2007

عزیزہ رافعہ کی کاپی پر آپ کے جو الفاظ درج ہیں ان سے حضرت میاں صاحب کا ہمارے والد صاحب سے محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزہ رافعہ سلّمہا اللہ تعالیٰ

آپ کے نانا محترم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ابتدائی درویشوں میں سے تھے۔خدا تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔بڑے دعا گو، تہجد گذار درویش تھے۔
اللہ تعالیٰ ان کی سب اولاد میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی نیکیاں قائم رکھے۔خدا تعالیٰ سے دعا مانگنے والا کبھی محروم نہیں رہتا۔

والسلام مرزا وسیم احمد 14-04-2007

میں نے عرض کیا میں اپنے ابا جی کے حالات زندگی لکھ رہی ہوں۔اس سلسلہ میں درویشوں کے تاثرات قلم بند کر رہی ہوں۔پھر وہ ابا جی کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یادیں دہرانے لگے۔فرمایا:

''یہ جو پیچھے کمرہ ہے حضرت ام ناصر کے گھر میں، اس میں ڈاکٹر صاحب اور میں ایک لمبے عرصہ تک اکٹھے کھانا کھاتے رہے۔درویشی کے ابتدائی زمانے میں ہمارا وقت اکٹھا گذرتا تھا۔ اِن کے حقے کی گڑگڑ بھی رونق لگائے رکھتی۔ان کو بچپن میں گاؤں میں رہتے ہوئے عادت پڑ گئی تھی۔حقے کا آپ خاص اہتمام کرتے۔''

پھر درویشی کے ابتدائی دور کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح شروع میں غیر مسلموں کے ایک طبقہ نے عوام میں مخالفت کے جذبات بھڑکا کر ہمارا بائیکاٹ کر دیا۔اور تمام راستے بند کر دئے گئے۔دشمن کی ناکہ بندی کی وجہ سے باہر کی دنیا سے ہم درویشوں کا تعلق بالکل کٹا ہوا تھا۔ہم میں سے کوئی باہر جا کر سبزی دودھ یا عام ضروریاتِ زندگی کی چیزیں بھی نہ خرید سکتا تھا۔پھر انہوں نے ننگل کی خاتون کا واقعہ دہرایا اور بتایا کہ کیسے اس دلیر خاتون نے اس کڑے وقت میں درویشوں کی مدد کی۔یوں آہستہ آہستہ پابندیاں ختم ہونے لگیں۔(یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ اوپر لکھا جا چکا ہے)
پھر فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے بہت شفا رکھی ہوئی تھی۔اللہ تعالیٰ کے فضل

وکرم سے احمدیہ شفاخانہ میں بہت برکت پڑی۔ پھر کام میں بہت ترقی ہوگئی۔ ہندو سکھ مریض بھی آنے لگے۔ احمدیہ شفاخانہ کی وجہ سے پابندیاں اٹھنے لگیں۔ اس کی آمد خزانہ میں جاتی تھی۔''
حضرت میاں صاحب مجھے میرے اباجی کی باتیں بتاتے بھی جاتے تھے۔ساتھ ساتھ کہتے بھی جاتے تھے۔''مجھے اپنی یادداشت پر اعتبار نہیں۔'' پھر فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب کے پاس سارادن مریض ہوتے تھے۔ ان کو سر اٹھانے کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ باوجود مصروفیت کے نماز باجماعت مسجد میں پڑھتے۔ ایک صفت ان میں یہ تھی کہ نہ صرف مریض کا علاج اور دعا کرتے بلکہ مسجد میں بھی دعا کا اعلان کرواتے۔''

حضرت میاں صاحب کا نہ صرف قادیان کے درویشوں کے ساتھ ذاتی تعلق تھا۔ بلکہ جو وہاں سے کسی مجبوری کے باعث آچکے تھے ان کو بھی وہ خوب یاد رکھتے تھے۔ وہ محبت، حلم اور حسن اخلاق کا پیکر تھے۔ ہم گھر والوں کا ایسا تعلق تھا جب بھی ملے یوں جیسے برسوں کے بچھڑے ملے۔ ہمیں مل کر اصرار کیا کرتے تھے کہ میری بیٹیوں سے بھی ملنا۔ اپنوں کے علاوہ وہ غیروں میں بھی بہت مقبول تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت میاں صاحب کو اپنی رحمت کی چادر میں لپیٹ لے۔ حضرت آپا جان، ان کی اولاد نیز تمام درویشان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ ان کی دعائیں ہمارے حق میں قبول فرمائے۔ آمین۔

شیخ عبدالقدیر صاحب درویش سے میری ملاقات ہوئی۔ شیخ صاحب اباجی کا نام سُن کر مجھ سے نہایت محبت وخلوص سے ملے۔ شیخ صاحب ہمارے پرانے بزرگوں میں سے ہیں۔ ابتدائی درویش ہیں۔ عجز وانکساری کا مجسمہ ہیں۔ ناسازیٔ طبع اور ہائی بلڈ پریشر کے باوجود انہوں نے اپنا بیان مجھے لکھ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی اولاد کو دین و دنیا کی نعمتوں سے نوازے۔ میرے اباجی سے ان کو خاص عقیدت اور تعلق تھا جس کا اظہار آپ نے یوں تحریر کیا:

''کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب مرحوم ایک بارعب شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود

انکساری کے ساتھ پیش آ کر مریضوں کا علاج کرنے کے عادی تھے۔ غالباً یہی نیک عادت مقبول ہوئی اور سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے انہیں مسکن و مدفن حضور علیہ السلام میں خدمت خلق اللہ کرنے کے لئے قادیان بھجوا دیا۔ جس سے نہ صرف درویشان کو بھروسہ مند طبی علاج میسر آیا۔ بلکہ ساتھ ہی موصوف کے وہ غیر مسلم بھی جو دشمن بن کر آئے مداح ہوئے۔ اور انہیں احمدی مسلمانوں کے قریب آ جانے میں مدد پائی۔ تقسیمِ ملک کے دور میں درندگی کا سلوک ہونے کے باعث آنے والے شرنارتھی، مسلمانوں سے شدید نفرت اور دشمنی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس لئے ناکہ بندی جیسی حالت میں اشد ضروریات کے لئے تین احمدی اجازت لے کر ہی بازار جاتے تھے۔ (اکیلے کسی کو بازار جانے کی اجازت نہ ملتی تھی) اپنی نفرت دور کرنے کے لئے یہ محتاط رول تھا جس سے غیر مسلم بھی آنا جانا شروع کر دیں۔ کیونکہ ڈر کی حالت بھی قائم تھی۔ جس کے لئے سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی دعاؤں اور رہنمائی سے عمل جاری رہتا تھا۔ موصوف کی خدمات میں سے صرف دو واقعات درج ذیل تحریر ہیں:

پہلا واقعہ

ماہ دسمبر قریباً گیارہ بجے رات کو سردار خشیش سنگھ نامی مالک پولٹری فارم محلہ احمدیہ میں آئے اور احمدیہ چوک (سول لائن) میں کھڑے احمدی پہرہ داروں سے کہا کہ ان کی بیوی شدید بیمار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ حفاظت کے لئے سپاہی ساتھ لایا ہوں۔ چنانچہ اطلاع پاتے ہی محترم ڈاکٹر صاحب بلاہچکچاہٹ اس کے گھر دارالفضل غربی گئے۔ (ان دنوں کار وغیرہ نہ تھی) وہی سپاہی واپس چھوڑ کر گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا بخشی۔ الحمدللہ۔

دوسرا واقعہ

پھر اس کے ہفتہ عشرہ کے بعد ایک دوسری رات کو آتمارام نامی شخص، جس کی بیوی ڈبل نمونیہ

کے باعث انتہائی تکلیف میں تھی، محلہ میں آئے اور احمدی پہرہ داروں کے توسط سے محترم ڈاکٹر صاحب سے طبی مدد کی درخواست کی۔ جسے منظور کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ان کے گھر جا کر علاج کیا۔ اس طرح وہ بھی بلاخطر آنے جانے لگے اور امن کے لئے راستہ بنتا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیوی کو شفا عطا فرمائی۔ اس واقعہ کے دوران مکرم محمد احمد صاحب نسیم گُٹی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بطور کمپوڈر جایا کرتے تھے۔

الغرض جن اغراض خدمت کے لئے آپ کو یہاں بھجوایا گیا تھا۔ آپ نے حضور رضی اللہ تعالیٰ کی توقعات کو بہ احسن طریق پورا کرنے کے لئے دن رات وقف کئے رکھا۔ یہی حال باقی درویشان کا بھی رہا۔ ہر ایک اپنی اپنی خدمت میں مصروف رہتا۔ ان درویشوں کی اکثریت اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو کر اس کے حضور حاضر ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے درجات اپنے فضل سے بلند سے بلند کرتا رہے۔ آمین یا رب العالمین۔

محترم سید شہامت علی صاحب ہمارے اباجی کے ساتھ بہت عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے اباجی کے بارے میں مکتوب بھیجا۔ آپ فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ساتھ میرا بہت پیار کا تعلق تھا۔ ہر انسان کا دوسرے کے ساتھ جدا معاملہ ہوتا ہے۔ ان کا میرے ساتھ انفرادی سلوک تھا۔ میرا مشاہدہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب بِلا امتیاز سبھی درویشوں کا پوری دلجمعی اور لگن کے ساتھ علاج کرتے تھے۔ نہایت ایمانداری اور انسانی ہمدردی کے تحت غیر از جماعت لوگوں کا خیال رکھتے۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب مَیں بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ 20 سال کی عمر تھی جب مَیں قادیان آیا۔ مَیں جامعہ کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ پہلے ہی سال کھیلتے ہوئے ایک بازو کی کلائی ٹوٹ گئی اور دوسرے بازو کی نسیں کھنچ گئیں اور وہ بھی تقریباً بیکار ہوتا نظر آیا۔ اپنے گھر سے بہت دور پردیس میں بہت گھبرایا۔ دونوں بازو معذور ہوتے دکھائی دئے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ اور شفقت سے علاج کیا۔ الحمدللہ ایک ڈیڑھ ماہ میں مجھے کامل شفا ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ

میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی شفا رکھی ہوئی تھی۔ انجمن کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ معیاری دوائیاں خریدنے کی استطاعت نہ تھی۔ چند معمولی اور غیر معیاری دوائیاں میسر تھیں۔ نہ جانے ڈاکٹر صاحب ان پر کیا پھونکتے تھے۔کیا دعا پڑھ کر دم کیا کرتے تھے کہ معجزانہ طور پر آرام آجاتا تھا۔ میری اس بات کا کیا ثبوت ہے، کیسے کہہ سکتا ہوں وہ فرشتہ تھے! حقیقت یہ تھی ان کے ہاتھ میں معجزہ نما شفا تھی۔ دوا نہ ہونے کے برابر تھی نہ جانے وہ کیا دعا کرتے تھے۔اسی کم مائیگی کے عالم میں وہ سب کی تشفی کا سامان کر دیا کرتے، کچھ دعاؤں سے اور کچھ اپنے خاص مزاح سے۔ تاہم انہی معمولی دواؤں سے اللہ تعالیٰ نے بے شمار مریضوں کو شفا عطا فرمائی۔ احمدیہ ہسپتال اور ڈاکٹر صاحب کا نام علاقہ میں روشن ہوا اور آج تک کیپٹن ڈاکٹر بشیر صاحب کا نام زندہ ہے۔ اردگرد گاؤں کے سادہ لوح ہندو، سکھ احباب ابھی تک یہی تصور کئے بیٹھے ہیں کہ موجودہ ملک ڈاکٹر بشیر ناصر صاحب ہی کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد ہیں۔'' (نوٹ۔ یہ بات مجھے متعدد درویشوں نے بتائی۔ الحمدللہ میرے ابا جی کی خدمت خلق اس انداز سے بھی زندہ ہے)

دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے:

''زمانہ تعلیم میں مَیں بہت سخت بیمار ہو گیا۔ یرقان کا شدید حملہ تھا۔ ان دنوں رہائش بورڈنگ ہاؤس میں تھی۔ بیماری کی صورت میں نور ہسپتال میں تقریباً دو ماہ داخل رہا۔ڈاکٹر صاحب شفقت سے علاج کرتے رہے۔ ایک دن میری طبیعت غیر معمولی طور پر کچھ زیادہ خراب ہوگئی۔ وہ رات میرے اوپر بہت سخت تھی۔ عجب بے چینی تھی، موت ناچتی نظر آتی تھی۔ رات گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو بلا بھیجا گیا۔ وہ کام سے فارغ ہو کر گھر جا چکے تھے۔ رات گیارہ بجے نیند کی حالت میں تیزی سے مجھے دیکھنے چلے آئے۔ لباس بھی تبدیل نہ کیا۔ لُنگی پہنے ہوئے تھے۔ اسی رات ایک اور گھر میں بھی آپ ایک مریضہ کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ محترم قریشی فضل حق صاحب درویش کی بیوی کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔ ان کے گھر کا اور بورڈنگ ہاؤس کا فاصلہ تقریباً 500 میٹر کا تھا۔ اس رات ڈاکٹر صاحب ایک چکر میرے

ہاں لگاتے۔ میری خبر گیری کو آتے کچھ دیر ٹھہرتے، دوا دیتے۔ میری حالت کا جائزہ لیتے اور بغیر آرام کئے واپس قریشی صاحب کے ہاں چل پڑتے۔ رات گیارہ بجے سے لے کر صبح فجر تک کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب مجھے تین مرتبہ دیکھنے آئے یہاں تک کہ میری حالت بہتر ہو گئی۔ لطف یہ ہے اس سارے عرصہ میں ڈاکٹر صاحب نے ماتھے پر شکن نہ ڈالی۔ کسی قسم کی بے زاری کا اظہار بھی نہ کیا۔ بار بار مجھ سے میرا حال پوچھتے رہے۔''

ایک قابلِ غور بات یہ تھی:

''ان دنوں درویشوں کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ حسبِ منشاء ان کو کھانا نہ ملتا تھا۔ بعض درویش حقیقی طور پر مگر بعض بہانہ بنا کر ڈاکٹر صاحب سے پرہیزی کھانا لگوایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب چاول یا دلیہ کے لئے پرچی لکھ دیتے تھے۔ خوب چہرہ شناس تھے۔ آپ جانتے تھے کس کو واقعی تکلیف ہے اور کون یونہی منہ کا مزہ تبدیل کرنے کے لئے پرچی لکھوانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرضی مریضوں کو دیکھ کر مسکراتے مگر پرچی لکھ دیتے۔ ان کی طبیعت میں مزاح بھی بہت تھا۔ ایک مرتبہ ایک درویش نے پرہیزی کھانے کی پرچی بنوانی چاہی جو کہ بیمار نہ تھا۔ وہ پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا۔ اس وقت درویشوں کے لئے کھانا لنگر میں پکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پرچی پر لکھ دیا کہ اس کو مقررہ کوٹے سے ایک روٹی زیادہ دے دی جائے۔ لنگر خانے کے عملے نے اس کو ایک روٹی زیادہ دے دی۔ اس نے حیران ہو کر احتجاج کیا تو اسے کہا گیا کہ تمہاری پرچی پر یہی لکھا ہوا ہے۔ تمہارے لئے یہی پرہیزی ہے۔

پھر ایک دن حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ پر قاتلانہ حملہ کی دل دہلا دینے والی خبر ملی۔ حضور پر چھرے کا وار کیا گیا تھا۔ قادیان میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ صدقہ کی تحریک کی گئی۔ درویش غریب لوگ تھے۔ ان کا آنہ، چونی یا اٹھنی بہت بڑی غنیمت تھی۔ اتنی ہی رقموں کے وعدے لکھوائے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب مسجد مبارک میں سجدہ ریز تھے۔ انہوں نے سجدے سے سر اٹھایا اور کہا ''میری طرف سے دو بکرے بطور صدقہ لکھیں'' اللہ تعالیٰ ان کو جزاء دے۔ درویشوں

کی غربت عروج پر تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا ایک بکرا انہوں نے سارے درویشوں کی طرف سے دیا اور ایک اپنی طرف سے، اللہ قبول فرمائے۔ آمین۔

پھر ایک عرصہ بعد آپ ربوہ تشریف لے گئے۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوئی نہایت تپاک سے ملتے سینے سے لگاتے۔ ہمیشہ ان کے ہاں سے محبت ملی۔ خود بھی فرشتہ تھے اولاد کو بھی دینی تعلیم دی۔''

محترم خواجہ احمد حسین صاحب، جو ابتدائی درویش ہیں، نے فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب بہت بڑی ہستی تھے۔ میرا ان پر بہت اعتقاد تھا۔ ان سے اُنس کی وجہ سے میرا ان کے ساتھ بہت زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ جب کوئی مریض آتا ان سے مل کر ایسا متأثر ہوتا۔ ان کی ہمدردی پا کر اس کی آدھی بیماری دور ہو جاتی۔ مریض کو تسلی دینے کا گویا آپ کو فن تھا۔ بول چال اور ہنسی مذاق سے دُکھی انسانوں کا دل موہ لیتے۔''

محترم طیب علی بنگالی صاحب کا کہنا ہے:

''ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کیا بتائیں۔ بڑے نیک اور ملنسار آدمی تھے۔ میرا گھٹنا خراب ہو گیا۔ مجھے احمدیہ ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان کی شفقت ومحبت اور نہایت توجہ سے میرا علاج کرنا مجھے یاد رہے گا۔ عجب خادمِ خلق انسان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی حکمتِ عملی اور انسانی ہمدردی نے غیروں کی نفرتوں کو آہستہ آہستہ مٹا ڈالا۔''

محترم مظفر احمد اقبال ولد حافظ سخاوت علی صاحب شاہ جہان پوری سے میری ملاقات قادیان کی مرکزی لائبریری میں ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں:

''میری ہوش سے پہلے ڈاکٹر صاحب یہاں سے جا چکے تھے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ملنے کا اشتیاق تھا 1984ء کا واقعہ ہے۔ میرے والد ربوہ تشریف لے گئے۔ ہماری رہائش ہمشیرہ کے گھر دارالعلوم جنوبی میں تھی۔ والد صاحب بیمار ہو گئے۔ ربوہ میں بہت ڈاکٹر موجود تھے مگر والد صاحب کو ڈاکٹر بشیر صاحب کی صحبت یاد تھی۔ میں ان کے کلینک

گولبازار ربوہ میں جا پہنچا۔ میرا نام سن کر پیار سے گلے لگایا۔ سب کام چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ ہو لئے۔ ان کے ہاں کئی مریض بیٹھے ہوئے تھے مگر ایک درویش بھائی کا ان کو لحاظ تھا۔ آپ نے بہت توجہ سے دیکھا۔ فیس بھی نہ لی۔ اس ملاقات کے دوران قادیان کا تذکرہ ہوتا رہا۔ پرانی یادوں کو دہراتے رہے۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اب ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر صاحب انکساری کا مجسمہ اور قربانی کا مادہ رکھنے والا وجود تھا۔ دل وجان نکال کر دینے والے انسان تھے۔ جب وہ قادیان میں تھے سارے گورداسپور سے لوگ ان سے علاج کروانے جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ یہاں قادیان میں آج بھی ان کا نام زندہ ہے آج بھی۔ ڈاکٹر بشیر احمد ناصر کو ارد گرد کے لوگ کیپٹن ڈاکٹر بشیر صاحب سمجھتے ہیں۔ ہر ایک کا علاج انسانیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے کیا کرتے۔

آپ کئی دن تک والد صاحب کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ والد صاحب جانبر نہ ہو سکے۔ وفات کی خبر سن کر فرمایا کہ آپ لوگ ثواب کی خاطر آئے تھے۔ جنازے میں بھی شامل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے۔ آمین۔''

حاجی منظور احمد صاحب درویش قادیان نے ابا جی کے حوالے سے اس وقت کی بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ آپ نے فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب پابندیوں کے باوجود ڈرتے نہ تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب پکڑ دھکڑ، اغوا، راہ چلتے پر حملہ، زد وکوب، مسلمانوں کے خلاف نفرت اور قتل وغارت گری عام تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب بھی بہت جی دار فوجی تھے۔ ان کی بہادری نے اس وقت کے حالات کو سدھارنے میں بہت مدد کی۔ محترم ربانی صاحب ٹرینڈ ڈسپنسر تھے اور نائب کی حیثیت سے خدمت کر رہے تھے۔ کیپٹن ڈاکٹر بشیر صاحب نے خدمتِ خلق کے طور پر مختلف لوگوں کو کام سکھایا۔ آہستہ آہستہ محترم مبارک علی صاحب، محترم یونس احمد اسلم ولد محترم محمد شفیع صاحب، محترم ڈاکٹر بشیر احمد ناصر صاحب، محترم اقبال صاحب محترم محمد احمد نعیم صاحب کمپاؤنڈر کا کام سیکھ کر آپ کے مددگار ہو گئے۔''

حاجی منظور صاحب نے مزید فرمایا:

''میری بائیں ہاتھ کی لمبی انگلی کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا۔ میں پرانے سول ہسپتال میں گیا۔ ڈاکٹر مان سنگھ سے ملا، ان کا فیصلہ تھا کہ آپریشن ہوگا اور پچھلی گانٹھ نکالنی پڑے گی۔ اس وقت میں نے کھانا کھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مان سنگھ نے اس خیال سے کہ مجھے الٹی ہو جائے گی اس وقت آپریشن ملتوی کر دیا اور کہا کہ ٹیکہ لگوا لو۔ رات کا وقت تھا پھر ربانی صاحب نے پٹی باندھی اور مَیں سو گیا۔ ساری رات خون بہتا رہا۔ صبح کیپٹن ڈاکٹر بشیر صاحب کو دکھایا۔ ساری رات خون بہنے کی وجہ سے میرا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب نے مجھے دیکھا تو بہت گھبرائے اور ربانی صاحب پر بہت ناراض ہوئے کہ ان کو رات کو کیوں نہ بلا بھیجا۔ مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا ''نوجوان ہو۔ بچ گئے ہو۔ تمہارا خطرناک حد تک زیادہ خون نکل گیا ہے۔'' پھر مَیں نے ڈاکٹر مان سنگھ کی آپریشن کرنے کی تجویز کے بارے میں بتایا تو کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب نے مجھے سمجھایا اور فرمایا ''تم ابھی جوان ہو جسم بڑھ رہا ہے اگر آپریشن کر کے گانٹھ نکال دی جائے گی تو پورہ ضائع ہو جائے گا''۔ پھر انہوں نے خون بند کیا اور میری نئے سرے سے پٹی کر دی۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے پورہ بھی بچ رہا انگلی بھی ضائع نہ ہوئی اور جلد شفا ہو گئی۔ الحمدللہ۔

خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے کیپٹن ڈاکٹر بشیر صاحب کی بہت عزت تھی۔ مسلم تو کیا غیر مسلموں میں بھی مقبول تھے۔ ان کی بہت بڑی قربانی تھی ملٹری کی اعلیٰ نوکری چھوڑ کر انہوں نے زندگی وقف کی۔ ان کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ انتظامی امور میں بہت سخت تھے۔ اصول پر قائم رہنے والے تھے۔ اپنی ڈیوٹی نہایت لگن اور ایمانداری سے نبھاتے تھے۔ ان کے ہسپتال کا یہ اصول تھا کہ جو پہلے آئے وہ پرچی بنوا کر باری کا انتظار کرے۔ کچھ احباب کرسی گھسیٹ کر آگے آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے رسے کے ساتھ کرسیاں بندھوا دیں تا کہ لوگ پرچی بنوا کر اپنی باری کے مطابق آئیں۔''

انہوں نے مزید فرمایا:

''ہمارے یہاں کئی قسم کے لوگ تھے۔ پرانے ملازمین، ملٹری مین، اور بعض بیرونی خدام کہلاتے تھے۔ ملٹری کے لوگوں اور امیر صاحب کا کھانا ان کے اپنے گھروں میں پکتا تھا جب کہ ہمیں کھانا لنگرخانہ سے ملتا تھا۔ جماعت کی مالی حالت کمزور تھی۔ ناکہ بندی کی مشکلات بھی آڑے آئیں۔ مکرم عبداللطیف آڑھتی صاحب نے اپنا مال یعنی مسور کی دال لنگر کو عنایت کر دی۔ ہمارے لئے یہ دال تھی اور غیر معیاری روٹیاں تھیں۔ ایک مرتبہ ایک درویش بھائی نے کرک والی روٹیاں ایک کینیڈا سے آنے والے مہمان کے ہاتھ حضرت میاں بشیر احمد صاحب کو ربوہ بطور تحفہ بھجوادیں۔ اس بات کا ردِ عمل یہ ہوا کہ کیپٹن ڈاکٹر بشیر صاحب کو لنگرخانہ میں پکنے والے کھانے کی نگرانی پر معمور کیا گیا یعنی وہ اس امر کا جائزہ لیں گے کہ لنگر کا کھانا حفظانِ صحت کے اصولوں پر پورا اُترتا ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی انتظامی صلاحیت کی وجہ سے حالات نے پلٹا کھایا اور بہت سدھار کیا۔ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب نے لنگر کا پکا ہوا کھانا صبح شام چیک کرنا شروع کیا اور لنگر خانہ کے کارکنان کو ہدایت دی کہ درویشوں میں کھانا تقسیم کرنے سے پہلے ان کے پاس بھجوایا جائے۔ آپ کھانا چکھ کر اس کی منظوری دیتے۔ یوں ہم درویشوں کی سنی گئی۔ ایک عرصہ بعد کیپٹن ڈاکٹر صاحب ربوہ تشریف لے گئے۔ جب کبھی بھی ان سے ملاقات ہوتی ہم پرانی یادیں دہراتے۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ محبت سے ملتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔''

عزیزم عبدالمجید ابن محترم عبدالسلام صاحب درویش نے بتایا:

''ہمارے ہاں نرمل سنگھ نامی سکھ دوست آیا کرتے تھے۔ ان کا لڑکا بہت بیمار ہو گیا۔ اس نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ لڑکے کی بیماری بڑھتی جارہی تھی۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اسے کسی نے احمدیہ شفاخانہ کی خبر دی۔ سوچا آزما لینے میں کیا حرج ہے۔ یہاں خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کے بیٹے کو شفا ہو گئی۔ نرمل سنگھ کہا کرتا تھا ''مرزائی کے ہاتھ میں شفا ہے۔'' نرمل سنگھ نے مزید بتایا۔ ''مَیں نے خود ڈاکٹر صاحب کو کہتے ہوئے سنا جب کہ وہ اپنی عبادت کر رہے تھے کہ

خدا یا نرمل سنگھ کے بیٹے کو شفا دے۔ ابھی تک پرانے سکھ احباب نانا جان کو نہایت محبت اور عقیدت سے یاد کرتے ہیں۔‘‘

جب اپریل میں مَیں قادیان گئی تو مسجد مبارک کے باہر ایک بہت سادہ بزرگ محترم بشیر احمد درویش کالا افغانہ سے ملاقات ہوئی۔ ان سے مَیں نے اباجی کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ان کے حالات زندگی اس قدر تفصیل سے بتانے شروع کئے کہ مَیں حیران رہ گئی یوں جیسے ان کو اباجی کی زندگی کا ہر پہلو معلوم تھا۔ یوں معلوم دیتا تھا کہ ان کے ذہن کے پردوں پر اباجی کی زندگی کی کتاب ثبت ہے۔ چونکہ ان سب حالات کا ذکر اوپر آ چکا ہے اس لئے دوبارہ لکھنے سے گریز کیا ہے محترم بشیر صاحب کالا افغانہ نے مزید کہا کہ ڈاکٹر بشیر صاحب غیر مسلموں کی بولی سمجھتے تھے۔ سکھوں کے ساتھ ٹھیٹھ پنجابی بولتے تھے۔ اس بات میں بہت محتاط تھے کہ علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ صبح ٹھیک آٹھ بجے وقت پر ہسپتال کھلتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب انجمن کے ممبر تھے۔ ہر کام وقت پر کرنے کے عادی تھے میں ہندی پڑھاتا تھا۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کی بڑی بیٹی ناصرہ کو ہندی پڑھائی۔ اس نے نہایت تیزی سے سیکھی۔ اللہ تعالیٰ محترم بشیر احمد صاحب کالا افغانہ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔

دورِ درویشی کے بارے میں محترم عبدالرشید صاحب ربوہ نے یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا:

’’چونکہ فوج میں کیپٹن کا عہدہ پایا تھا اور گزیٹڈ آفیسر (gazetted) تھے۔ قادیان میں رہائش کے دوران آپ اپنے علاقہ میں وہ واحد آفیسر تھے جو سب ہندوؤں اور سکھوں کے مختلف سرٹیفکیٹ اور اہم کاغذات پر دستخط کرتے اور مہرِ تصدیق (attest) لگاتے۔ اِس کام کے لئے ہندوؤں اور سکھوں کو دوسرے شہر جانا پڑتا تھا نیز فیس ادا کر کے دستخط حاصل کرنا ہوتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے کبھی کسی سے رقم وصول نہ کی۔ نہایت خندہ پیشانی سے مفت دستخط کر دیتے۔ اس سے ان غیر مسلموں پر بہت اچھا اثر پڑا اور وہ احمدیوں کے اور بھی نزدیک آ گئے۔

قادیان کے محاصرے کے دنوں میں آپ نے درویشوں کا ہر طرح خیال رکھا۔ مریضوں سے درویشوں کے لئے دودھ، ساگ، مکئی، گنے، گڑ، رَو (گنے کا رس) اور ضروریاتِ زندگی کی

دوسری چیزیں منگوا لیتے اور پھر درویشوں میں بانٹ دیتے اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر بعض ہندو اور سکھ مریض درویشوں کے لئے آٹا پیس کر لے آتے تھے جو اس مشکل وقت میں بہت بڑی نعمت سمجھا جاتا تھا۔''

اسی سفر کے دوران میری کچھ اور لوگوں سے ربوہ میں ملاقات ہوئی۔ان ملاقاتوں میں ابا جی کے بارے میں ان کے تاثرات درج ذیل ہیں:

محترمہ حمیدہ بیگم اہلیہ محترم نذر احمد صاحب قانون گو گولبازار ربوہ نے کہا:

''محترم ڈاکٹر بشیر احمد بہت ہی مشفق اور ہمدرد ڈاکٹر تھے۔ ہمارے گھر کے ساتھ ہی گلی میں ان کا کلینک تھا۔ بچوں کی بیماری یا تکلیف کی صورت میں جو ان کو اچانک ہوا کرتی تھی ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ان کے علاوہ ہمیں کسی اور پر اعتقاد نہ تھا۔آپ نہایت پیار اور محبت سے علاج کیا کرتے تھے۔''

محترمہ ہیڈ مسٹریس رضیہ بیگم صاحبہ دار الرحمت شرقی بیان کرتی ہیں:

''1956ء کا سال تھا۔ ہمارے اور ڈاکٹر صاحب کے مکان اکٹھے ہی تعمیر ہوئے تھے۔ دونوں گھروں کے درمیان دیوار کا کچھ حصّہ مشترکہ بنا جس پر کوئی جھگڑا نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے بہترین ہمسائے تھے۔ ربوہ کا کھاری اور غیر صحت مند پانی مجھے موافق نہ تھا اور مَیں اکثر بیمار رہتی تھی۔ان کا کمپاؤنڈر کئی مرتبہ گھر اور کبھی دار الیمن سکول میں مجھے ٹیکہ لگانے آتا اور دوا دے کر جاتا جس کے لئے مَیں ڈاکٹر صاحب کی بہت ممنون تھی۔ کئی مرتبہ جب مَیں بیمار ہوتی تو اپنی بیٹی کے ہاتھ ان کو پیغام پہنچاتی۔ ہمیشہ آنے کا وعدہ کرتے اور مجھے دیکھنے کے بعد اپنے کلینک پر جا کر دوا بھیج دیتے۔ان کی ہمسائیگی کا مجھے بہت سہارا تھا۔

سال بھر کی گندم اور مونجی مَیں ان سے خریدتی تھی۔ وہ ہر سال مقررہ وقت پر میرے ہاں جنس بھجوا دیتے مگر کبھی فوری رقم کا مطالبہ نہ کرتے۔ جمعہ کی نماز مسجد مبارک میں جانے کے لئے اگر وہ ٹانگے پر ہوتے اور ہمیں دیکھ لیتے تو ٹانگہ رُکوا کر سوار کر لیتے۔ انہوں نے میرا ہمیشہ ساتھ دیا

اور رحم دل ہمسایہ ہونے کا ثبوت دیا۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین۔‘‘

محترم مرزا عبدالرشید دارالعلوم غربی ربوہ نے فرمایا:

’’ڈاکٹر صاحب ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے کسی نے نازیبا بات کہہ دی یا گالی بھی دے دی تو برداشت کر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک جاننے والے نے ان کو گالیاں دیں۔ آپ نے کچھ نہ کہا بس مسکراتے رہے۔ بہت متحمل مزاج تھے ان کی فیس واجبی سی ہوتی تھی۔ ٹیکہ، دوا اور فیس ملا کر صرف اڑھائی روپے وصول کرتے تھے جبکہ اس وقت دوسرے ڈاکٹر دس روپے لیا کرتے تھے۔ مَیں نے ان سے خود علاج کروایا۔ غریب مریضوں کو نہ صرف معاف کرتے بلکہ ان کی مالی مدد بھی کرتے تھے۔ ان کے توسط سے بعض بچیوں کے رشتے طے ہوئے۔ آپ فوج میں رہ چکے تھے۔ فوج کی عمدہ تربیت انہوں نے بھُلائی نہ تھی۔ کاغذ کو ضائع نہ کرتے تھے۔ اگر لفافے زیادہ آ گئے ہیں تو ان کو پھاڑ کر پرچیاں بنا لیتے تھے۔ ان پرچیوں پر نسخہ لکھ کر دیا کرتے۔ انہوں نے ہمیشہ بچت کو ملحوظ رکھا۔ مہنگی دوائیاں یا کیپسول تجویز کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کی دوا زود اثر ہوتی تھی۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی ایک اور بات یاد آئی جو مَیں لکھوانا چاہتا ہوں۔ ربوہ میں ان کی نئی خرید کردہ اراضی تھی۔ مَیں اس زمین کے پرانے مالک سے چارہ لیا کرتا تھا مجھے معلوم نہ تھا کہ اس نے زمین بیچ دی ہوئی ہے۔ ایک دن مَیں نے اُس سے حسبِ معمول چارہ مانگا اور چلتا بنا۔ ڈاکٹر صاحب وہیں کہیں آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے بُلا کر حقیقت دریافت کی۔ آپ نے چارہ واپس نہ لیا اور قطعاً ناراض نہ ہوئے۔‘‘

مکتوب محترم میاں غلام احمد صاحب (حال امریکہ):

ہمارے ایک معزز بزرگ محترم میاں غلام احمد صاحب (حال امریکہ) اباجی کے محبوب تعلق داروں میں سے ہیں۔ان کی عمر چھیاسی برس ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو صحت وتندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ پاکستان میں محکمہ انہار میں بطور سپرنٹنڈنٹ فیصل آباد میں کام کرتے رہے۔اباجی اپنی زرعی اراضی کے واسطے نہری پانی کے حصول کے لئے محکمہ انہار میں گئے تو وہاں میاں غلام احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے اپنی یادوں کے بھروسے پر مجھے نہایت پیارا مکتوب بھیجا ہے۔وہ خط درج ذیل کرتی ہوں۔آپ لکھتے ہیں:

''یہ عاجز بھی سابق فوجی تھا اور دوسری جنگِ عظیم میں شامل تھا۔برما اور آسام کے محاذ پر جاپانیوں سے مقابلہ تھا۔وہاں سے فارغ ہونے کے بعد پاکستان آگیا اور محکمہ انہار پنجاب لائل پور (فیصل آباد) میں چالیس سالہ سروس کے بعد بطور سپرنٹنڈنٹ ریٹائر ہوا۔الحمدللہ۔

محترم ڈاکٹر بشیر صاحب اکثر میرے دفتر میں یعنی محکمہ انہار لائل پور میں تشریف لاتے۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی زمین واقع دسوہہ ضلع لائل پور میں نہری پانی کے حصول کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔یہ عاجز اس کام کو باعث برکت سمجھتے ہوئے ضلعدار متعلقہ سے کروادیا کرتا تھا۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے لوگ میری بطور سپرنٹنڈنٹ بہت عزت کرتے تھے۔اس محکمہ میں ہوتے ہوئے پبلک کے ساتھ میرا بہت تعلق تھا۔اس کے علاوہ آپ کبھی میڈیسن وغیرہ بھی خریدنے آتے تو نہایت محبت سے مجھے ملنے آتے۔ان کا طریق تھا کہ دفتر کے باہر آکر بیٹھ جاتے اور چپڑاسی کے ہاتھ چٹ اندر بھجواتے۔اس پر مجھے اچھا محسوس نہ ہوا کہ میرے پیار کرنے والے بزرگ کو میرے ہی دفتر کے دروازے پر انتظار کرنا پڑے۔مَیں نے دفتر کے چپڑاسی کو سمجھا دیا پھر آپ بے دھڑک اندر تشریف لے آتے۔ان کی طبیعت میں مزاح بھی بہت تھا۔ان کی شکل آنکھوں کے آگے گھومتی رہتی ہے۔بعض وجود ایسے ہوتے ہیں جن کی

یادمٹائے نہیں مٹتی۔

عاجز اکثر گول بازار ربوہ میں آپ کے کلینک پر جایا کرتا تھا۔دوا اور دعا دونوں حاصل کرتا رہا۔الحمدللہ۔اپنے بچوں کے لئے بھی مفت دوا حاصل کرتا رہا۔محترم ڈاکٹر صاحب نے کبھی کوئی فیس یا دوا کی قیمت وصول نہ کی۔

مرحوم جب بھی میرے دفتر میں تشریف لاتے تو میرے ماتحت کلرک، ڈرافٹ مین اور دوسرے عملے کو بہت حکمتِ عملی سے ہلکے پھلکے انداز میں تبلیغ بھی کر دیا کرتے تھے۔ذرا بھی نہ ڈرتے تھے۔خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے مَیں بھی بے دھڑک تبلیغ کر دیا کرتا تھا۔جس کے نتیجہ میں کافی مصائب اور مشکلات حائل ہوئیں مگر سب ہی محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دور ہو گئیں جسکا نتیجہ یہ تھا کہ عاجز کی حقیر کوششوں سے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے ۵۰ کے قریب احباب بیعت کر کے جماعت احمدیہ میں شامل ہوئے۔

یہ عریضہ ایک صالح انسان کے ذکرِ خیر کے بارے میں ہے۔خدا تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور سب لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔آمین۔"

محترم شیخ محمد نعیم مربی سلسلہ افریقہ (انچارج رشتہ ناطہ) نے بیان کیا کہ ڈاکٹر بشیر صاحب کے بارے میں سوچنا شروع کروں تو شفقت کے حوالے سے ان کے وصف نمایاں ہو جاتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب پر ہمارا پرانا اعتقاد تھا۔ان کے ہاں مکرم انور زاہد بطور کمپاؤنڈر کام کرتے تھے۔وہ ہمارے ساتھ باسکٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ 1968ء کی بات ہے ہم جامعہ میں پڑھتے تھے۔کھیل کے دوران اگر کسی کو چوٹ آجاتی تو ہم جماعت کے قائم کردہ فضلِ عمر ہسپتال کی بجائے ڈاکٹر بشیر احمد صاحب کے پاس لے آتے۔ہم صرف تانگے کی اُجرت ادا کیا کرتے تھے۔واقفینِ زندگی سے فیس نہ لیتے تھے۔جامعہ کے باقی طالبِ علموں سے بھی کبھی کوئی فیس نہ لی۔ڈاکٹر صاحب اللہ کا خوف رکھنے والے اور خدمتِ خلق کرنے والے انسان تھے۔اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے اہل وعیال کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔آمین۔

مکرم قیصر محمود قریشی (افضل برادرز) نے بتایا کہ 1985ء کا سال تھا۔ مسجد بلال میں عصر کی نماز ہو رہی تھی۔ بلال مارکیٹ میں کام کرنے والے ایک عمر رسیدہ دوست (جو کریانہ کی دوکان کرتے تھے) نماز کے دوران بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ مَیں طبی امداد طلب کرنے کے لئے تیزی سے باہر نکلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب سامنے سے چلے آ رہے ہیں۔ میری درخواست پر وہ اسی وقت میرے ساتھ اندر آ گئے۔ مریض کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔ پھر ہنس کر تسلی دی اور ہم سے فیس کا مطالبہ بھی نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ مجھے خود ان کے پاس علاج کے لئے کئی مرتبہ جانے کا موقع ملا میں نے ان کو اپنے پیشے میں بہت عمدہ پایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے وارثین کی ہر طرح حفاظت فرمائے۔

محترمہ رفیعہ رامہ صاحبہ بیگم مکرم عبدالکریم صاحب صدر شکاگو نے ایک واقعہ بیان کیا:

''ہمارے بڑے ماموں محترم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب جن کو ہم سے بہت محبت تھی اور ہمیں بھی ان سے بہت اُنس تھا۔ آپ اکثر صبح کے وقت ہمارے ہاں آتے۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا ہر بات پر نظر رکھتے۔ ایک مرتبہ ہمارے محلہ میں ایک غریب بنگالی مہاجر خاندان رہائش پذیر ہوا جن کی ایک بیٹی ٹائیفائڈ سے بہت بیمار ہو گئی۔ مَیں نے ماموں کو اس لڑکی کا حال بتایا تو آپ اسی وقت ان کے ہاں چلے گئے اور مریضہ کو دیکھ کر دوا تجویز کی اور کوئی فیس نہ لی۔ یہی نہیں بلکہ اس وقت تک اس گھر کے چکر کاٹتے رہے جب تک اس کو شفا نہ ہو گئی۔''

مکرم و محترم پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی (حال مسی ساگا کینیڈا) اباجی کے بارے میں اپنی کتاب 'احمدیہ کلچر اور دوسرے مضامین' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ربوہ کے ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ملٹری کراس والے خاصے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ان کے ہاتھ میں شفا بھی بہت تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنا نسخہ خود تیار کرتے تھے۔ وہ پیٹنٹ دوائیوں پر انحصار نہیں کرتے تھے۔''

ابا جی کی زندگی کی کہانی کا کچھ حصہ ان کی بیٹی بشریٰ مظفر (کینیڈا ہملٹن) کی زبانی سنیے:

''قادیان سے واپسی پر آپ کی تقرری جماعت احمدیہ کے نئے مرکز ربوہ میں ہوگئی۔ ابا جی 18 جولائی کو ربوہ پہنچے۔ اس وقت فضل عمر ہسپتال میں کوئی ڈاکٹر موجود نہ تھا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ تشریف لے گئے تھے۔ مکرم ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب اور مکرم ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب بھی ہمراہ تھے۔ ہسپتال میں صرف ڈسپنسر باقی تھے۔ آپ کو فوج میں رہنے کی وجہ سے ہر کام نہایت ترتیب اور نظام کے تحت کرنے کی عادت تھی۔ آپ سے کسی قسم کی بے قاعدگی برداشت نہ ہوتی۔ دوائی دیکھ کر، سونگھ کر اور چکھ کر بھجواتے اگر دوائی درست نہ ہوتی تو کمپاؤنڈر کی جواب طلبی ہوتی کہ تمام دوائیاں کیوں نہیں ڈالی گئیں۔ بسا اوقات ان کا جواب ہوتا کہ ساری دوائیاں موجود نہ تھیں۔ پھر ان کو سرزنش ہوتی کہ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا میں انتظام کر دیتا یا متبادل لکھ دیتا۔ چند دنوں میں سارا عملہ ذمہ داری سے کام کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہسپتال کے کمرے مریضوں سے بھرنے لگے۔ لوگوں کو فیصل آباد جانے کا مشورہ قطعاً نہیں دیتے تھے۔ جب کسی مریض کے متعلق سنتے کہ اسے دوسرے شہر لے جایا جا رہا ہے تو ناراض ہو کر سوال کرتے اتنا بڑا ہسپتال کیوں بنا رکھا ہے؟ ابا جی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اچھے سرجن بھی تھے۔ ایک مرتبہ جب حضرت صاحبزادی نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو ابا جی نے اسی فضل عمر ہسپتال میں ان کا آپریشن کیا۔

15 فروری 1958ء کو آدھی رات کے وقت دل کا شدید حملہ ہوا۔ بیمار ہونے کے باوجود ہسپتال میں باقاعدگی سے ڈیوٹی دیتے رہے۔ جب آپ محسوس کرنے لگے کہ بوجہ بیماری کماحقہ ڈیوٹی ادا نہیں کر سکتے تو آپ نے فراغت کی درخواست دے دی اور گولبازار میں اپنا ذاتی کلینک کھول لیا۔ آخر دم تک اس کلینک میں کام کرتے رہے۔

آپ نے ساری زندگی عزّت و عروج دیکھا لیکن ہمیشہ خاکساری اور عاجزی رہی۔ ابا جی بہت ہی محبت کرنے والے باپ تھے۔ ہماری امی جان نے ہمارے دل میں باپ کی محبت اس قدر

ڈالی تھی کہ ہم بچے اباجی کے لئے بہت دعا کرتے۔ پینتیس سال سے دل کے مریض تھے۔ آپ ہم سے بہت ہی دوستانہ رویّہ رکھتے۔ ہم سکول اور کالج سے انعام لے کر آتیں یا سکول و کالج کی طرف سے بیرونِ ربوہ جاتیں۔ اباجی کو گھر سے روانہ ہونے سے واپس آنے تک ایک ایک بات کا حال سُناتیں۔ ہم نے اپنے اباجی سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ اسی لئے انہیں ہم پر بے حد اعتماد تھا۔ جمعہ کا خطبہ ہوتا یا اجتماع، اجلاس، یا جلسہ سالانہ کی کاروائی ہوتی۔ ہم سے ہمیشہ پوری کارروائی اور تقاریر سنتے۔ ہم بھی دھیان سے کاروائی سنتے کہ اباجی کو سنانا ہے۔ اب سوچتی ہوں کہ اس میں بھی تربیت کا ایک پہلو تھا کہ بچوں نے پوری طرح سُنا ہے یا نہیں۔ چُھٹیاں ہوتے ہی سلسلہ کی کتابیں ہم سب میں بانٹ دی جاتیں تاکہ چُھٹیوں میں ہم پڑھ کر ان کو ختم کر ڈالیں۔

ہر معاملے میں ہماری حوصلہ افزائی فرماتے۔ ہم اگر کوئی انعام جیت کر لاتیں، یا گھر میں کوئی اچھا کھانا بناتی یا کوئی بہن اچھا کام کرتی تو خوش ہوتے اور فرماتے:

’’جاؤ! میرے کوٹ کی فلاں جیب میں ہاتھ ڈالو، جتنے ہاتھ آجائیں سب پیسے تمہارے۔‘‘

اپنی اولاد کو ہر معاملہ میں بہتر دیکھنا چاہتے تھے۔ اباجی کی گیارہ بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ لیکن کبھی لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح نہ دی۔ کبھی لڑکیوں کو کمتر نہیں سمجھا۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ہم میں سے ہر بہن یہ سمجھتی ہے کہ اباجی اس سے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔

اباجی اپنے آخری سفر پر سویڈن گئے تھے۔ مَیں نے اپنے بڑے بیٹے مظہر کی بیماری پر دعا کے لئے خط لکھا۔ واپسی پر لاہور ایئرپورٹ پر اُترتے ہی مجھے پوچھا مظہر کا کیا حال ہے؟ جس وقت سے تمہارا خط ملا ہے مسلسل دعا میں مصروف ہوں۔ مَیں دل میں شرمسار ہوئی کہ مَیں ماں ہو کر بھی لاپرواہ ہوگئی اور آپ بھولے نہیں۔

آپ نے بہت ہی مصروف زندگی گذاری۔ خود فارغ ہوئے نہ ہمیں فارغ بیٹھنے دیا۔ بچپن سے ہم نے خلافت لائبریری کی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ آپ کو خود مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ فرمایا کرتے تھے خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ اباجی بیمار ہوجاتے تو بیماری سے زیادہ

پریشانی یہ ہوتی کہ مجھے بستر پر لیٹنا پڑے گا۔بعض لوگ دعائیں کرتے کہ اللہ میاں انہیں کچھ نہ ہو۔ ہمارے بچوں کو کون دیکھے گا۔طبیعت میں چُستی اور جفاکشی بہت تھی۔کوٹ امیر شاہ میں زمین تھی۔کوشش یہی ہوتی کہ سائیکل پر ہی جائیں۔اپنے آپ کو کبھی بوڑھا تسلیم نہ کیا۔فرماتے:

’’مَیں کوئی بوڑھوں کی طرح کام کرتا ہوں جو مَیں بوڑھا کہلاؤں‘‘۔

وفات سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے ایک صاحب نے انہیں پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب پچھلے پندرہ سال سے آپ کو اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔آپ کی صحت کا کیا راز ہے؟ فرمایا:

’’کم کھانا اور زیادہ کام کرنا۔‘‘

ہمیں ہر وقت دین پر قائم رہنے کی نصیحت فرماتے۔ ہمارے بچوں کا بھی دھیان رکھتے کہ ہم کس طرح ان کی تربیت اور پرورش کررہی ہیں؟ ان کو نماز کا شوق دلایا ہے یا نہیں۔ میرے بڑے بیٹے مظہر کی عمر جب نماز کے قابل ہوئی تو اکثر اس سے خود نماز پڑھوا کر دیکھی۔قرآن کریم بھی سنتے کہ بچے کس طرح پڑھتے ہیں۔6 اگست 1987ء کو جو وصیت اپنی اولاد کے لئے لکھی اس میں اوّل یہی نصائح لکھیں جو درج ذیل ہیں:

’’نماز، روزہ، زکوٰۃ پر ہمیشہ دلی شوق سے قائم رہو۔نظامِ سلسلہ اور نظام خلافت پر ہمیشہ قائم رہو۔خدمتِ دین یعنی خدمتِ سلسلہ ہمیشہ مدِّنظر رہے۔جہاں موقعہ ملے بشاشت سے حصہ لو۔سلسلہ کی خدمت کے لئے چندہ جات فکر اور شوق سے ادا کرتے رہو۔‘‘

نادرہ اور مجھ سے ناراض رہتے کہ جماعت کے کاموں میں حصہ نہیں لیتیں۔ہم جواب دیتیں کہ بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں ذرا بڑے ہو جائیں تو آپ کو شکایت نہ ہو گی۔رشتہ داروں اور بچوں کے دوستوں وغیرہ سے فیس کے پیسے نہیں لیتے تھے۔اپنے محلہ میں کسی کے گھر مریض دیکھنے جاتے تو فیس کے پیسے نہیں لیتے تھے۔کوئی گھر آجاتا تو دوائی کی قیمت وصول نہ کرتے۔اصرار کرنے پر فرماتے تھے آپ آگئے آپ کی اتنی ہی مہربانی ہے۔ابا جی کو خدا پر بھروسہ تھا۔لالچ بالکل نہ تھا فرمایا کرتے تھے:

''اللہ میاں نے ہر وقت میری ضرورت پوری کی ہے۔''

قناعت کی صفت بہت نمایاں تھی۔ 1974ء کے بعد جب ربوہ میں دوسرے ڈاکٹر صاحبان نے اپنے کلینک شروع کئے تو اکثر ابا جی سے مشورہ کرتے۔ ابا جی نے ہمیشہ انہیں یہی فرمایا:

''مرکز کی بہت برکتیں ہیں۔ بس اللہ کا نام لے کر شروع کر دو۔ رزق خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ میاں سب کو دے گا۔''

اچھا صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ تین مرتبہ اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھتے، دو دفعہ کلینک جاتے اور لباس تبدیل کرتے۔ گھر میں پہننے کا اور سونے کا لباس الگ ہوتا۔ آخری عمر تک طبیعت میں چُستی رہی۔ خوش پوش اور خوش ذوق تھے۔ فرماتے تھے:

''صفائی ایمان کا حصّہ ہے۔''

گھر والوں کے آرام کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اچھا کھانا پسند کرتے تھے۔ لیکن یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ عورت سارا دن باورچی خانہ میں رہے۔ زیادہ تکلّفات میں پڑنے نہیں دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ باورچی خانہ چھوڑیں کوئی دین کا مطالعہ کریں۔ جلسہ سالانہ پر سادہ کھانا خود بھی کھاتے اور مہمانوں کو بھی کھلاتے۔ فرمایا کرتے:

''کھانا پینا تو ساری عمر کا ہے جلسہ تو سال میں ایک دفعہ آتا ہے اس لئے تکلّفات میں وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں'' اور دھیان رکھتے کہ سب گھر والے اور مہمان وقت پر جلسہ سالانہ پر چلے گئے ہیں یا نہیں۔

ہم نے اپنے ابا جی کی جو بھی خدمت کی توفیق پائی اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرے۔ ہم اپنی ماں سے زیادہ ابا جی کے قریب تھے۔ اس کی وجہ بھی ہماری والدہ ہیں کہ انہوں نے ہمارے دل میں ہمارے ابا جی کی محبت وعزت ڈالی۔ مَیں ہر خط ابا جی کے نام لکھا کرتی اور ابا جی بھی کلینک میں پڑھ کر جواب پوسٹ کر کے گھر آجاتے۔ فارغ رہنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ میرے گھر لاہور کبھی ایک رات سے زیادہ نہیں رہے۔ مَیں زیادہ رُکنے کے لئے اصرار کرتی تو فرماتے:

''اگر کوئی کام ہے تو رُک جاؤں۔ فارغ رہ کر کیا کروں گا۔''

عیدالفطر، بقرعید پر مبارکباد کے خطوط لکھتے۔ جب اجتماع اور جلسہ سالانہ ہوتا تو پہلے سے ہی خط لکھنا شروع کر دیتے کہ دعا کر کے تیاری رکھو۔ میری آنکھوں میں ابھی تک اباجی کا وہ پیارا سا مُسکراتا ہوا خوشی و مسرت سے بھرا ہوا چہرہ ہے۔ دِل میں دُکھ کی لہر اٹھتی ہے کہ اب میں اپنے اباجی کو نہ دیکھ سکوں گی۔ وہ شفیق محبت بھرا وجود جنہوں نے ہمیں بے انداز محبت وشفقت دی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے''

ان کی بیٹی نبیلہ رفیق حال ناروے لکھتی ہیں کہ:

''ہمارے اباجی کو نماز باجماعت سے عشق تھا۔ ایک مرتبہ تیز بخار میں تھے نماز پڑھنے مسجد نہ گئے۔ اباجی کی غیر معمولی غیر حاضری دیکھ کر مکرم پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب مرحوم، (جو ہمارے پڑوس میں رہتے تھے اور ایک زمانہ سے ان کے ساتھ ہمارے گھرانے کا عزت اور احترام کا تعلق تھا)، گھر تک آئے اور دروازے پر دستک دی۔ میری عمر اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ میں دروازے پر گئی تو اباجی کا پوچھا، اس وقت اباجی گھر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ اباجی نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یہی میں دریافت کرنے آیا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نماز پر کیوں نہیں آئے۔ بیماری کے متعلق پتہ چلنے پر سلام کہہ کر چلے گئے۔ مَیں نے اندر آ کر اباجی کو بتایا۔ اباجی بار بار گھبرا کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ میری گھر میں نماز پڑھنے کا تو تم نے بتا دیا، مسجد نہ آنے کی وجہ بھی بتائی تھی کہ نہیں۔ پھر امی سے کہنے لگے کہ پروفیسر صاحب میرے متعلق کیا سوچتے ہونگے کہ میں گھر پر کیوں نماز پڑھ رہا ہوں۔

جب میں بیاہ کر نائیجیریا چلی گئی تو ایک خط میں اباجی نے سلام دُعا کے بعد لکھا کہ خوشی کی خبر تمہیں سناؤں کہ ہمارے گھر کے سامنے اور مسجد راجیکی والی سڑک اب پکی ہوگئی ہے۔ بڑی سہولت ہوگئی ہے نماز کے لئے مسجد تک جاتے ہوئے پاؤں گندے نہیں ہوتے۔ مجھے اس وقت

احساس ہوا کہ 1956ء سے ہمارے والدین اس گھر میں رہ رہے ہیں۔ دن میں پانچ نمازیں پڑھنے اباجی مسجد جاتے ہیں۔ آج 1986ء میں ان کا مسجد جانے والا رستہ آسان ہوا ہے، اس سے پہلے تو کبھی اباجی نے رستے کی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ ہر خط میں اباجی مسجد راجیکی کی تعمیر اور ترقی کی بات ضرور کرتے۔ ان کی زندگی میں ان کے بچوں نے نماز کی اتنی اہمیت دیکھی ہے کہ ان کی وفات کے بعد بھی خوابوں میں بھی اباجی کو نماز کی حالت میں ہی دیکھتے رہے ہیں۔ عاجزہ نے اپنے اباجی کو بیسیوں دفعہ خواب میں نماز پڑھتے یا وضو کرتے دیکھا ہے۔

اباجی کو اپنی تربیت اور خدا کے فضل پر پورا بھروسہ تھا۔ اپنے بچوں کی تربیت کی پھر خدا پر توکل بھی پورا کیا۔ ہم سب بہنوں نے جامعہ نصرت سے گریجوایشن کی ہے۔ ہم سب بہنوں کو سکول اور کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پوری اجازت تھی۔ اباجی انتہائی فراغ دلی سے ہر کسی کو بھیجتے۔ کالج کی سابقہ پرنسپل مسز فرخندہ شاہ صاحبہ کے زمانے کی بات ہے کہ پہلی مرتبہ قومی سطح پر موسمِ گرما میں کل پاکستان اسپورٹس پندرہ روزہ کیمپ برائے طالبات لگایا گیا۔ جامعہ نصرت کو بھی دعوت نامہ آیا، مکرمہ مسز شاہ مرحومہ چاہتی تھیں کہ بچیاں جائیں اور کچھ نیا سیکھ کر آئیں۔ بعض والدین سے اجازت لینا بھی ایک مرحلہ تھا، ہماری ایک بہن فاخرہ سعید اس وقت کالج کی بہت اچھی اتھلیٹ تھیں۔ ان کا نام بھی مجوزہ ناموں میں شامل تھا۔ مسز شاہ مرحومہ نے سب سے پہلے ان سے کہا ”فاخرہ تم ڈاکٹر صاحب سے پہلے بات کرو مجھے امید ہے کہ وہ اجازت دے دیں گے، ہوسکتا ہے تمہیں دیکھ کر پھر دوسرے والدین بھی اجازت دے دیں۔“ ہماری بہن کو بھی معلوم تھا کہ اباجی نے کبھی بھی منع نہیں کرنا، لہٰذا اباجی کی اجازت کے بعد دوسری کھلاڑی لڑکیوں کو اجازت مل گئی۔

عاجزہ نے جب پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ہوسٹل میں جا کر رہنا شروع کیا تو چند روز میں ہی عجیب عجیب باتوں کا انکشاف ہونا شروع ہوا۔ مختلف لڑکیوں پر ان کے والدین کی طرف سے بعض پابندیاں دیکھ کر میرے دل نے یہ بات گھڑ لی کہ میرے ماں باپ کو میرا کوئی خیال ہی

نہیں مجھے، کوئی نصیحت ہی نہیں کی۔ چنانچہ جب میں پہلی دفعہ ہوسٹل سے گھر گئی تو اپنے ابا جی سے کہا کہ باقی سب لوگوں کے والدین نے تو اپنی بیٹیوں کو مختلف قسم کی نصائح کے ساتھ بھیجا ہے، آپ نے تو مجھے کوئی نصیحت ہی نہیں کی۔ ابا جی نے یہ بات سن کر میری طرف دیکھا نہ ہی کوئی بات کی۔ جب میں نے دوسری دفعہ بات دُہرائی تو کہنے لگے، دہی اور دودھ الگ سے لگوالو اور روزانہ پیا کرو۔ میں نے پھر اپنا سوال دُہرایا کہ ایسی نصیحت نہیں، کسی بات سے منع کرنے والی نصیحت کریں۔ اب میرے محترم ابا جی نے میری طرف دیکھ کر کہا، میں نے تمہاری بہت تربیت کر دی ہوئی ہے، اب خود سمجھو میرا کام ختم ہو گیا ہے۔''

محترمہ ناصرہ اہلیہ محترم چوہدری رشید احمد صاحب پریس سیکرٹری لندن نے اخبار بدر میں لکھا:

''ابا جان نہایت شفیق، کم گو، نہایت باوقار، بے حد مخلص احمدی، جماعت اور خلافت کے بے حد شیدائی تھے۔ خاندان میں سب آپ کو بڑے بھائی یا ڈاکٹر بھائی کہتے تھے۔ خاندان نے بڑی عزت دی اور آپ نے بھی اپنے بڑے ہونے کا فرض پوری طرح نبھایا۔ الحمد للہ۔ وہ پیارا اور کھنکتا ہوا لہجہ کہاں سے لائیں۔ اب کون پتّر پتّر اور بیٹا بیٹا کہے گا۔ کہاں سے وہ مسکراتا ہوا چہرہ لائیں۔ اپنی جان بھی مسکراتے ہوئے جان آفرین کے سپرد کی۔ چہرے پر عجیب پیاری مسکراہٹ تھی جس کو کیمرے کی آنکھ نے بھی محفوظ کر لیا۔

ایک دفعہ میں لندن سے پاکستان گئی ہوئی تھی۔ یہ غالباً 1972ء کی بات ہے۔ بلوں کی شکل میں ایک کثیر رقم ادا کرنی تھی۔ اور اس وقت ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔ مجھے کہنے لگے پتر گھبرانا نہیں سفر میں دعا کرنا، میرے خدا کا مجھ سے وعدہ ہے کہ جب بھی مجھے کوئی ضرورت پیش آئے گی وہ قادر خدا اسے پوری کرے گا انشاء اللہ۔ اور میں نے اس کی تفسیر ان کی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ دامادوں سے خاص لگاؤ تھا اور ہمیشہ ان کی عزت افزائی کی۔ میرے میاں

چوہدری رشید صاحب کے حصہ میں ان کی شبینہ دعاؤں کا ایک بڑا ذخیرہ آیا۔صرف اس وجہ سے کہ محض خدا کے فضل سے ان کو خدمتِ اسلام کا دن رات موقع مل رہا ہے۔ میں جب بھی کوئی بات رشید صاحب کے متعلق کرتی نہ سُنتے۔رشید صاحب کو لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے۔ان کی ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ جب بھی ان کا کوئی مضمون رسالے میں چھپا یا کوئی کتاب چھپ کر تیار ہوئی سب سے پہلے ابا جان کو پوسٹ کی۔

اپنی وفات سے قبل جلسہ سالانہ یو کے پر آئے ہوئے تھے۔میں حسبِ عادت بچوں سے کھپ رہی تھی۔ مجھے ایک دو دفعہ کہنے لگے کہ پتّر بچے وقت پر نماز نہیں پڑھتے ،دھیان رکھا کرو۔ میں نے غصہ میں کہا: ابا جی کیا میں ہی دھیان رکھا کروں؟ آپ اپنے داماد کو کچھ نہیں کہتے۔مسکرا پڑے اور کہنے لگے:

’’بیٹے تم بہت ناشکری ہو۔تمھیں اس بات کا کیا پتہ کہ وہ کتنا اہم کام کر رہا ہے۔اس کی ضرورت وہاں ہے۔تم بچوں کو سنبھالو اور رشید کو اپنا کام کرنے دو۔‘‘

سلسلہ سے محبت اور شکر گزاری کا عجیب مادہ تھا۔ 23 جولائی کو ربوہ سے لندن آئے۔آتے ہی ایئر پورٹ پر پہلا سوال: ’حضرت صاحب سے ملاقات ہوسکتی ہے کہ نہیں‘۔ہم ہنس پڑے کہ گھر تو پہنچ لیں۔3 بجے گھر پہنچے۔بمشکل ایک گھنٹہ آرام کیا ہوگا کہ رشید صاحب کا مشن ہاؤس سے فون آ گیا کہ حضرت اقدس ایدہ اللہ تعالیٰ سے شام 7 بجے کا وقت لے لیا ہے، تیار رہیں میں لینے آ رہا ہوں۔اس وقت جو ان کو خوشی ہوئی دیکھنے کے لائق تھی۔ 24 تاریخ کو ہم انہیں اسلام آباد لے گئے۔ہم تو اپنے کام میں لگ گئے۔چونکہ ابا جان پہلی دفعہ اسلام آباد میں آئے تھے۔اس لئے تمام جگہ کو گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔جلسہ سالانہ پر والینٹیر کے معائنہ کا وقت آ گیا تھا۔ حضورِ اقدس نے ڈیوٹیاں شروع ہونے سے پہلے خطاب فرمانا تھا۔سب کھلے میدان میں کھڑے تھے۔ مجھے فکر تھی کہ کہیں تھک نہ جائیں۔گھر واپس آنے پر میں نے کہا کہ مجھے تو بہت فکر تھی کہ آپ تھک نہ جائیں۔کہنے لگے ’’میں اتنی دور سے حضرت صاحب کی آواز سننے کے لئے آیا

ہوں۔الحمدللہ۔جمعہ بھی پڑھ لیا،خطبہ بھی سمجھ میں آ گیا،تقریر بھی سن لی، مجھے اور کیا چاہئے۔''

جلسہ سالانہ یوکے کے دوران دوپہر کو کھانا تو اچھا ملتا ہے۔لیکن میں نے اپنے طور پر سوچا کہ ان کو روٹی چبانے میں تکلیف ہوگی۔آپ کے لئے گھر سے کھانا ساتھ لے جاؤں۔بچوں کے لئے بھی تو لے کر جاتے ہیں۔دوپہر کو عزیزم مسرور یا قمران کو کھانا دے دیا کریں گے۔بڑے زور سے کہنے لگے:

''کیوں بیٹا تم کیوں لے جاؤ گی۔جہاں باقی جماعت وہاں میں۔جیسے سب کھائیں گے ویسے میں بھی کھاؤں گا۔''

کھانا لے جانے سے سختی سے انکار کر دیا۔صبح دس بجے دودھ کا ایک گلاس لیتے تھے اس کا بھی انکار کر دیا۔بس زبان پر الحمدللہ کا ورد تھا۔

1978ء میں صلیب کانفرنس پر لندن آئے۔سیر و سیاحت کے بہت شوقین تھے۔رشید صاحب نے بھی جو ممکن ہو سکا ابا جان کو قابلِ دید مقامات کی سیر کروادی۔ایک ایک چیز کو نہایت تفصیل سے دیکھتے تھے۔پھر ہسٹری بتاتے۔مطالعہ بہت وسیع تھا اور تاریخی کتب پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

دعاؤں اور نمازوں کی ہر وقت تاکید کرتے تھے۔میرا چھوٹا بھائی خالد منیر لندن میں دو سال رہا۔ہر خط میں اس کو یہ تاکید ہوتی کہ کوشش کر کے نماز باجماعت ادا کیا کرو۔تمھیں مطالعہ کا شوق نہیں۔تفسیرِ کبیر اور حضرت مسیح موعود کی کتب زیرِ مطالعہ رکھو۔خود جنون کی حد تک مطالعہ کا شوق تھا۔آخری عمر میں شنوائی کچھ کمزور ہوگئی تھی۔کم گو پہلے ہی تھے۔پھر باتیں کرنی بھی بند کر دیں۔بس فارغ وقت میں کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی۔بہت صابر، باوقار اور حوصلہ مند انسان تھے۔بھانجے عزیزم عزیز الحق بابر رامہ کو ساتھ لیا اور گاؤں چلے گئے۔اس کا کہنا ہے کہ گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کو ملے۔اور اسے گاؤں میں پھر کر ایک ایک جگہ دکھائی۔اس طرح خدا تعالیٰ نے یہ احسان فرمایا کہ خاندان کے ہر فردِ بشر سے مل لیا۔''

آپکے بیٹے خالد منیر احمد صاحب کی اپنے والدین کے بارے میں لکھی ہوئی تحریر درج کرتی ہوں:

''سب سے پہلی یاد میری ابا جان سے متعلق یہ ہے کہ سردیوں کی صُبح ہے، ناشتے کا وقت ہے۔ سُورج کی کِرنیں ہمارے مشرقی کمرہ میں سے ہوتی ہوئی اور مشرقی اور مغربی کمرے کے درمیانی دروازہ میں سے گُزر کر مغربی کمرے کے فرش پر پڑ رہی تھیں۔ ابا جان کرسی میز بچھائے پراٹھے کے ساتھ انڈے کا ناشتہ کر رہے تھے اور اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں سامنے بیٹھا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت تو میں بس حیران ہی تھا۔ کُچھ سمجھ سکتا تھا نہ اِظہار کر سکتا تھا۔ بڑا ہُوا تو معلوم ہُوا کہ اُس صُبح حضرت خلیفۃُ المسیح الثانیؓ رحلت فرما گئے تھے اور یہ وہ عظیم سانحہ تھا جس کے سبب ایک باپ اپنے بچے کے سامنے بھی آنسو ضبط نہ کر سکا۔

ابا جی کی زندگی میں ایک مُستقل نظم وضبط تھا جِس میں مَیں نے کبھی دراڑ آتے نہیں دیکھی تھی۔ ہمارے ماموں مکرم مولانا نذیر احمد مُبشر جب افریقہ سے واپس آئے تو ابا جی کے لیئے ایک جیبی گھڑی تحفتاً لے کر آئے تھے جو کہ اُس زمانہ میں بٹن کے کاج میں اُڑس کر جیب میں ڈالی جاتی تھی۔ اُس پر چمکنے والا فاسفورس بھی لگا ہُوا تھا بس اُس کو دیکھتے ہوئے ابا جی ہر کام کرتے تھے۔ تہجد کا وقت ہے، تہجد سے فارغ ہوئے ہیں اور پھر مسجد کی طرف روانہ اور ساتھ ہی ہمیں بھی آنے کا حُکم دیتے جاتے۔ تہجد کی ہمیں مُعافی تھی۔ ہمارے محلّے دارالرحمت شرقی ب کے صدر مکرم چوہدری فضل احمد صاحب کی وفات کے بعد ابا جی محلہ کے صدر اور امامُ الصلوٰۃ تھے۔ نماز سے واپسی پر قرآن کی تلاوت اور تفسیر صغیر یا کبیر کا مُطالعہ کیا، دُودھ کی پیالی پی پھر تقریباً آدھے گھنٹے کے لئے سوئے اور پھر اُٹھنے کے بعد ناشتہ سے فارغ ہو کر پھر لیٹ کر کتاب کا مُطالعہ کرتے (ہر کھانے کے بعد ابا جی آرام ضرور فرماتے تھے کیونکہ انجائنا کی تکلیف تھی اس لئے یہ اُن کے لیئے ضروری تھا) پھر مطب جانے کی تیاری کرتے۔ سکول و کالج کے دنوں میں تو ہم پڑھنے چلے جایا کرتے تھے مگر چھٹی والے دن اچھی طرح یاد ہے کہ ابا جی تقریباً سوا آٹھ بجے کے بعد کلینک کے لئے جایا

کرتے تھے اور یہ اس لیئے یاد ہے کہ جُونہی وہ گھر سے قدم باہر رکھتے ہم بھاگ کر ریڈیو پر آخری ایک دوگانا سُن لیتے کیونکہ یہ پروگرام ساڑھے آٹھ بجے ختم ہوجایا کرتا تھا۔ اباجی کی موجودگی میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی ریڈیو لگا سکے۔ اباجی نے ہمیں کبھی ریڈیو لگانے سے منع نہیں کیا تھا۔ ہم اسے خود ہی شدید بے ادبی سمجھتے تھے اور یہ سارے ربوہ کا ماحول تھا۔ مجال ہے کہ کبھی کسی گھرانے سے ریڈیو کی آواز باہر آجائے۔

کلینک پر بھی زندگی کے کاموں میں ایک ربط تھا۔ ربوہ میں نعمت کدہ اور غالباً شریف ریستوران یہی دو گولبازار کے مشہور چائے خانے تھے۔ میرے ربوہ کے دوست جو کہ اپنے دن کا کافی حصہ ان دو مقامات پر گذارتے تھے بیان کرتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب پُورے دس بجے آتے ہیں اور ریستوران والوں کو پتہ ہوتا ہے کہ دو سموسے اور ایک چائے کی پیالی پیش کرنی ہے۔

مطب پر بھی ہر مریض کا اور روزانہ کا ریکارڈ بڑے ترتیب سے ہوتا بلکہ یہاں تک تھا کہ کونسے مریض کو کونسی دوائی دی گئی تھی۔ اکثر میں نے دیکھا کہ مریض اگر کچھ عرصہ کے بعد آیا تو پہلے پوچھتے کہ پہلے کب آئے تھے۔ لمحوں میں اُسکا ریکارڈ دیکھتے اور پھر دوبارہ صُورتحال کے مُطابق دوائی دیتے۔ فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے کہتے تھے کہ یہ غریبوں کو ناحق لُوٹتی ہیں۔ تربیتِ اولاد دراصل والدین کا طرزِ عمل ہی ہوتا ہے مگر اباجی کے کچھ اصول تھے جن کو اُنہوں نے شاید ایک یا دو دفعہ ہی بتایا ہو گا اُس کے بعد اُن کو اِس بات کی دُہرانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور یہی اُصول اب ہم اپنی اولادوں پر لاگو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۱۔ پڑھو مگر کھیلنا ضرور ہے۔

۲۔ نماز نہیں چھوڑنی چاہیے۔ صبح کی نماز کے بعد میرے لئے ورزش اور قرآن کی تلاوت لازمی تھی۔

۳۔ بازار سے چیز خریدو تو گھر میں ہی آ کر کھاؤ سرِ بازار ہرگز نہیں کھانی چاہیے۔

۴۔ اُدھار سے ہمیشہ اِجتناب کرنا۔

۵۔کلب میں ہرگز نہ جانا (یہ اُن کلبوں کی بات ہے جو کہ اُس وقت کی حیثیت کو اُجاگر کرنے والے ہُوا کرتے تھے اور انگریزوں کی دی ہوئی سوغات تھی)

یہ تو وہ اُصول ہیں جو کہ مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں وگرنہ بہت سی ایسی باتیں ہیں مثلاً ایک دفعہ بہن نبیلہ نے ابا جی سے کسی بات پر مذاق سے کہا کہ ابا جی یہ بات میں کیسے کرسکتی ہوں آخر میں کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد کی بیٹی ہُوں۔تو ابا جی نے کہا کہ:

''بیٹا جو قومیں پدرم سلطان بُود پر یقین رکھتی ہیں تباہ ہوجاتی ہیں۔''

یہی حال ہماری والدہ محترمہ کا تھا اُٹھتے بیٹھتے دعاؤں، استغفار، درود شریف اور دوسری ادعیاء کے پڑھنے کی تلقین کرتی رہتیں۔

یہ 1984ء کی بات ہے میں سویڈن میں گوتھن برگ کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔مکرم مشہود الحق صاحب بھی ساتھ تھے۔اچانک میرے منہ سے ذرا بلند آواز میں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ نکل گیا۔مشہود صاحب چونک کر بولے، آپ کے گھر میں کون با آوازِ بُلند یہ پڑھتا ہے کیونکہ یہ عادت گھر کے بزرگوں سے ہی پڑتی ہے۔میں نے بھی حیرت سے اُن کی طرف دیکھا پھر بتایا کہ امی کی یہ عادت ہے۔

ابا جی کی گھر میں مشاہدہ کی عادت تھی۔زمینوں پر جب بھی جاتے باریک سے باریک چیز بھی مشاہدے میں ہوتی اور اِسی چیز کا مجھے بھی عادی بنایا۔مجھے زمینوں پر بھیج دیتے کہ جاؤ اور دیکھ کر آؤ۔لاکھ کہتا کہ ابھی کچھ دِنوں پہلے ہی گیا تھا کیا کروں گا جا کر،ہنس کر کہتے چکر لگا آؤ دیکھ آؤ اور پھر واپسی پر سوالوں کی بوچھاڑ کہ یہ کیسے تھا وہ کیسے تھا۔اب میری جانے بلا کہ میں نے ان چیزوں پر بھی غور کرنا تھا۔میں امی سے اکثر کہا کرتا تھا کہ ابا جی بڑا تنگ کرتے ہیں تو امی کا ایک ہی جواب ہوتا جو تمہارے ابا جی کہتے ہیں بس کرتے جاؤ۔ایسا کرتے کرتے یہ بات بھی میری زندگی کا حِصہ بن گئی۔اس بات کا مجھے اُسوقت اِدراک ہوا جب میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں پڑھ رہا تھا تو میرے دوست کہا کرتے تھے کہ یار تم اس طرح چیزوں کو دیکھتے ہو جیسے کہ CID والے ہو۔

بچپن میں خاص طور پر گرمیوں کی راتوں کو ابا جی ہمیں کہانیاں سنایا کرتے جو زیادہ تر نبیوں کے بارہ میں ہوا کرتی تھیں۔ اُن دِنوں ربوہ کی آبادی کم تھی ہمارا گھر بھی ربوہ کے کنارے پر تھا۔ ابا جی رات کو بندوق بستر کے نیچے رکھ کر سویا کرتے تھے اور ہم کہانی سُنتے اور بندوق سے کھیلتے کھیلتے سو جاتے۔ اِسی بات سے یاد آیا کہ گرمیوں ہی میں جب مُنجی (دھان) کا موسم ہوتا ابا جی زمینوں پر آبی پرندوں کا بندوق سے شکار کیا کرتے تھے۔ ابا جی اور امی جی دونوں ہی نے ہمیں دین کی ہر وقت تربیت دی مگر وہ مولوی نہیں تھے اُنہوں نے کبھی دین کو مشکل انداز میں پیش یا لاگو نہیں کِیا تھا اور نہ ہی کبھی دین، اخلاقیات یا معاشرے کی اعلیٰ اِقدار کے منافی کوئی بات کرنے کی اجازت دی۔''

مکرم بھائی خالد اختر صاحب بیان کرتے ہیں:

''ابا جی میانوالی ڈسٹرکٹ کے ملازم تھے اور دریا خان میں رہائش تھی۔ وہاں کے کچھ علاقے کلور کوٹ، بھکرّ، موچ اور دیگر قصبہ جات اور دیہات ان کی زیرِ نگرانی تھے۔ وہاں کی زندگی ہمارے لئے سُنہری زمانہ تھا۔ ابا جی کی بادشاہوں جیسی زندگی تھی۔ سارے علاقے میں ہاتھ میں شِفا اور بہادری کی وجہ سے شہرت تھی۔ وزیرستان کے لوگ رات کے اندھیرے میں ہندوؤں پر شب خون مارتے۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ ایسے وقت میں اگر ابا جی کو باہر مریض دیکھنے کی ضرورت پیش آتی تو تنِ تنہا باہر نکل جاتے اور برستی ہوئی گولیوں میں اپنا فرض سرانجام دیتے۔ اس وجہ سے آپ کا نام بہادر ڈاکٹر مشہور ہو گیا تھا۔ میانوالی کے لوگوں نے محبت و عزت افزائی کا خوب حق ادا کیا۔

علاقے کا دورہ کرنے کے لئے آپ کو گھوڑا ملا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ آپ گھوڑے پر سوار تھے کہ گھوڑا اِبدک گیا اور اس نے آپ کو گِرا کر سیدھے گھر کی راہ لی اور آ کر کھونٹے پر کھڑا ہو گیا۔ ابا جی کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی اور آپ لنگڑاتے ہوئے گھر آئے۔ ان دنوں آپ کی طبیعت بھی بہت پُر جوش تھی۔ غصے میں گھوڑے کو باندھ کر مارا۔ یہ جوانی کے زمانے کی طبیعت تھی مگر جب زندگی

وقف کر کے قادیان چلے گئے تو کایا پلٹ گئی۔ دیارِ مسیح کی برکت سے ایسے نرم خُو اور رحم دل ہو گئے کہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی شخصیت ہیں۔''

جب مَیں اباجی کی یادیں اپنے قلم سے محفوظ کر رہی تھی تو مجھے یاد آ رہا تھا کہ مَیں نے بچپن سے اپنے والدین کا اللہ تعالیٰ سے تعلق کا مشاہدہ کیا ہے اگر چہ بچپن میں یہ باتیں سمجھ نہ آتی تھیں مگر یہ شعور ضرور تھا کہ خدا ہے۔ پھر عمر کے ساتھ ساتھ سمجھ آتی گئی۔ اباجی ہر اہم کام کرنے سے پہلے استخارہ کرتے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اباجی کے پاس اراضی تھی جو کہ دسوہہ گاؤں ضلع لائلپور میں تھی۔ آپ کا کام ربوہ میں تھا۔ دل کی بیماری کے باعث بار بار کا سفر آسان بات نہ تھی۔ اباجی نے وہاں باغات لگوائے تھے، خوب پھل اترتا تھا۔ ہم بچپن میں وہاں چھٹیاں گذارنے جایا کرتے تھے۔ اس زرخیز اراضی کو نیل کا مربعہ کہا جاتا تھا۔ انگریزوں کے وقت میں کسان نیل پیدا کرتے تھے۔ جو بدنصیب ان کی مقررہ مقدار پوری نہ کر پاتا اس کا انگوٹھا کاٹ دیا جاتا تھا۔ دسوہہ گاؤں میں احمدیت کی مخالفت تھی۔ جو گھر ہمیں الاٹ ہوا تھا اس کا صحن بڑا تھا جہاں گاؤں کے لوگ باراتیوں کو بٹھاتے تھے۔ اب ان کی یہ سہولت جاتی رہی۔ پھر ایک دن ہماری بیٹھک میں ایک مسافر آ کر ٹھہرا اور قابض ہو گیا۔ گاؤں والوں کو ہماری کسی تکلیف سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اباجی نے یہ حالات دیکھ کر دعا اور استخارہ کے بعد ربوہ کے قریبی علاقے کوٹ امیر شاہ میں زرعی اراضی کا سودا کر لیا۔ تمام عمر یہ زمین ذریعۂ آمد بنی رہی اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور رزق کے انبار سے ہمارا صحن بھرا رہا۔

اباجی خدمتِ خلق میں پیش پیش تھے۔ بہت بچپن کی بات ہے۔ مجھے دھندلا سا یاد ہے۔ قریبی گاؤں سے ایک غریب دیہاتی آ گیا جس کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اباجی نے ساری رات اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا علاج کرنے اور دعا میں گذار دی۔ صبح کو اس کی حالت بہتر ہو گئی۔

گولبازار اپنے کلینک پر کام کے دوران ان کے پاس جدید طبّی سہولیات نہ تھیں۔ اگر کوئی

سیرئس (serious) مریض آجاتا تو صاف ایمانداری سے کہہ دیتے تھے کہ میرے پاس تمام طبی سہولیات موجود نہیں بہتر یہی ہے کہ اسے بڑے ہسپتال میں بھجوادیا جائے۔

بینک سے ملنے والے سود کی رقم استعمال کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ ہماری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ جو کام کہا ہوتا تھا اس کے بارے میں بار بار پوچھتے تھے۔ خاص طور پر شریعت کی پابندی ضرور کرواتے۔

ان کو خبریں سننے کا جنون تھا۔ پاکستان کی خبریں، ہندوستان کی خبریں، بی بی سی کی خبریں اور نہ جانے کون کون سے اسٹیشن ڈھونڈ نکالتے تھے۔ آخری عمر میں شنوائی پر بہت اثر تھا مگر حالاتِ حاضرہ کی خبر رکھنے کے لئے اگر خود نہ سُنا جاتا تو ہماری ڈیوٹی لگادی جاتی کہ فلاں چینل کی خبریں سُن کر مجھے سُناؤ۔

روزے سے ابا جی کو عشق تھا۔ کلینک کو دوپہر کے وقت بند کر کے گرمی ہو یا جاڑا ہر روز مسجد مبارک میں درس سننا ان کا معمول تھا۔ عمر کے آخری کئی برس دل کی شدید تکلیف کی وجہ سے روزوں کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ رمضان نہایت کرب میں گذارتے۔ کبھی بھرائی ہوئی آواز سے دعائیں پڑھتے ہوئے تھوڑی سی سحری کھا کر سُنت پوری کر لیتے۔ آخری سال جب ابا جی کی وفات ہوئی اس رمضان میں طبیعت کافی بہتر ہوگئی اور اللہ کے فضل و کرم سے کئی سالوں کے وقفے کے بعد آپ نے 19 روزے رکھے۔ جب ہمیں معلوم ہوا، ہم نے خوشی سے ابا جی کو مبارک دی تو شدتِ جذبات سے ان کی آواز نہ نکلتی تھی۔ روزہ دار کی ہمیشہ عزت کی۔ نفلی روزے پر اور بھی خوش ہوتے۔ صدقات، افطاریاں کروانا ان کا معمول تھا۔ ابا جی نے 16 سال کی عمر میں نماز تہجد شروع کی اور زندگی کے آخری دن تک نہایت التزام سے تہجد پڑھتے رہے۔ ظہر اور عصر کی نماز مسجد مہدی میں ادا کرتے اور اپنے شاگردوں، کمپاؤنڈروں وغیرہ کو بھی تاکید سے نماز پر لے کر جاتے۔ ان کی تربیت کی ذمّہ داری اپنی اولاد کی طرح ہی سمجھتے۔ سورج گرہن کے وقت بھی مسجد راجیکی میں نوافل پڑھتے رہے۔ مَیں نے ابا جی کو کئی مرتبہ بہت بیمار دیکھا ہے مگر نماز

چھوڑتے کبھی نہیں دیکھا۔ عام طور پر بیماری کی حالت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ نماز خوب سنوار کر پڑھتے اور درد والحاح سے دعائیں کیا کرتے۔ رمضان میں باقی نمازوں کے علاوہ صلوٰۃ التسبیح بھی ادا کرتے۔

اپنی اولاد کو نماز سکھانے میں ہمارے ابا جی کا بہت ہاتھ ہے۔ یہ ان کے اَن گنت احسانات میں سے ایک ہے جس پر ہماری ساری زندگی کی بنیاد ہے۔ مجھے قطعاً یاد نہیں کہ میں نے کس عمر میں نماز شروع کی۔ بس اتنا ہی یاد ہے کہ ابا جی ہر روز شام کو گھر آتے۔ اور ہمیں بلا کر نماز کے بارے میں پوچھتے۔ پھر اپنے سامنے سارے دن کی قضا شدہ نمازیں پڑھواتے۔ بھائی کو بھی ساتھ لے کر مسجد جاتے۔ ہمیں صبح سویرے جگانا، فجر کی نماز پڑھانا، قرآن سننا ابا جی کا معمول تھا۔ صرف نماز ہی نہیں بلکہ پہاڑے، دعائیں، دینی معلومات وغیرہ بھی ابا جی نے ہی ہمیں سکھائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے والدین کی نیکیوں کا ورثہ ہمیں عطا فرمائے، ان کو اپنے محبوب بندوں میں شامل کرے، اپنی رضا کی جنتیں عطا کرے اور ان کی نسلوں کو ہدایت پر قائم رکھے۔

اولاد کو چستی کی عادت ڈالی۔ گھر میں بھی فوجی عادات رکھتے تھے۔ ہم بچوں کو بارہ ٹہنی، لڈو وغیرہ بیٹھ کر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہماری غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم بھی ہر انعام، سکول میں ہونے والی ہر سرگرمی ابا جی کو آ کر بتاتے (حالانکہ تقریر امی لکھ کر دیتیں اور طریقہ بھی بتاتیں)۔ وہ ہمارے انعاموں کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کرتے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم ہر میدان میں آگے نکلیں۔ محنت امی کی ہوتی تھی مگر اظہارِ محبت اور دعا ابا جی کے ذمہ تھا۔

یہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم اور والدین کی دعاؤں اور خاص توجہ و محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ عاجزہ جامعہ نصرت ربوہ کے لئے دو ایسی ٹرافیاں لے کر آئی جو پہلے کبھی نہ آئیں تھیں۔ ایک ٹرافی پنجابی مباحثے میں دوسری حسن قرأت میں۔ اس وقت میرے والدین خدا تعالیٰ کی حمد کے گیت گا رہے تھے۔

پاکستان میں ناصرات الاحمدیہ اور لجنہ اماء اللہ کا اجتماع ماہ اکتوبر میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن ابا جی کو گرمیوں کی چھٹیوں میں ہی فکر لاحق ہو جاتی تھی اور ہمیں تاکیداً کہا کرتے تھے اپنی تقاریر ابھی

سے تیار کر لو۔ پھر یہی نہیں جب ہم تقریروں کی مشق کر رہی ہوتیں تو چھپ کر سنتے اور بعد میں غلطیاں درست کرتے۔

ابا جی لائبریری سے انگریزی کی کتابیں لاتے۔ یوں ہر روز ہم ایک نئی دلچسپ کہانی سنتے۔ جماعت کی کتب ان کی گہری دوست تھیں۔ جماعت کا تقریباً ہر رسالہ ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ ان کا قلم نہایت تیز چلتا۔ اپنی کتابوں پر اور قرآن کریم پر یادداشت کے طور پر جگہ جگہ نوٹس لکھتے۔ ہمارے پاس خطوط کی صورت میں ان کی پیاری تحریریں موجود ہیں مَیں نے کئی سال ابا جی کو متواتر ہر ہفتے خط لکھا اور ان کا بھی مجھے ہر ہفتہ جوابی خط ملا۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کے بھیجے ہوئے دو خط مجھے موصول ہوئے۔

مسجد راجیکی کی تعمیر کے لئے مساعی

ہمارے محلہ دارالرحمت شرقی ب میں مسجد نہ تھی جبکہ دارالرحمت شرقی الف میں مسجد تھی۔ آبادی زیادہ ہونے کے باعث جگہ تنگ ہونے پر یہ سوچا گیا کہ اپنے حلقے میں بھی مسجد بنالی جائے چنانچہ آپ نے اپنی مساعی تیز کر دی۔ محلّے میں بھی تحریک کی۔ چندہ لینے کے لئے بعض احباب کی دہلیز پر بیٹھ جاتے اور لے کر ہی اُٹھتے۔ لوگوں کی قلیل آمدنی تھی۔ کسی نے مشکل سے سو روپیہ دیا۔ کسی کو صرف دو روپے دینے کی ہی توفیق مِل سکی۔ پھر ابا جی نے اپنے سارے بچوں کو خط لکھا۔ بیٹے اور کئی داماد بیرون ملک میں رہتے تھے۔ بیٹوں اور دامادوں سے کثیر رقم اکٹھی کی۔ نیز اپنی طرف سے بھی ایک خطیر رقم دی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسجد تیار ہو گئی۔ پھر اس کا نام اپنے محسن بزرگ مولانا راجیکی کے نام پر رکھا۔ گھر کے نزدیک ہی مسجد اقصیٰ تھی۔ جو سوائے جمعہ اور رمضان کے سارا سال غیر آباد رہتی۔ ابا جی کو یہ بات بہت گراں گذرتی۔ ان کی بار بار کی تلقین سے مسجد اقصیٰ میں اذان اور نماز شروع ہو گئی۔ الحمدللہ۔

جماعت کی غیرت اور اس کے ادب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ ایک دفعہ ہمارے ہاں ایک رشتہ آیا

جس کا گھرانہ ہندومت کو چھوڑ کر احمدی ہوا تھا۔ہم ابا جی کے ساتھ بے تکلف باتیں کیا کرتے تھے اس لئے مَیں نے صاف کہہ دیا کہ ان کی رگوں میں ہندو خون ہے۔ابا جی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں نہایت غصے اور درشتی سے بولے ''اس نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت کی ہے۔ یاد رکھو وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا غلام ہے۔'' لوگ کیسا بھی دھوکہ دے جاتے مگر ابا جی احمدیت کے ناطے احبابِ جماعت پر بہت حسن ظن رکھتے۔تبلیغ کی خاطر اپنے غیراز جماعت عزیزوں کو آبائی گاؤں میں الفضل لگوا کر دی۔تبلیغ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔اپنی زمینوں پر نماز کے لئے چبوترہ بنایا اور چار دیواری ڈال کر جائے نماز بچھوایا۔

ہر ہر قدم پر ہمیں دعا کی تحریک کرتے۔جب بھی گھر میں داخل ہوئے نہایت خوشی سے بلند آواز سے السلام علیکم کہا پھر سورۃ الاخلاص پڑھی اور ہمیں یہ حدیث یاد دلائی کہ اس سورۃ کے پڑھنے سے گھر میں برکت پڑتی ہے۔ہم نے ہر روز ابا جی کو بلند آواز سے تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ ایک خوبی ان میں یہ بھی تھی کہ ہر روز قرآن پڑھنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے۔قرآن پڑھتے ہوئے نوٹس لکھتے رہتے۔اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے دعائیں پڑھتے دیکھا۔ہم بچوں سے سرگوشی میں کہا کرتے ''میرے لیے دعا کیا کرو'' مجھے جگاتے ہوئے دعا پڑھ پڑھ کر پھونکتے جاتے۔ہم چونکہ ان کی چھوٹی اولاد تھے۔ہم نے ان کو بیمار اور کمزور دیکھا اگرچہ وہ اپنی جفاکشی کے صدقے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آخری دن تک کام کرتے رہے۔مَیں ان کی ٹانگیں دبایا کرتی تھی۔جتنی دیر میں ان کو دباتی میرے لئے دعا کرتے رہتے یہاں تک کہ ان کو نیند آ لیتی۔جب طبیعت خراب ہوتی تو مجھے کہا کرتے۔سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ۔ پڑھ کر مجھ پر پھونکو۔دراصل اس طرح پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا الہام یاد دلاتے۔اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی تھی کہ جب ایک مرتبہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سخت بیمار ہو گئے اور بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو آپ کو یہ دعا الہاماً سکھائی گئی اور اسی دعا کا ورد شفاء کا باعث ہوا۔ہمارا بچپنا تھا۔ہماری لاپرواہیوں پر خوب نظر رہتی تھی۔ایک دفعہ

نصیحت کرتے۔ دوسری دفعہ نصیحت دہراتے۔ اگلے دن پھر پاس بٹھا کر کان میں پوچھا کرتے آج کیا دعا کی تھی؟ خاص طور پر بچوں کو تاکید کرتے اپنے نفس سے بچنے کی دعا کرو نیکی اور تقوی ملنے کی دعا کرو۔ دوسروں کے لئے سخی دل ہو کر دعا کرو۔ الغرض دنیا جہان کی دعائیں کرنے کی تلقین کرتے۔ ہمارا کوئی مقابلہ ہوتا یا امتحان ہوتا تو ہم اباجی کو درخواست دعا کرتے وہ بے چارے اسی وقت ہی دعا شروع کر دیتے۔ اور جب تک ہم گھر آ کر ان کو کامیابی کی اطلاع نہ کر دیتے دعا سے غافل نہ ہوتے۔ دعا کے حوالے سے ایک بات ذہن کو بہت جھنجھوڑتی ہے۔ کوٹ امیر شاہ میں زرعی اراضی تھی۔ اس تک جانے کا راستہ اسوقت ایک درّہ نما اونچا پہاڑی راستہ تھا۔ ڈھور ڈنگر یا انسان بھی بمشکل چڑھتے تھے۔ تانگہ یا گاڑی جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ امی کو ہائی بلڈ پریشر تھا اور اباجی دل کے مریض تھے۔ چڑھائی کافی زیادہ تھی۔ زرعی زمین پر اکثر جانا ہوتا۔ میرے والدین آہستہ آہستہ چڑھتے اور دعائیں کرتے جاتے کہ کاش یہ درّہ کچھ نیچا ہو جائے ہمیں بھی دعا کی خاص تلقین کرتے۔ ہم کھلکھلا کر ہنستے۔ لو جی ایک دعا کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ بس خدا ہی جانتا ہے کہ میرے والدین نے اس درّے پر کھڑے ہو کر کتنی دفعہ اللہ کے حضور ہاتھ اٹھائے ہونگے۔ یہ سلسلہ سالوں پر محیط تھا۔ اپنی نسلوں کے لئے زیتون لگانے والے بڈھے کی طرح۔ آج احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنے والدین کی دعاؤں کے زیتون کس کس انداز سے کھا رہے ہیں ان کی دعاؤں کا فیض غیر بھی پا رہے ہیں۔ اب راستے آسان ہو گئے ہیں۔ تانگہ یا رکشہ لو اور چند منٹ میں جا پہنچو۔ مگر اس درّے پر کھڑے ہو کر اب بھی دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے۔ وہ ٹیلہ نما پہاڑی رستہ یاد کرتی ہوں تو اپنے والدین کی تکلیف یاد آتی ہے۔ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کی دعائیں قبول فرمائے، آمین۔

گھر میں کام کرنے والوں کا بہت خیال رکھتے۔ دھوبی، جمعدار، خادمہ، مزارعین اور دوسرے خدمت گذاروں کا نہ صرف بہت خیال رکھتے بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ انداز میں بے تکلف باتیں کرتے۔ پھر نہ صرف ان کا مفت علاج کرتے بلکہ ان کی ممکنہ مالی مدد بھی کرتے۔

سلسلہ کے بزرگوں سے محبت

قبولیّتِ دُعا کے نظّارے اور اباجی کی درازیٔ عمر

اباجی کو خاندانِ حضرت مسیح موعود علیہ السلام، خلیفۂ وقت، مبلغّین، بزرگ اقرباء اور سلسلہ کے دوسرے بزرگان سے دلی محبت تھی۔ ہر بزرگ سے نہایت محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے اور ان سے کبھی فیس وصول نہ کرتے۔ ان سب کو دعا کے لئے عریضے لکھتے اور ان کی مختلف طور سے خدمت بجالاتے۔ ان سب محسنوں نے بھی دعا کے ذریعہ آپ کو یادرکھا۔ فجز اھم اللہ احسن الجزاء

آپ کو مختلف عوارض نے گھیرے رکھا۔ جوانی میں بائیں ٹانگ پر فالج ہو گیا اور کچھ عرصہ بستر پر پڑے رہے۔ 1952ء میں دل کا شدید حملہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور ہمارے بزرگوں کی دعاؤں سے زندگی بچ رہی۔ پھر 1958ء میں دوبارہ دل کا شدید حملہ ہوا۔ اس وقت ہم سات بہنیں تھیں۔ امی کو اباجی کی صحت کی بہت فکر تھی۔ وہ خلیفۂ وقت اور جماعت کے دوسرے بزرگوں کو تواتر سے اباجی کی صحت کے بارے میں اطلاع دیتی رہیں اور درخواستِ دعا کرتی رہیں۔

سلسلہ کے بعض بزرگوں کی پُرسوز دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے بندوں کو اباجی کی عمر بڑھائے جانے کی خوشخبری دی۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ امی حضرت مولوی راجیکی صاحب کے پاس دعا کے لئے گئیں۔ باقی حال امی کی زبانی سُنئے۔ فرماتی ہیں:

''ایک دن مَیں حضرت مولوی راجیکی صاحب کے پاس گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی صحت خراب تھی۔ مَیں بہت گھبراہٹ و بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ مَیں نے نہایت عاجزی سے کہا کہ میرے میاں کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کیجئے''

فرمانے لگے:

''گھبراؤنہیں میں خوداسی فکر میں ہوں ۔تمہاری بچیاں اورتم ہر وقت میری آنکھوں کے آگے ہی رہتی ہو۔ مَیں ڈاکٹر صاحب کی درازی عمر کے لئے دعا کرتا ہوں ۔ مجھے جب تمہارا خیال آتا ہے کہ میری بیٹی کی چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں اور لڑکا بھی کوئی نہیں تو میرے دل سے بے اختیار دعا نکلتی ہے۔ مَیں دعا کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معروض ہوں کہ وہ مجھ ناچیز کی دعا سُن لے۔دیکھیں کب باریابی ہوتی ہے۔''

جب مَیں دوبارہ حاضر خدمت ہوئی تو فرمانے لگے:

''مَیں تمہاری خاطر اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا رہا۔لومبارک ہو۔ مجھے خدا تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔مَیں صبح کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعائیہ الفاظ دہرارہا تھا۔ چھاج پھٹکنے کی آواز آرہی تھی ۔یعنی دانے چھٹنے کی آواز چھاج سے نکل رہی تھی اور یہ سنائی دے رہا تھا:''بارہ چھک بہتّر، بارہ چھک بہتّر''(یعنی بارہ ضرب چھ۔بہتر۔بارہ ضرب چھ۔بہتر)''

اورآپ بار بار اسے دہرانے لگے۔اسی اثناء میں میرے ہاں ساتویں لڑکی بھی پیدا ہو چکی تھی۔خدا نے انسان کو حریص بنایا ہے مَیں نے حساب لگا کر عرض کیا کہ تمام بچیوں کی شادیوں تک تو عمر تھوڑی ہے۔فرمانے لگے:''(سدھینے) پگلی، پُتر۔اتنی تو لے پھر اور مانگ لیں گے۔'' اس دوران ڈاکٹر صاحب پر بہت سی اور بیماریوں نے حملے کیے۔قارئین اندازہ لگایئے۔ڈاکٹر صاحب اس وقت بہت بیمار تھے اوراس وقت میرے لئے ڈاکٹر صاحب کی زندگی 72 ہفتے تو کُجا 72 دن بھی بہت بڑی غنیمت تھی۔کہاں اس محسن بزرگ کی دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالی کے فضلوں سے 72 سال کی زندگی کی اتنی بڑی خوشخبری ملی۔''

وقت گذرتا رہا۔اباجی کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی۔اس دوران اللہ تعالیٰ نے ہمارے والدین کو اولادِ نرینہ سے نوازا یعنی میرا بھائی خالد منیر احمد پیدا ہو گیا۔جس کی آمد پر ان بزرگوں نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ابھی چند سال ہی گذرنے پائے تھے کہ حضرت مولوی راجیکی صاحب اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔اتنے میں وہ وقت یعنی 72 سال کا عرصہ قریب آرہا

تھا۔ہم میں سے چند بہن بھائی ابھی کم سن تھے۔قدرتی امر تھا کہ امی بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔انہی دنوں امی کو ایک خاتون نے مولوی عبداللطیف بہاولپوری کا پتہ بتایا۔ چنانچہ دعا کی درخواست لے کر آپ ان کے ہاں جا پہنچیں۔آگے کا حال امی کی زبانی سُنیئے۔وہ فرماتی ہیں:

''جب ڈاکٹر صاحب کی عمر 71 برس کی ہوئی تو میرا اضطراب اور بھی بڑھنے لگا۔ مَیں ایک شام حضرت مولوی عبدالطیف صاحبؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ڈاکٹر صاحب کی بیماری کے سارے واقعات اور ان کی عمر کے متعلق حضرت مولوی راجیکی صاحبؓ کا الہام یعنی سب کچھ بتا یا اور عرض کیا کہ اس وقت صرف آپ بزرگ ہیں اور وہ بھی حضرت مولوی راجیکی صاحبؓ کے پڑوس میں بستے ہیں۔حضرت مولوی صاحبؓ نے میرے ساتھ اس وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ اتنی عمر تو لو، اور مانگ لیں گے۔اب 71 برس گذر چکے ہیں صرف ایک برس باقی ہے۔ابھی بچوں کی ذمہ داریاں خصوصاً تین لڑکیوں کی شادیاں باقی ہیں۔اب آپ ان کی جگہ ان کا وعدہ پورا کریں اور میرے میاں کی زندگی مانگیں۔جس طرح آپ کے بزرگ بھائی نے دعا کی تھی آپ بھی ان کی پیروی کریں۔ چنانچہ جس محبت اور اخلاص سے بزرگ اوّل نے بارگاہِ ربّ العزّت میں دعا کی تھی اسی طرح بزرگ ثانی نے بھی اپنے مولا سے اس عاجزہ کے لئے دعا کی اور میری درخواست پر اللہ تعالیٰ سے میرے میاں کی لمبی عمر ہونے کی دعا کی تمنا کی۔اللہ تعالیٰ جو کہ رحیم وکریم ہے اور سمیع ومجیب ہے۔اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور کوئی چیز اس کے لئے انہونی نہیں۔قادرِ مطلق کا ارشاد کُن ہوتا ہے تو وہ فیکون ہو جاتا ہے۔حَی وقیُّوم سے زندگی کی بھیک مانگی تو اس نے جھولی خالی نہ لوٹائی۔بس مانگنے والے کو دربارِ الٰہی تک پہنچنے کے آداب سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ ولی اللہ تو ایک رات میں بارگاہِ ایزدی میں جگہ پا جاتے ہیں۔ہم جیسے گنہگار سوچتے ہی رہتے ہیں۔اگلے دن حضرت مولوی عبداللطیف صاحبؓ مرحوم ومغفور نے دعا کے بعد اللہ تعالیٰ سے خبر پا

کرمندرجہ ذیل نوازش نامہ رقم فرمایا اور ابا جی کو بھیجا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت جناب ڈاکٹر بشیر احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترمہ ہمشیرہ صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ آج کل حضرت مولوی راجیکی صاحب کے ایک انکشاف کی وجہ سے جوان کو آپ کی عمر کے متعلق ہوا جس کی بناء پر آپ کی عمر بہتر سال سمجھی جانے لگی اور یہ عمر قریب الاختتام ہے جس کی وجہ سے آپ کے دل پر غم وہموم کا سایہ ہے۔ یہ خبر سن کر آپ کے متعلق میرے دل پر گہرا صدمہ ہوا۔ اور بارگاہ الٰہی میں آپ کے رفع ہموم کے متعلق دعائیں کیں۔ الٰہی تیری شان تو رحمان اور رحیمیت کی ہے۔ اور تیری یہ سنت ہے کہ ایسے آسمانی انکشاف سے تُو اپنے بندوں کے دلوں کو غم میں مبتلا نہیں کرتا۔ اے اللہ آپ نے پانچ چیزوں کا غیب کا علم اپنے پاس رکھا ہے۔ ان میں سے ایک موت کی گھڑی ہے۔ تو پھر ایسے انکشاف سے ان کو کیوں غم میں مبتلا کر دیا ہے۔ اپنے فضل وکرم کی بادِ صبا سے ان کے غم وہموم کو دور فرما اور مبشرات کی تبشیری دعاؤں سے حزین دلوں پر موسم شفاء کا سایہ رکھتے ہوئے آسمانی بشارت کی نوازش فرما تا کہ غم وہموم دلوں کو تسلی دلا سکوں۔ بارگاہ الٰہی میں التجائیں کیں۔ قربان جاؤں اس ذات ارحم الراحمین پر جو عاجزوں و گناہگاروں کی دعاؤں کو بھی پایہ قبولیت بخشتا ہے۔ آپ کے حسن ظن کے طفیل آپ کے متعلق مجھ پر بھی آسمانی ترشح ہو کر آپ کو تسلی دلانے کا سامان غیب سے پیدا فرما دیا۔ اور مجھے القاء ہوا ''بضع سنین'' جس میں بشارت ہے اور جس میں تسلی دلائی گئی ہے کہ آپ کی عمر بہتر سال پر ختم نہیں۔ نہ سمجھیں۔ بلکہ حضرت مولانا راجیکی صاحبؓ کے انکشاف کا مطلب یہ سمجھتے ہوئے کہ آپ اپنی عمر میں بہتر سال کا زمانہ پائیں گے اور بضع سنین کے لفظ میں یہ خوشخبری ہے کہ بہتر سال کے بعد بھی آپ اپنی زندگی کا سفر جاری رکھیں گے۔ کیونکہ بضع کا لفظ تین سال

سے لے کر نو سال پر دال ہے۔ سورۃ الروم کے نزول پر بھی جب غلبۂ روم کی خبر بضع سنین سے دی گئی تو جوش مسرت میں آ کر حضرت ابوبکرؓ نے کفار سے اس پیشگوئی کے ظہور کی تین سال کی مدت مقرر کر کے شرط انعام باندھ لیا۔ اور حضور ﷺ کو آ کر اس کی اطلاع دی تو حضور نے فرمایا کہ تین سال ٹھیک نہیں بضع کا لفظ تو نو سال تک کی خبر دیتا ہے، جاؤ یہ مدت نو سال کر کے رقم انعام بھی بڑھاؤ۔ پس اس بناء پر میں بھی آج کی خوشخبری سناتا ہوں کہ اپنی عمر کو بہتر سال پر ختم نہ سمجھیں۔ بلکہ بضع سنین کے تحت اپنی عمر کے لمحات حیات قرار دیں۔ اور میں آپ کو ایک مشورہ بھی پیش کرتا ہوں کہ نیکیوں اور نفع خلائق سے عمر بڑھتی ہے۔ اور ارشاد الٰہی کے مطابق نافع خلائق وجودوں کو دیر تک اللہ تعالیٰ زندہ رکھتا ہے۔ آپ بھی چونکہ ڈاکٹری کی بناء پر خلق خدا کو نفع پہنچا رہے ہیں میری یہ گذارش ہے کہ آپ اپنے دل میں یہ عہد باندھ لیں کہ کسی نادار مریض کو جو زندگی سے مایوس ہو چکا ہو۔ اس کا علاج مفت فرمائیں گے۔ اور نہایت ہی تندہی سے اس کی جان بچانے کی کوشش کریں گے۔ شاید اس نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کی عمر بڑھا دے۔ اس کا ارشاد ہے **وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا** ط (المائدہ:33) ایک شخص کی جان بچانے کا بہت بڑا اجر ملتا ہے گویا اس نے تمام جہان کے لوگوں کی جان بچائی۔ اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلے میں آپ پر اپنی جمالی تجلیات فرمائے۔

والسلام

خاکسار عبدالطیف بہاولپوری''

اس خط کے بعد ہمیں اتنا یقین تھا کہ جب بھی اباجی کو دل کی تکلیف ہوتی ہم کہتے ابھی تو کافی عمر پڑی ہے۔ خدا اپنے پیارے کی بات پوری کرے گا اور واقعی اللہ تعالیٰ نے ان کی لاج رکھی پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اباجی کو مزید 9 برس عمر عطا کی۔ جس طرح خدا کے اس بندے نے کہا تھا وہ پورا ہوا۔ اباجی خدا کے فضل و کرم سے 81 برس زندہ رہ کر فوت ہوئے۔

ایک اور بزرگ، جن کے ساتھ اباجی کا گہرا تعلق تھا، محترم شہزادہ صاحب تھے جو نہایت

نیک اور دعا گو بزرگ تھے۔ اباجی ان کو اکثر دعا کے لئے کہتے تھے ان کو اباجی کے بارے میں چند الہامات ہوئے جو درج ذیل ہیں:

1۔ڈاکٹر صاحب پر خاص فضل ہونے والے ہیں جو ان کے وہم وگمان میں نہیں ہے۔

2۔زرّیں زندگی سے نوازا جائے گا۔ ہر تلخ زندگی سے بچایا جائیگا۔

3۔برکتوں کے ساتھ اس جہاں میں بھی بلند کیا جائے گا اور اُس جہان میں برکتوں کے ساتھ بلند کیا جائے گا (وقت صبح 4.30۔8 فروری 1979ء)

مسجد بشارت سپین کے سنگِ بنیاد کی تقریب میں ان کو شامل ہونے کا موقعہ ملا تو واپس آ کر انہوں نے سپین کے سفر کے بارے میں ایک مضمون لکھا جس میں ان کے گہرے مشاہدے کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ مضمون روزنامہ الفضل ربوہ میں چھپ چُکا ہے اور یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ایک خوبصورت مُلک کا سفر

ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے

سپین کی طرزِ معاشرت اور تہذیب کا جائزہ

مکرم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد ایم۔سی۔ ربوہ (روزنامہ الفضل ربوہ مورخہ 2 فروری 1982ء)

مسجد بشارت سپین کے افتتاح کی تقریب کی دعاؤں میں شمولیت کے لئے ہم بعض دوست سپین گئے تھے۔ مُلکی حالات معلوم کرنے کا ہمارے پاس وقت نہیں تھا، صرف آٹھ دن کا سفر تھا۔ ان میں سے دو دن آنے جانے میں تین دن قرطبہ سے مسجد بشارت پیدروآباد آنے جانے میں صرف ہوئے اور صرف تین دن قرطبہ اور اس کے مضافات سیوا لکا (savilca) اور غرناطہ دیکھنے جا سکے۔ یہ دیکھنا بھی بالکل سرسری تھا۔ جو بات لوکل لوگوں سے دریافت کرنی ہوتی صرف اشاروں سے۔ کوئی گائیڈ یا گائیڈ بُک نہ مِل سکی۔ بہرحال جو کچھ مَیں سمجھ سکا۔ احباب کی تشنگی کم کرنے کے لئے عرض کر دیتا ہوں۔

جب سے سپین کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوا ہے دل میں کسک سی اُٹھتی رہی ہے کہ کوئی موقع سپین دیکھنے کا اللہ تعالیٰ پیدا فرما دے۔ سو ایسا موقع اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے پیدا فرما دیا۔ مسجد بشارت کے افتتاح کی تقریب پیدا ہوئی۔ جوں جوں تقریب کی تاریخ قریب آتی گئی اپنی کمزور صحت کے پیشِ نظر طبیعت ڈانواں ڈول رہی۔ آخر میرے گھر والوں اور بچوں نے میری ہمت بندھائی۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ارادہ پُختہ کر لیا۔ فارن ایکسچینج کے لئے سٹیٹ بینک نے روڑہ اٹکا دیا۔ قِصہ یوں ہوا کہ کوئی ''بشیر احمد'' بلیک لسٹ میں ہے۔ پوری تفتیش تین دن ہوتی رہی۔ آخر مَیں نے خود جا کر حلفی بیان دیا۔ کچھ میری کمزوری اور معمر صورت کا بھی شائد تفتیشی افسر کو لحاظ آیا۔ اور ڈالرز خریدنے کی منظوری مِل گئی۔ الحمدللہ۔

ویزا کی مشکلات کا سُن رہے تھے۔ اسلام آباد پہنچ کر سچ ثابت ہوا۔ سپینش ایمبیسی والے ویزا کے لئے کوئی عذر نہ رکھتے ہوئے بھی عذر پر عذر کئے جا رہے تھے کہ وہاں پر خوراک کی کمی ہے۔ رہائش کا انتظام اتنے آدمیوں کا مشکل ہوگا۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس میں ذرا بھر بھی حقیقت نہ تھی۔ جبکہ اڑھائی کروڑ زائرین ہر سال سپین دیکھنے کے لئے یورپ امریکہ وغیرہ ممالک سے آتے رہتے ہیں۔ ہم تو صرف تین ہزار ہی جمع ہو سکے۔ اور وہ بھی صرف 10-12 دن کے لئے۔ بالآخر بعض مشکلات سے گذر کر خاکسار کو ویزا مِل گیا۔ اور خاکسار پاکستان سے لندن پہنچ گیا۔ لندن سے سپین کے لئے ہوائی جہاز میں سیٹ بُک کرانے کے لئے کچھ پس و پیش کا اظہار ہوا کہ جہاز میں سیٹ نہیں ہے لیکن جب جہاز روانہ ہوا تو آدھا خالی تھا۔

سپین میں تبلیغ

سپین کے ملاگا ایئرپورٹ پر جب پاسپورٹ چیک کرانے کے لئے قطار میں کھڑے ہوئے۔ میرے ہاتھ میں کچھ انگریزی ٹریکٹ تھے۔ ایک سپینش غور سے دیکھنے لگا، مَیں سمجھ گیا کہ یہ صاحب انگریزی جانتے ہیں۔ جھٹ ان کی خدمت میں ٹریکٹ پیش کیا۔ تو انہوں نے بڑی خوشی سے قبول کیا اور پیدروآباد مسجد بشارت، جماعت احمدیہ اور اسلام کے بارے میں موٹے موٹے عقائد بیان کئے۔ قریباً سارے ہی لوگ متوجہ ہوئے اور انگریزی سمجھنے والے صاحب ان کو کچھ کچھ میری بیان کردہ باتوں کا ترجمہ سناتے رہے۔ سب لوگ مسکراتے رہے۔ سب لوگ مسکراتے چہروں کے ساتھ میری باتیں سُن رہے تھے۔ اسی طرح قرطبہ میں جہاں بھی ہم گئے۔ اور جس کو لٹریچر دیا خوشی سے قبول کیا گیا۔ لوگ مطالعہ کا وعدہ کرتے رہے۔ اشاروں سے جو کچھ ہم سمجھا سکتے تھے سمجھاتے رہے۔

ٹیکسی ڈرائیور کی مہربانی

ملاگا سے ایک ٹیکسی 40 پونڈ میں ہم نے کرایہ پر لی۔ جس میں خاکسار کے علاوہ مکرم چوہدری

انوارالحق صاحب ،مکرم عطاء المجیب صاحب مبلغ جاپان اور ایک جاپانی دوست مکرم عبد الحفیظ صاحب سوار ہوکر رات بارہ بجے قرطبہ پہنچے۔ٹیکسی والا باوجود سمجھانے کے صحیح ایڈریس پر نہ پہنچ سکا اور قریباً آٹھ میل قرطبہ سے آگے نکل گیا۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ سے مشن فون کیا تو حکم ملا کہ مولوی عطاء المجیب صاحب اور جاپانی دوست عبدالحفیظ صاحب وہیں ٹھہر جائیں اور خاکسار اور چوہدری انوارالحق صاحب مشن پہنچ جائیں۔ چنانچہ اسی ٹیکسی میں واپس ہوئے۔ٹیکسی ڈرائیور نے ایک دوسرے ٹیکسی ڈرائیور سے احمدیہ مشن کا راستہ پوچھا۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور خود ہی ہماری رہنمائی کرتا ہمارے آگے آگے چل دیا اور مشن پہنچا کر رخصت ہوگیا۔اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے۔آمین۔

مشن ہاؤس میں مکرم مولوی کرم الٰہی صاحب ظفر تو موجود نہ تھے۔ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی کار میں،جس کو ان کی صاحبزادی صاحبہ نے ڈرائیو کیا،ہمیں ہمارے ہوٹل میں جہاں ہماری سیٹ ریزروتھی پہنچادیا۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے احسن عطا فرمائے۔صبح دوبارہ مشن جانے کے لئے تیار ہوئے۔بس سٹاپ پر کھڑے لوگوں سے مشن ہاؤس کا راستہ پوچھتے،کسی کو کچھ سمجھ نہ آتا۔آخر ایک بس پر ایک صاحب نے ہمیں اشارہ کیا کہ سوار ہوجاؤ اور وہ خود بھی ہمارے ساتھ سوار ہوگیا۔ بس والے کو کرایہ لینے سے منع کر دیا۔تھوڑی دور وہ اتر گیا۔اور ہمیں بھی اتارلیا۔وہ ہمارے آگے آگے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے کئی بازار اور گلیاں گزرتے بالآخر مشن ہاؤس پہنچ گئے۔اللہ تعالیٰ اسے جزاء عطا فرمائے۔وہاں سے ایک دوست مکرم غلام رحمانی صاحب ساؤتھ ہال لندن کے ساتھ پیدروآباد مسجد بشارت کے لئے روانہ ہوئے۔

مسجد بشارت کی جانب ہماری کار نشیب وفراز میں سے بل کھاتی ہوئی سڑک پر سے گزرتی ہوئی جارہی تھی کہ دور سے ایک اونچے ٹیلے پر مسجد کے سفید مینارے نظر آئے تو بے اختیار منہ سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔جیسے بٹالہ سے قادیان جاتے ہوئے دور سے منارۃ المسیح کی جھلک دیکھتے ہی اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوا کرتی تھیں۔قریب پہنچے تو ایک وسیع چاردیواری کے درمیان

مسجد بشارت ایک خوبصورت موتی کی طرح آویزاں تھی۔ بہت سے جان پہچان والے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ نئے دوستوں سے شناسائی ہوئی۔ مسجد میں نوافل ادا کئے اور وہیں نماز کے انتظار میں آرام کیا۔ باہر نکلے۔ احاطہ میں اِدھر اُدھر گھومے۔ پُشت پر آڑو کا درخت پھل سے لدا ہوا کھڑا تھا۔ ایک آڑو بطور تبرکاً کھایا۔ ایک لڑکا اپنے کپاس کے کھیت کو پانی لگا رہا تھا۔ پانی کچھ دور سے ٹیوب ویل سے آرہا تھا پُختہ نالی کے ذریعہ۔ کپاس کے پودے بہت چھوٹے قد کے لیکن پھل سے لدے ہوئے۔ بالکل سامنے قریب ہی پیدروآباد کا گاؤں کسانوں اور مزدوروں کا گاؤں سفید چمکتے ہوئے پُختہ وسیع اونچے مکانات پر مشتمل نظر آرہا تھا۔ مسجد میں تین طرف یعنی مشرق، مغرب اور جنوب کی طرف برآمدے شمال کی طرف ملحقہ ٹائیلٹ دفاتر اور ان کے ساتھ جانب مشرق مربیان کے کوارٹر مشرقی حد تک تعمیر ہو چکے ہیں۔

پیدروآباد کا گاؤں

مسجد کے احاطہ کی مغرب کی طرف بڑی سڑک اور شمال کی طرف پیدروآباد جانے والی سڑک لگتی ہے۔ اس سڑک پر ہم پیدروآباد دیکھنے کے لئے چل دیئے۔ پُختہ صاف ستھری سڑکیں اور گلیاں۔ کہیں کوڑے کرکٹ کا نشان تک نظر نہیں آیا۔ بلدیہ کے دفاتر، سکول، ڈاکخانہ، تار گھر، ٹیلیفون، بجلی، پانی سب سہولتیں موجود۔ ایک عالیشان عمارت گرجا کی بھی موجود۔ سڑکوں کے کنارے کنارے پھل دار پودے لگے ہوئے۔ مکانوں کی کھڑکیوں میں سے سجاوٹ کے لئے پھول باہر کو جھانک رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف فٹ پاتھ بنے ہوئے تھے اور کہیں کہیں مکانوں کے باہر بعض معمر لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بیٹھے گپ شپ میں مشغول تھے۔ جس کے پاس سے گذرے السلام علیکم کہا اور ان لوگوں نے اپنی زبان میں کچھ مسکرا کر جواب دیا۔ ایک طرف ایک بہت بڑی دوکان نظر آئی۔ اس دن بند تھی۔ لیکن سڑک کی طرف بڑے شیشے لگے تھے۔ سب کچھ نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دور آگے ایک ریسٹورنٹ سے چائے کی ایک ایک پیالی پی۔

لیکن اس شریف آدمی نے ہم سے مروجہ طریق سے نصف قیمت وصول کی۔ تھوڑی دور ایک عورت اپنے مکان کے باہر پلستر اور سفیدی کر رہی تھی۔ گاؤں کے آخر پر سڑک گھوم کر مین روڈ کی طرف بنائی گئی تھی۔ گویا گاؤں میں داخل ہونے کا راستہ الگ اور باہر جانے کا راستہ الگ تھا۔

پیدرو آباد کے متعلق آپ بہت کچھ پڑھ سُن چکے ہیں۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے لکھی ہے کہ ذرا اس گاؤں کا پاکستان کے گاؤں اور قصبوں سے مقابلہ کر لیں۔

مسجد بشارت کے احاطہ سے غور سے دیکھنے سے کچھ دور دریائے ''وادی الکبیر'' قرطبہ جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ آج کل اس میں پانی بہت تھوڑا ہے۔ یہ دریا قرطبہ کے ایک حصہ میں سے ہوتا ہوا گزرتا ہے۔ اس کے دوسرے کنارے کسی زمانہ میں مدینۃ الروساء کے مسحور کُن محلات اور باغات تھے۔ جن کے باقیات اب صرف ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری اور دو محلات کی بھی ٹوٹی پھوٹی دیواریں رہ گئی ہیں اور ان باغات اور محلات کے تذکرے کتابوں میں لکھے رہ گئے ہیں۔

قرطبہ کا ماحول سرسبز باغات اور بڑے درختوں سے اٹا پڑا ہے۔ شہر صاف ستھرا ہے۔ عالیشان عمارتیں اور گرجے کثرت سے ہیں۔ مسلمانوں کے دور میں یہاں سات سو کے قریب مساجد تھیں۔ اب ان میں سے بہت کو گرجوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تمام ٹریفک کاروں اور بسوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سپین میں ون وے ٹریفک اور داہنے ہاتھ ڈرائیونگ ہے جس کی وجہ سے ٹریفک بغیر روکاوٹ چلتی چلی جاتی ہے۔ کہیں ہارن بجانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سڑکیں اور گلیاں صاف ستھری۔ پھل اور سبزی عام۔ پاکستان اور لندن سے سستا۔ تازہ اور عمدہ ایک سیب کھانے سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ ہوٹلوں میں سؤر کا گوشت لٹکا رہتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں قصاب کی دوکان پر گوشت لٹکتا رہتا ہے۔ آپ کاؤنٹر پر کھڑے ہوں تو سؤر کی ران آپ کے سر کو چھونے کو تیار ہوگی۔ چائے، دودھ مل جاتا ہے۔ ڈبل روٹی، بسکٹ، پیسٹری، ایک موٹی سی رس کی شکل کی سخت سی روٹی بھی مل جاتی ہے۔ مچھلی انڈا بھی مل جاتا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کس چیز میں پکاتے ہیں۔ بسم اللہ پڑھ کر اور اپنے دل کو تسلی دے کر کھانی پڑتی ہے۔ ورنہ پھل، سبزی، دودھ چائے وغیرہ پر گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ مشکوک چیز سے اگر پرہیز کیا جائے تو بہتر ہے۔ لندن سے

میرے داماد عزیزم رشید احمد صاحب اور عزیزہ ناصرہ نے میرے بیگ میں بہت سی پُوریاں تل کر رکھ دی تھیں۔ کافی مقدار میں خشک پھل اور پیسٹری وغیرہ بھی۔ قرطبہ میں قیام کے دوران ہم تین دوست مکرم چوہدری انوارالحق صاحب مانچسٹر، مکرم مولوی عبدالباسط صاحب زیمبیا اور خاکسار صبح کی نماز کے بعد سیر ہو کر ناشتہ کر لیتے اور قریب ہی ایک ریسٹورنٹ سے چائے دودھ پی لیتے رہے۔ دوپہر کا کھانا جہاں کچھ مل جاتا کھا لیتے۔ دن کے وقت اپنے بیگ میں خشک پھل پیسٹری وغیرہ رکھ لیتے۔ اس طرح ہمیں کہیں بھی کوئی مشکوک چیز کھانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

گائے کا گوشت سپین میں نہیں ہوتا، نہ ہی بھیڑ بکری کا۔ مرغی بھی قلیل۔ گائے کا گوشت بیرونی ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے۔ گائے سپین میں بہت قلیل مقدار میں پائی جاتی ہے۔ مَیں نے کہیں بھیڑ بکری نہیں دیکھی۔ گائے کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ جو بھی گوشت ہوتا ہے وہ ذبح نہیں ہوتا۔ مرغیاں کسان اپنے ڈیروں پر پالتے ہیں۔ ایسے جیسے ہمارے ہاں ایک مرُغی اور چند چوزے۔

مسجد قرطبہ

قرطبہ میں مسلمان دور کی صرف ایک مسجد رہ گئی ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی مسجد فنِ تعمیر میں عجوبہ۔ محراب کے حصہ کے علاوہ تمام مسجد گرجا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ فرش کے نیچے قبریں ہیں۔ دیواروں پر حضرت مسیح، حضرت مریم اور دیگر عیسائی بزرگوں کے مجسمے اور پینٹنگز ہیں۔ اس مسجد میں نماز ادا کرنے کی ممانعت ہے۔ ویسے بھی اب یہ مسجد نہیں رہی بلکہ بُت کدہ اور قبرستان کا امتزاج بن چُکا ہے۔ خُدائی تصرف کے ماتحت سرکاری کاغذات اور سائن بورڈ پر اِس کا نام مسجد ہی ہے۔ اِس عظیم ترین اور حسین مسجد کی یہ بے حُرمتی دیکھ کر دل کو ایسی ٹھیس پہنچی کہ اس کا حُسن میری آنکھوں کے سامنے دھندلا گیا۔ ایسے ہی چارلز پنجم نے جب مسجد کا یہ حال دیکھا تو بڑے درد بھرے لہجہ میں بولا:

’’تم نے ایسی چیز ضائع کر دی ہے جو کہیں اور نہیں دیکھی جا سکتی اور اس کے عوض ایک ایسی چیز بنائی ہے جو ہر جگہ مل سکتی ہے۔‘‘

مسلمانوں کے دور میں قرطبہ ۱۰ میل لمبا دس میل چوڑا شہر تھا۔سارے یورپ بلکہ اُس وقت کی معلوم دُنیا سے لوگ قرطبہ یونیورسٹی میں علم وہُنر سیکھنے آتے تھے۔آج یہ معمولی سا شہر بلکہ قصبہ ہے۔کل آبادی قریباً پونے دو لاکھ۔کئی لائبریریاں تھیں جن میں چار لاکھ کُتب موجود تھیں جو اِس بدقسمت قوم کے اسلاف نے تعصب میں اندھے ہو کر سب جلا کر راکھ کر دیں۔اِس قوم کے لئے یہ غور کا مقام ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال کر اس نے کیا فائدہ حاصل کیا۔ سوائے غربت وافلاس اور جہالت کے۔

500 میل لمبا اور کچھ کم چوڑا قریباً مربع شکل کا جزیرہ نما ہسپانیہ یورپ کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔مشرقی ساحِل پر بحیرہ روم،مغربی ساحل پر بحرِ اوقیانوس،جنوب میں 5,8 میل چوڑی تنگ ناؤاس کو افریقہ کے شمالی ساحِل سے جُدا کرتی ہے۔شمال میں اس کی سرحدیں جنوبی فرانس سے ملتی ہیں۔جن کو ایلپس سے بھی بلند پہاڑ پازینیز سے جُدا کرتے ہیں۔یہ جنگلات سرسبز وادیوں سے پُر ہیں۔اعلیٰ قسم کی عمارتی لکڑی یہاں ہوتی ہے۔ملک کا درمیانی حصہ سطح مرتفع ہے۔ قریباً دو ہزار فُٹ سطح سمندر سے بلند ہے۔زیادہ تر خشک میدان۔کہیں کہیں نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے۔ملک کے عین درمیان میڈرڈ واقع ہے جو ملک کا دارالحکومت ہے۔یہاں سے سارے ملک کے بڑے بڑے شہروں کو عمدہ پختہ سڑکیں جاتی ہیں۔ریلوے بھی ہے اور ہوائی اڈہ بھی۔

ملک کا جنوبی حصہ اندلس کہلاتا ہے۔سرسبز اور شاداب چشموں کی سرزمین،ہلکی گرم فضا۔بیشتر علاقہ چھوٹے بڑے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔نشیبی علاقہ میدانی ہے جہاں آب پاشی کی آسانیاں ہیں۔ بڑا سرسبز،باغات اور ہرے بھرے کھیتوں سے بھرپور۔ان علاقوں سے گذرتے ہوئے دل و دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔گہرا نیلا بے داغ آسمان،صبح کے وقت ہلکی خنک فضا،بہت کم ٹریفک،بل کھاتی ہوئی نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی سڑک پر کار کی سواری میں بہت لطف آیا۔ کہیں کہیں کوئی کار یا بس آگے پیچھے سے گذرتی رہی۔سڑکوں پر کوئی گرد اڑتی دکھائی نہ دی۔ سارے علاقے میں زیتون کے وسیع باغات کچھ بہت ہی پُرانے،کچھ بالکل نئے۔کہیں کہیں

پھل پک چکا ہے اور چُنائی ہو رہی ہے۔ ہمارے ہاں کے کپاس کی چُنائی کی طرح زیتون کے پھل کی چنائی عورتیں کر رہی تھیں۔ مکئی، جوار، سُورج مُکھی کی فصلیں کچھ کٹ چکی تھیں کچھ تیار ہو رہی تھیں۔ جہاں سے کٹ چکی تھیں، ٹانڈوں کے گٹھے بیلوں کے چارہ کے لئے باندھ رکھے تھے۔ کاشتکاری پرانے طریقہ پر ہل اور بیلوں سے ہوتی ہے۔ بعض جگہ ٹریکٹر بھی چل رہے تھے۔ ٹریکٹروں سے کاشت شدہ زمین میں نمی موجود تھی۔ ٹیلوں کی تمام زمین نشیب سے لے کر بلند چوٹی تک زیر کاشت ہے۔ عام فصلیں بارانی ہوتی ہیں۔ بارش بہت تھوڑی 20-24 انچ سالانہ۔ اونچے ٹیلوں پر آبپاشی بذریعہ نہر یا ٹیوب ویل ناممکن ہے۔ تھوڑی تھوڑی دور کسانوں نے اپنی زیر کاشت زمینوں میں رہائش کے لئے سفید ڈیرے بنا رکھے ہیں جن سے مین روڈ تک پختہ راستے بنے ہوئے ہیں۔ نشیب میں سنگترہ، مالٹا، انگور، ناشپاتی، آڑو، بادام، سیب بکثرت، سردہ نہایت میٹھا اور باافراط۔ سبزیاں ہر قسم کی کثرت سے۔ ہرے بھرے کھیت بڑے سایہ دار درخت علاقہ کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہے ہیں۔ آبادی بہت بکھری ہوئی۔ قصبے یا گاؤں بہت دور دور۔ عام طور پر آبادی کے لئے دامن کی سرسبز و شاداب جگہ نظارہ کے لئے منتخب کی ہوئی ہے۔ سفید مکانات، سرسبز درختوں اور پھل دار پودوں سے ڈھکے ہوئے، شام کے بعد ٹمٹماتی روشنیاں عجیب بہار پیدا کرتی ہیں۔ سارے ملک کی آبادی افسوسناک حد تک تھوڑی ہے۔ کل 3 کروڑ 45 لاکھ کی آبادی رقبہ کے لحاظ سے بہت قلیل ہے۔

جنوبی ساحل پر سیرانواڈا کی برف سے ڈھکی پہاڑیاں ہیں جن کی گود میں غرناطہ واقع ہے۔ وہ غرناطہ جس کا نام ذہن میں آتے ہی دل پاش پاش ہونے لگتا ہے۔ اس کے ساحلی علاقے میں کھجور، کیلا، کپاس، چاول، بادام، انجیر، انار باافراط ہیں۔ ملک میں بڑی فصلوں میں گندم، مکی، جوار، پھل اور سبزیاں شامل ہیں۔ جَو باوجود بارش کی کمی اور آبپاشی کے ذرائع کے فقدان کے کثرت سے پیدا ہوتی ہے اور یورپ کے ہمسایہ ملکوں کو بھی برآمد ہوتی ہے۔ جو علاقہ ہماری نظر سے گذرا سارے کا سارا زیرِ کاشت ہے اور بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت ہے۔ زمیندار بھی ہیں۔

چونکہ زمینداروں کو زراعت سے خاصا فائدہ ہوتا ہے اس لئے کسی جگہ بھی گھاس نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کوئی چراگاہ نظر آتی ہے۔ ہمارے ملک کی طرح کے گائے بھینس، بھیڑ، بکری کے ریوڑ وہاں مفقود ہیں۔ چراگاہیں نہیں ہیں اور زمیندار اپنے کھیتوں میں کسی جانور کو گھسنے نہیں دیتے۔ اس ملک میں گائے کی پیداوار قلیل ہے۔ دودھ بھی درآمد کیا جاتا ہے۔ بارسیلونا کی طرف آب و ہوا گرم وخشک ہے۔ کسی زمانہ میں یہ ملک جنگلات سے پُر تھا۔ دنیا کا 1/4 حصہ کارک اسی ملک میں پیدا ہوتا تھا۔ اب قلیل مقدار میں درخت رہ گئے ہیں۔ جنگلوں کے ختم ہوجانے سے بارش بھی ختم ہوگئی۔ جنگلی جانور بھی نقل مکانی کر گئے ہیں اور پرندے بھی دوسرے ملکوں کی طرف اُڑ گئے ہیں۔ اب دوبارہ جنگل اگانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

آج کل دریاؤں میں پانی بہت تھوڑا ہے۔ تاہم کہیں کہیں آبپاشی ہورہی ہے۔ کہیں کہیں ٹیوب ویل بھی ہیں۔ کہیں کہیں نالوں کے ذریعہ فواروں کی شکل میں آبپاشی ہورہی ہے۔ ہر جگہ ہر کسی کو یہ سہولت میسر نہیں ہوسکتی۔ ویسے بھی یہ طریقِ آبپاشی فصلوں کے لئے تسلی بخش نہیں۔ ملک میں پانی کے تمام ذرائع کی قلت ہے۔ اگر کہیں پانی میسر ہے تو اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ دنیا کا عیش آرام میسر ہے۔ بعض جگہ پانی شراب سے بھی مہنگا ہے۔ صنعتیں ابھی ابتدائی حالت میں ہیں۔ پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے کے کارخانے لگ رہے ہیں اور ترقی کی طرف قدم بڑھ رہا ہے۔

savilla سیویلا مسلمانوں کے ابتدائی دور میں دارالخلافہ تھا۔ مسلمان بادشاہوں کے محلات، مسجدیں، مینارے کھڑے ہیں۔ ایسے جیسے ابھی بن کر تیار ہوئے ہوں۔ ان کے بہت سے حصوں پر عیسائیوں نے اپنی عمارتیں اور گرجے بنا لئے ہوئے ہیں۔ بعض حصوں کو اپنے نام کے ساتھ موسوم کر رکھا ہے۔ سپین کا سب سے بڑا گرجا گھر اور دنیا کا تیسرا بڑا گرجا یہاں واقع ہے۔ یہ گرجا بھی مسلم دور کی ایک وسیع مسجد پر بنایا گیا ہے۔ اس شہر کی آبادی قریباً ساٹھ ہزار ہے۔ مکانات سامنے سے سفید زیادہ تر پُرانے، مسلمانوں کی طرز کے گلیاں اور موڑ بھی پُرانی طرز کے ہیں۔ یہ شہر دریائے وادی الکبیر پر اہم دریائی بندرگاہ ہے۔ جو قرطبہ اور سیویلا سے ہوتا ہوا

بحرِ اوقیانوس میں گرتا ہے۔اس میں جہاز رانی ہوتی ہے۔تجارتی نقطۂ نگاہ سے یہ سپین کا اہم دریا ہے۔سیویلا کا ماحول بہت خوبصورت ہے۔نہایت سرسبز زمین ہے، زمین میدانی ہے۔ ٹیلے نسبتاً اور باغات کثرت سے ہیں۔ یہاں کی کثیر آبادی سیاہ بال اور سیاہ آنکھوں والے ہیں۔آب وہوا گرم مرطوب ہے۔ ہوائی اڈہ بھی ہے۔ ریل اور سڑکوں کے ذریعہ تمام اندرون ملک تک آمدورفت ہے۔

الحمراء

غرناطہ میں دنیا کا عجوبہ الحمراء ہو بہو قائم ہے۔الحمراء کے ساتھ کئی عالی شان محلات بھی صحیح حالت میں قائم ہیں۔ بہت سی عمارات توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکی ہوئی ہیں۔الحمراء کی دیواروں پر جا بجا آیاتِ قرآنی اور نمایاں طور پر لا غالب الا اللہ کندہ ہے۔وسیع باغات بمع تفریحی عمارات کے ہو بہو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔صدیوں بعد بھی ان محلات میں قدم رکھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مکین ابھی ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر جانبِ جنوب سیرا نواڈا کی پہاڑیاں جو سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہیں، نظر آتی ہیں۔ جہاں سے الحمراء اور اس کے ملحقہ باغات کو چشموں کی شکل میں پانی پہنچ رہا ہے۔ کہتے ہیں یہ چشمے مسلمان انجینئروں کے کمال وفن کا شاہکار ہیں۔ان مقامات کی برکتیں جاری ہیں۔ہم نے غرناطہ میں 200 پسیتہ اور سیویلا میں یک صد پسیتہ (سپینش سکہ) ان مقامات کے دیکھنے کے لئے ٹکٹوں کی خرید فی کس ادا کئے۔ اندازاً لاکھوں پسیتہ حکومتِ سپین کو ان مقامات کے زائرین سے روزانہ وصول ہوتے ہیں۔اگر سپین کی سابقہ حکومتیں مسلمانوں اور رومنوں کی چھوڑی ہوئی یادگاروں کی حفاظت کرتیں تو آج کئی گنا زیادہ آمد وصول ہوتی۔ یہ مقامات زائرین کے لئے باعثِ تفریح ہیں۔لیکن مسلمانوں کے لئے باعث عبرت کہ لہو ولعب، نا اتفاقی اور انتشار بالآخر تباہی کا باعث ہوتا ہے۔

ذرائع آمدورفت

ذرائع آمدورفت کا ذکر اوپر آچکا ہے۔اندرونِ ملک تمام بڑے شہروں تک ہوائی سروس، ریلوے، بس سروس، ٹیکسی اور کاریں ہیں۔بسیں آرام دہ اور خوبصورت، ریل گاڑیاں آرام دہ اور تیز رفتار۔گاڑیوں میں ریسٹورنٹ کی سہولت بھی ہوتی ہے۔جس گاڑی سے ہم نے سفر کیا، بجلی سے چلنے والی تھی۔تین گھنٹہ میں قرطبہ ملاگا کا سفر طے ہوا۔سڑکوں پر پاکستان بھارت کی طرح کا رش نہیں تھا۔دور دور تک سڑک ٹریفک سے خالی نظر آتی تھی۔بار برداری کے ٹرک شاید ہی نظر آتے۔ اندرونِ ملک بار برداری شاید بذریعہ ریل ہی ہوتی ہوگی۔اتنا تاثر ضرور ملتا ہے کہ تجارت کی طرف رجحان کم ہے۔ ملک زیادہ تر زراعتی ہے۔زمین بہت بڑے زمینداروں کے قبضہ میں ہے۔ان زمینداروں کا ہمارے ملک کی طرح ملکی سیاست میں بڑا دخل ہے۔

زمیندار بھی ہیں، کسان بہت ہیں اور کاشت کے لئے زمین حاصل کرنے کے لئے سخت مقابلہ ہوتا ہے۔کئی امیدوار کھڑے ہوجاتے ہیں۔

گورنمنٹ بے زمین کسانوں کی بہبود کے لئے کوئی قدم تا حال نہیں اٹھا سکی۔بہت سے بے کار مزدور اور کسان شہروں کی طرف رجوع کر رہے ہیں جہاں رہائش کا مسئلہ بن گیا ہے۔ ایک ایک کمرہ میں تین تین چار چار فیمیلیز گزارہ کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ کرایہ مکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

شمال مغربی علاقہ میں بارش نسبتاً زیادہ قریباً 40 انچ سالانہ ہوتی ہے۔زیادہ تر میدانی علاقہ ہے۔ کہیں کہیں نہروں سے بھی آبپاشی ہوتی ہے۔یہ زمین اس قدر زرخیز ہے کہ گندم کی فصل کسی بھی ملک کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ایک خاص خوبی اس ملک کی زعفران ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ اور بہترین پیدا ہوتا ہے۔افسوس ہے یہ خاص خطۂ زمین ہم نہ دیکھ سکے۔شمال مغربی علاقہ میں گائے، بیل، لڑنے والے بیل، بھیڑ بکری بھی ہوتے ہیں۔بیرونِ ملک سے ہزاروں سیاح بھی

(بُل فائینگ) بھینسے کی لڑائی دیکھنے آتے ہیں۔اس کھیل کے دیکھنے کے لئے بھی بڑے بڑے سٹیڈیم ملاگا،سیویلا اور بعض دوسرے شہروں میں تعمیر کئے گئے ہیں۔عورتوں کے ایک مخصوص رقص کے لئے بھی یہ ملک مشہور ہے۔جس کو دیکھنے کے لئے یورپ وامریکہ سے شائقین کھنچے چلے آتے ہیں۔علاوہ ان خصوصیات کے آثارِ قدیمہ، سپین کی صاف ستھری فضا، گہرا نیلا بے داغ آسمان، چمکتا سورج لیکن حدت قابلِ برداشت ،صاف شفاف آبادیاں اور شہر، پھلوں سے لدے باغ، بڑے سبزہ زار، درخت،سواحِل پر خوبصورت نظارے، بوٹنگ، نہانے اور دھوپ سینکنے کے خوبصورت منظر سمندر کے کنارے زائرین کی کشش کا باعث بنے رہتے ہیں۔قریباً 25 کروڑ سیاح ہر سال سپین میں وارد ہوتے ہیں اور سپین کے لئے بہت بڑی آمد کا ذریعہ ہیں۔بہت سے نوجوان بیرونِ ملک محنت مزدوری کے لئے یورپین ممالک کی طرف جاچکے ہیں اور کافی مقدار میں روپیہ سپین بھیجتے ہیں۔ہمارے ملک کی طرح ملک کی اقتصادی بحالی کو کافی سہارا مل رہا ہے۔امریکن ایڈ پچھلے برسوں میں کافی مِل چکی ہے اور ابھی مزید متوقع ہے۔سپین میں آبادی کی کمی کی وجوہات ظاہر ہیں کہ ایک کثیر حصہ آبادی کا امریکہ دریافت ہونے پر سپین سے ہجرت کر کے امریکہ میں جا آباد ہوا تھا۔اس وقت 20 کروڑ باشندے امریکہ میں سپین کی مقامی زبان بولتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ سمجھ آتی ہے کہ مسلمانوں پر ظلم کے بعد اِس قوم کو عذاب الٰہی نے آ پکڑا۔امریکہ سے بے حساب سونا چاندی آجانے سے یہ ملک بہت امیر اور طاقت ور ہوگیا۔یہ دولت اسے ہضم نہ ہوسکی۔ایک صد سال بعد برطانیہ سے جنگ چھیڑ دی اور ایسی مار کھائی کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔نپولین کے دور میں بھی یہ ملک ذلت سے دوچار رہا۔اس کے بعد سِول وار (خانہ جنگی) میں ملوث ہوا جو جنرل فرانکو کے دور تک جاری رہی۔اس طرح بھی آبادی گھٹتی ہی گئی۔تیسری وجہ برتھ کنٹرول ہے۔اگر بچے پیدا نہ ہوں گے تو آئندہ کام کرنے والے اور شادیاں کر کے آبادی بڑھانے والے کہاں سے آئیں گے۔

لوگ خوش شکل،صحت مند، خوش وضع، خوش پوش، ہنستے مسکراتے چہرے، ملنسار۔مزدور بھی

صاف ستھرا، کسان بھی صاف ستھرا، ملک بحیثیت مجموعی خوبصورت ہے۔زمین، پہاڑیاں، وادیاں، سبزہ زار، باغات کی کثرت، موسم زیادہ تر معتدل، مکانات، گاؤں وشہر صاف ستھرے اورخوبصورت۔شمالی علاقوں کے لوگ گورارنگ، نیلی آنکھیں اور سنہری بال۔جنوب میں ملی جلی آبادی کافی تعداد میں۔سیاہ بال، سیاہ یا بھوری آنکھیں،کبھی اندلس کی عورتیں سیاہ لمبے بالوں کی وجہ سے خوبصورتی میں مشہور تھیں۔اب لمبے بال کٹ چکے ہیں اور وہ خوبصورتی کے تذکرے بھی سننے میں نہیں آتے۔

یہ ملک اپنا وطن بنالینے کے قابل ہے۔ایک بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔

مغربی تہذیب کا اثر یہاں بھی نمایاں ہے۔اکثر نوجوان لڑکیاں صرف ایک بنیان اور تنگ پتلون پہنے پھرتی ہیں۔اکثر جوڑے کمر میں بازو ڈالے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ٹرین پر ملاگا جاتے ہوئے راستہ میں ایک ریلوے سٹیشن پر ایک جوڑا سوار ہوا۔نوجوان نے ایسی حرکت کی جو ہمارے ملک میں قابلِ تعذیر ہے۔سب نے دیکھا مگر کسی نے توجہ نہ کی ایسے جیسے ہوا جو ہوا معمول ہے۔ہوائی جہاز میں لندن کے لئے سوار ہوئے۔نماز جہاز میں ادا کی۔نماز کے بعد میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سپینش نے خاکسار سے دریافت کیا کہ تمہاری عورتیں منہ کیوں ڈھانپتی ہیں؟ میں نے کہا ''غلط نظروں سے بچنے کے لئے'' اور صبح والا واقعہ جو ایک ریلوے سٹیشن پر مَیں دیکھ چکا تھا۔مثال کے طور پر اسے تفصیل سے بتایا تو ہنس کر کہنے لگا کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے، ہوتا ہی رہتا ہے۔یعنی اس کے نزدیک بالکل معمولی واقعہ تھا۔اس کو تفصیل سے پردہ کے فوائد بتائے اور اسلام اور جماعتِ احمدیہ کے عقائد اور مسجد بشارت کا تعارف تفصیل سے بتایا۔وہ کسی اچھے عہدہ پر سپین میں ملازم ہے۔اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ اسے علم نہ ہوسکا ورنہ افتتاح کے موقعہ پر ضرور حاضر ہوتا۔اس نے ایڈریس لے لیا اور مسجد جا کر مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق ظاہر کیا۔سپین میں جس بھی ریسٹورنٹ میں گئے یا آتے جاتے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔لوگوں کو شراب ہی پیتے دیکھا۔شراب اور سؤر کا گوشت کثرت سے دستیاب ہے۔دونوں ملکی

پیداوار ہیں۔ان دونوں چیزوں نے اس قوم پر منفی اثر ڈال رکھے ہیں۔

صدیوں سے یہ ملک کٹر کیتھولک مذہب کے دباؤ میں چلا آرہا ہے۔کسی دوسرے مذہب کی جھلک تک دیکھنے کا اُس قوم کو موقعہ نہیں دیا گیا۔کیتھولک مذہب نے اس قوم کی اخلاقی اقدار کو صحیح راستہ پر چلانے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں کی۔ملک میں مذہبی آزادی کا قانون رائج ہوجانے سے اللہ تعالیٰ نے جماعتِ احمدیہ کے لئے اسلام کی تبلیغ کا موقعہ بہم پہنچا دیا ہے۔امید ہے کہ اللہ تعالی اس قوم کی سابقہ غلطیاں معاف فرمائے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

غرناطہ کے آخری بادشاہ محمد عبداللہ کو جب خلافِ معاہدہ فرڈیننڈ اور ازابیلا نے بزور غرناطہ سے نکال دیا تو ابوعبداللہ ایک پہاڑی پر گھوڑے پر سواری کی حالت میں کھڑا غرناطہ کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا تو اس کی والدہ محترمہ نے طنزاً کہا: ''اب عورتوں کی طرح رونے کا کیا فائدہ؟ مردوں کی طرح جہاد کا موقعہ تو تم نے کھو دیا ہے۔'' اس سلسلہ میں اندلس میں ایک قصہ مشہور ہے کہ:

''شکست کے بعد ابوعبداللہ بمع اپنے خاندان اور لاؤ لشکر کے سیرا نواڈا کی پہاڑیوں کے کسی غار میں چلا گیا اور کسی جادوگر نے اسے تمام لاؤ لشکر سمیت گہری نیند سُلا دیا اور کہا کہ کئی صدیوں بعد کوئی شخص اس غار پر سے گذرے گا اور تین نام پکارے گا تو ابوعبداللہ اپنے خاندان اور لاؤ لشکر کے ساتھ چاک و چوبند اُٹھ کھڑا ہوگا اور سپین کو دوبارہ فتح کرکے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرے گا۔اگر ابھی تک وہ تین نام پکارے نہیں گئے تو صرف اس لئے کہ وہ خاص وقت ابھی نہیں آیا۔''

بعض مواقع پر ایسے قصوں میں حقیقت پنہاں ہوتی ہے۔غور کیا جائے تو عین ممکن ہے اس وقت کے مسلمانوں کی حالتِ زار پر رحم فرما کر بعض اولیاء اللہ کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخش کر بشارت دی ہو اور وہ بشارت بگڑتے بگڑتے جادو کے قصے کی صورت میں مشہور ہوگئی ہو۔ پیشگوئیوں کی اصل حقیقت پیشگوئی پوری ہونے پر ہی واضح ہوا کرتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی

ہوا ہے۔ مَیں نے غور کیا تو صاف اور واضح حقیقت اس قصہ میں نکل آئی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قیادت میں حضرت مصلح موعودؓ کی سپین کے بارہ میں تڑپ اور دعائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور سے بشارتیں اور سپین میں احمدیہ مشن کا قیام۔ دوئم: حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی سپین میں تبلیغ کے بارہ میں تڑپ اور دعائیں۔ 1970ء میں میڈرڈ کے مقام پر ہوائی جہاز سے اترتے ہوئے اپنے خدام کو حضورؒ کا فرمانا کہ ''مجھے طارق کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آرہی ہے۔ کیا تمہیں بھی آرہی ہے؟'' پھر غرناطہ میں حضورؒ کو آیتِ کریمہ کے القاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حضور سے بشارت۔ پھر مسجد بشارت کا سنگِ بنیاد رکھنا اور آخری دمِ زندگی تک مسجد بشارت کی تعمیر میں ذاتی دلچسپی لینا۔

سوئم: حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کا افتتاح مسجد بشارت بہ نفسِ نفیس مبارک قدم فرما کر مسجد کا افتتاح فرمانا اور سپین میں تبلیغ کی مہم کو تیز سے تیز تر فرمانا۔ یہ تینوں مقدس نام بانگِ دُہل پکارے جا چکے ہیں اور مذکورہ آیہ کریمہ میں بیان فرمودہ پیشگوئی کے مطابق مقدر وقت آچکا ہے۔

آج الحمرا کی دیواروں پر کندہ لَا غَالِبَ اِلَّا اللہ چمکتے سورج کی طرح سارے سپین میں ضوفشانی کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم سے اسلام کے سپین میں غالب آجانے کی ابتداء ہو چکی ہے۔ غریب سی قلیل سی جماعت احمدیہ یہ فتح حاصل کرنے والی ہے کہ انشاء اللہ سپین کا ملک اپنی جھولی میں ڈال کر حضرت رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈالنے کی سعادت حاصل کرے گی۔ ؎

ہے یہ تقدیر خداوند کی تقدیروں میں''

اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابا جی کا مشاہدہ کس قدر تیز تھا۔ ان کو تاریخ میں بہت دلچسپی تھی۔ ان کا گہرا اور وسیع مطالعہ تھا اردگرد کی بھی خوب خبر رکھتے تھے۔ ہماری ہر حرکت پر نظر رکھتے۔ ہماری چال ڈھال، لباس، خوراک اور مزاج پر بھی ان کی گہری تربیتی نظر تھی۔

ابا جی اصول کے پابند تھے۔ بلدیہ ربوہ کے آفیسر ہونے کے ناطے گولبازار کے دوکانداروں کو سختی سے صفائی اور نظم وضبط کی ہدایت کی ہوئی تھی۔ لوگ ان کی طبیعت سمجھنے کے باوجود بھی لاپرواہی کرتے تھے۔ اگر کوئی بالکل ہی قانون کی پابندی نہ کرتا اور ابا جی کی نظر پڑ جاتی تو اس کو جرمانہ کر دیا جاتا۔ شام کو وہی دوکاندار امی کے پاس سفارش کی غرض سے گھر آجاتا اور ابا جی جرمانہ معاف کر دیتے۔

وفات سے دو ماہ قبل ابا جی امی کے ہمراہ میرے ہاں سویڈن تشریف لائے۔ ان دنوں ہماری بہن نبیلہ اپنے میاں مکرم رفیق فوزی اور بیٹے عزیزم یاسر کے ساتھ ناروے میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں ٹھہری ہوئی تھی۔ مجھ سے ملنے کے بعد اب ان کو نبیلہ سے ملنے کی تمنا تھی۔ امی اور ابا جی کی گھبراہٹ دیکھ کر محترم چوہدری منیر احمد صاحب (سویڈن) ان کو ناروے لے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کرے۔

ناروے میں ایک غیر از جماعت محترم ملک صاحب کی خدمت قابلِ ذکر ہے۔ جنہوں نے ان کو خوب سیر کروائی۔ وہاں پندرہ دن قیام کے بعد میرے والدین پھر میرے پاس آ گئے۔ ہر دو گھروں میں وہ بہت خوش رہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجالائے۔ یہاں سویڈن میں محترم محمد انور خان نیازی صاحب نے بہت شفقت کا سلوک فرمایا اور گوتھن برگ کی سیر کروائی پھر اپنے ہاں پُر تکلف دعوت پر مدعو کیا نیز محترم مامون الرشید صاحب، محترم مبشر سعید صاحب، محترم شیخ طاہر احمد صاحب مرحوم اور بعض کے اہلِ خانہ کی خدمات ان کو خوب یاد تھیں۔ محترمہ امۃ الکریم طاہرہ صاحبہ کا تعلق قادیان سے تھا۔ ان کے والد کو آپ بخوبی جانتے تھے۔ ان کے ہاں ملنے کے لئے گئے اور بہت دیر تک ان کے والدین کی باتیں کرتے رہے۔ طاہرہ بہن نے جو اس موقع پر خدمت کی اللہ تعالیٰ اس کا انہیں اجر عطا کرے۔

میرے ہاں دو ہفتے رہنے کے بعد ان کو واپس لندن جانا تھا۔ جاتے وقت طبیعت اداس ہو رہی تھی مگر نہایت حوصلہ سے مجھے تسلیاں دیتے رہے اور کہا ''مَیں تمہارے بغیر بالکل اداس نہیں

ہوں گا۔‘‘میَں بہت خوش نصیب تھی میَں نے اپنے والدین کی برکتیں اور دعائیں حاصل کیں اور مجھے ان کی ادنیٰ سی خدمت کی توفیق ملی۔

یوں تو والدین کو تمام اولاد سے ایک جیسی محبت ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ابا جی کو مجھ سے بہت زیادہ پیار تھا۔ایک مرتبہ بچپن میں ابا جی نے مجھے نئے جوتے لا کر دیئے میَں پہن کر باہر گئی اور جوتی اتار کر مٹی میں کھیلنا شروع کر دیا۔تھوڑی دیر کے بعد گھر واپس لوٹتے وقت احساس ہوا کہ جوتی غائب ہے ڈرتے ہوئے گھر پہنچی۔ابا جی نے دور سے بھانپ لیا اور امی سے کہا اس کو ڈانٹنا نہیں۔اسی وقت جا کر ایک اور جوتی خرید لائے۔میَں بچہّ تھی کہاں گھر میں ٹِک کر بیٹھ سکتی تھی باہر جا کر پھر جوتی اتار کر ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی میں کھیلنا شروع کر دیا۔اُٹھائی گیرا کہیں قریب ہی گھات میں تھا میری جوتی اُٹھا کر چلتا بنا اور میَں ایک دفعہ پھر سہمی ہوئی گھر آ گئی۔ابا جی نے پھر وہی حکم دہرایا کہ اس کو کچھ نہیں کہنا اور مجھے فوراً جا کر نئی جوتی خرید کر دے دی۔اب تیسری مرتبہ جو میَں باہر گئی ہوں تو پھر وہی معصومانہ حرکت دُہرا دی اور جوتی اتار کر لا پرواہ ہو گئی۔چور کا ابھی مَن نہیں بھرا تھا وہ تیسری مرتبہ بھی چُرا کر چلتا بنا۔روہانسی ہو کر آہستہ آہستہ گھر میں داخل ہوئی ابا جی کا وہی مشفقانہ سلوک تھا انہوں نے قطعاً سرزنش نہ کی۔رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيۡ صَغِيۡرًا۔

مجھے بچپن اور لڑکپن میں یاد ہے کہ تمام بچوں کو صبح سویرے جگا دیا مگر مجھے کچھ دیر اور سونے دیا اور جب بھی جگایا توتلی زبان بولتے ہوئے اُٹھایا۔میَں جامعہ نصرت میں پڑھتی تھی اس وقت بھی ابا جی مجھے نہایت نرمی سے جگاتے تھے۔مجھ سے کوئی قصور ہو جاتا تو خاموش رہتے۔اگر گھر میں کسی بات پر سخت ناراض ہو جاتے تو تمام گھر والوں سے بولنا چھوڑ دیتے مگر میرے ساتھ دوستی قائم رہتی اور اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے مجھے آواز دیتے۔

ایک دفعہ پاکستان میں میَں گھر سے باہر کسی دوسرے شہر میں تھی۔انہی دنوں جبکہ باجی ناصرہ لندن سے آئی ہوئی تھیں۔میَں گھر آئی تو ابا جی کی خوشی قابلِ دید تھی۔بہت جذباتی انداز سے مجھ سے ملے اور نہایت خوشی کا اظہار کیا۔باجی کو بہت محسوس ہوا۔انہوں نے ابا جی سے کہا کہ میَں اتنے

سالوں کے بعد آپ سے ملنے آئی ہوں آپ نے میرا تو اتنا والہانہ استقبال نہیں کیا جتنا اس کا کیا ہے۔فوراً جوش میں بولے ’’اس کی بات اور ہے۔‘‘

سویڈن میں میرے ہاں قیام کے دوران مَیں نے ان کی بہت سی تصاویر کھینچیں اور پھر ان کو پاکستان بھجوا دیں۔ان تصاویر میں ابا جی کا بُڑھاپا جھلکتا تھا۔آپ نے ان تصاویر کو تکیے کے غلاف میں چُھپا دیا،مبادا کوئی گھر کا فرد تصاویر کو دیکھ لے اور ان کو بوڑھا کہہ دے۔ان کی وفات کے بعد ان تصاویر کا سُراغ ملا۔

لندن میں چند دن ٹھہرنے کے بعد وہ پاکستان کے لئے عازمِ سفر ہوئے۔تقریباً دو ہفتے گذرنے کے بعد یکے بعد دیگرے پھوپھا جان مکرم محمد شفیع صاحب اور چچا مکرم محمد احمد صاحب کی وفات ہوگئی۔اب دو بہن بھائیوں کی ذمہّ داری ان کے سر پر تھی۔آپ فطری طور پر بہت پریشان ہوئے اور چھوٹی بہن کو بار بار پیار کرتے اور دعا کے لئے کہتے۔پھوپھا جان کی وفات پر میانہ پورہ ضلع سیالکوٹ میں ان کے ہاں افسوس کرنے گئے تو اپنے بھانجے محترم عزیز الحق بابر رامہ کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں ’’بوبک متراں‘‘ چلے گئے۔ ہر کھیت میں پھر پھر کر دیکھا سارا گاؤں گھومے اور زندگی بھر کی یادوں کو دہرایا۔وہ دور اُفتادہ گاؤں آج زندگی کی سہولیات سے پُر ہو چُکا ہے۔یہاں سے خوش وخرّم واپس لوٹے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے صحت بھی اچھی تھی۔آپ نے کام پر جانا شروع کر دیا۔لمبے سفروں کے بعد زندگی معمول پر آ گئی۔حتیٰ کہ 11 نومبر 1987ء کا دن آ پہنچا۔صُبح قریباً 8 بجے تھے۔ امی اور چھوٹی بیٹی کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے۔ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد گھڑی دیکھی اور کہا اب مجھے کام پر چلنا چاہئیے کہ اچانک کسی غیبی طاقت نے آپ کے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور وہ میز پر آ رہا پھر آپ نے چہرہ اُٹھایا اور تین مرتبہ سانس لیا اور کُرسی پر بیٹھے ہوئے اچانک آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اِنَّالِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ ۔یوں یہ نہات پیارا اور دعائیں کرنے والا وجود ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بھر پُور زندگی عطا فرمائی تھی۔اس رحیم وکریم خدا نے موت کی

سختیوں سے بھی بچا کر آخری گھڑی بھی آسان بنا دی۔ 12 نومبر 1987ء کو مسجد مہدی میں سینکڑوں ہمدرد وغمگساروں نے نماز جنازہ ادا کی اور بہشتی مقبرہ ربوہ قطعہ نمبر 18 میں آپ کی تدفین ہوئی۔

آپ کی وفات کے موقعہ پر رسالہ تحریکِ جدید میں مندرجہ ذیل اقتباس چھپا:

It is also announced with great regret that Captain Doctor Bashir Ahmad breathed his last on 11th of November 1987 at the age of 81. He also had a heart attack. His janaza prayer was led by Chaudhri Mubarak Muslihuddin, while the after burial collective prayer was led by Mirza Abdul Haq, Advocate. Dr Bashir Ahmad having passed his L.S.M.F. at Agra, served the people in Bhakkar for several years. For some years he was also attatched to the Army of the country where he was honoured with the award of Military Cross.

The deceased also had the opportunity of serving in Kashmir on the instructions of Hazrat Fazl-e-Umar. When the Ahmadiyya Hospital was established in Qadian in 1947, it was Dr. Bashir who took over from Dr. Mahmud Ahmad, The work that he did there among the people of different faiths brought them much closer to the religion of God. His cooperative and sympathetic attitude will always be remembered by the people of that area.

In 1955 he came to Pakistan and joined the Fazl-e-Umar Hospital where he gave his services for no less than seven years. It was after that he started his Private Clinic at Rabwah. May God the Almighty grant him his nearness and be the helper and guide of the bereaved family.

(Tehrike-e-Jadid Rabwah, 1988)

اباجی کی وفات پر لندن کی جماعت نے مندرجہ ذیل قراردادِ تعزیت پاس کی:

ہم اراکینِ مجلس عاملہ یوکے مکرم و محترم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب آف ربوہ (مکرم چوہدری رشید احمد صاحب سیکرٹری یو۔کے کے خُسر) کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آپ کی وفات 1987ء میں 81 سال کی عمر میں اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوئی۔ آپ اُس سال جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لئے لندن تشریف لائے ہوئے تھے اور پھر جلسہ سالانہ میں شمولیت کے بعد اپنے بچوں کو ملنے ناروے اور سویڈن گئے۔لندن میں ان کے بیٹے مکرم خالد اختر صاحب اور بیٹی محترمہ ناصرہ رشید صاحبہ (صدر لجنہ اماء اللہ لندن) رہتے ہیں۔ قادیان میں ان کی ایک بیٹی مکرم چوہدری عبدالسلام صاحب درویش کی بیوی ہیں جو ملک کی تقسیم کے بعد سے لے کر اب تک وہاں مقیم ہیں۔آپ نے تین بیٹے اور گیارہ بیٹیاں پیچھے چھوڑی ہیں۔ آپ ملٹری میں بھی رہے جہاں آپ کو ملٹری کراس بھی دیا گیا۔ملکی تقسیم سے پہلے حضرت مصلح موعودؓ نے ان کو کشمیر ڈسپنسری جاری کرنے کے لئے بھیجا تھا اور وہاں ایک عرصہ تک اس میدان میں خدمات بجالاتے رہے۔قادیان میں بطور درویش قریباً دس سال کا عرصہ گزارا اور مخلوقِ خدا کی بطور ڈاکٹر خدمت بجالاتے رہے۔ربوہ آکر ایک عرصہ تک فضلِ عمر ہسپتال میں خدمت بجا لاتے رہے۔بعد میں صحت کی کمزوری کی بناء پر ہسپتال سے ریٹائر ہوئے اور پھر کئی سال تک گول بازار ربوہ میں اپنی سرجری میں خدمت خلق بجالاتے رہے۔یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔تاریخِ احمدیت کی چودھویں جلد میں آپ کا ذکر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رضا والی جنتوں میں داخل کرے اور درجات کی بلندی فرمائے۔آمین نیز مرحوم کے لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور ان کے نیک کاموں کو جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

ہم ہیں ممبران مجلسِ عاملہ یوکے

تائی اماں

ہماری بڑی والدہ جن کو ہم تائی اماں کہہ کر پکارتے تھے حضرت حکیم اللہ دتا صاحب صحابیؓ کی بیٹی تھیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو اپنے خاندان میں سب سے پہلے عین جوانی میں سلسلۂ احمدیت میں شامل ہوئے تھے۔

ہمارے ہاں اپنی بڑی والدہ کو تائی اماں کے خطاب سے بلانے کا سبب یہ تھا کہ شروع میں ہمارا خاندان اکٹھا رہتا تھا۔ چچاؤں کے بچے ان کو تائی اماں کہتے تھے جو ہم سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ اس پر ہمارے بڑے بہن بھائیوں نے بھی ان کو تائی اماں کہنا شروع کر دیا۔ یوں وہ صرف ہماری ہی نہیں سارے خاندان، اہل محلہ اور اگلی نسلوں کی بھی تائی اماں کہلائی جانے لگیں۔ ویسے بھی ہماری امی نے کبھی سوتیلی ماں کا لفظ استعمال ہی نہ کیا تھا۔ شروع شروع میں تو ہمیں معلوم ہی نہ تھا۔ پھر عمر کے ساتھ ساتھ رشتوں کی تقسیم اور درجات کا شعور آنے لگا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امی اور تائی اماں کے درمیان کوئی ایسا اختلاف نہیں تھا جو ہمارے ذہنوں پر کوئی بُرا نقش چھوڑ جاتا۔ تھوڑی بہت نوک جھونک ہر گھر، جگہ اور انسانوں کے درمیان ہوتی رہتی ہے لیکن کبھی ہم نے گھر میں جاہلانہ لڑائی جھگڑے کی فضا نہیں دیکھی۔

تائی اماں کے ساتھ ہم بچوں کو بہت پیار تھا۔ وہ بچپن میں تالیاں بجا کر ہمیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ خوش باش طبیعت تھی۔ خوش پوش تھیں اور خوش خوراک تھیں۔ خاندان میں بڑی ہونے کے سبب اقرباء بھی بہت عزت کرتے تھے۔ کھانا بہت عمدہ اور مزیدار پکایا کرتی تھیں۔

ان کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو صبر تھا۔ عام معاملات میں بھی صبر کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ 1950ء کی بات ہے کہ آپ کے بیٹے یعنی ہمارے بڑے بھائی محترم سعید احمد صاحب نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت ہمارا کُنبہ گاؤں میں تھا اور ابا جی قادیان میں درویشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ میٹرک کے امتحان کے بعد ہمارا یہ بھائی لائیلپور (فیصل آباد) میں کالج

میں داخلہ لینے کی غرض سے گیا۔ سترہ سال کا یہ نوجوان بیٹا آج تک لوٹ کر نہیں آیا ہمارے بزرگوں نے لاکھ ڈھونڈا، تلاش بسیار کی۔ آج تک یہ معمہ حل نہ ہوسکا۔

ہم بہن بھائی ان کی گمشدگی کے بہت بعد پیدا ہوئے۔ ہم نے صرف امی سے اس بھائی کی نیکی کا تذکرہ سُنا تھا۔ تائی اماں ان کے بارے میں جیسے صبر کا پہاڑ تھیں۔ کبھی انہوں نے کسی خوشی یا غمی کے موقعہ پر آہ تک نہ بھری۔ ناشکری کے کلمات نہ کہے، کبھی جزع فزع کی نہ کبھی بے قراری کا اظہار کیا۔

ہماری امی ہمارے سامنے تائی اماں کی اس صفت کا بار بار تذکرہ کیا کرتی تھیں اور ان کی اس صفت کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ ہم بہنیں تعلیم کے لئے ربوہ سے باہر گئیں۔ پھر سب رخصت ہوگئیں۔ ان کو ہمارا بہت انتظار رہتا۔ ہم بھی گھر داخل ہوتے ہی بھاگ کر ان کے ہاں جا پہنچتے اور وہ نہایت خوش ہوتیں۔ دونوں گھروں میں اچھے کھانوں کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ تائی اماں کوئی اچھی چیز پکاتیں تو ہمارے لئے بچا کر رکھتیں۔

آپ نماز پڑھنے والی اور دعا گو خاتون تھیں۔ ہم بہنوں کا جب کوئی رشتہ آتا تو امی ان کو خاص طور پر دعا کے لئے درخواست کرتیں۔ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا کہ ان کو ایسی سچی اور واضح خواب آتی۔ امی کو ان کی خوابوں پر بہت یقین تھا۔ جب کبھی وہ اکیلی ہوتیں تو ہم بہنوں میں سے ایک ان کے ہاں جا کر سو جاتی۔ ایک ایسی ہی رمضان کی رات تھی جب میں ان کے پاس سو رہی تھی۔ ان کو لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ دکھائی دی۔ صبح انہوں نے مجھے جگایا اور نہایت سادگی سے بتایا کہ آج میں نے سامنے مکان پر تیز روشنی دیکھی ہے۔ اسی رات ابا جی کو بھی لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ نظر آئی۔ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ۔ جوانی میں صحت اچھی تھی۔ بہت جفاکش تھیں۔ گاؤں کی زمینوں کا انتظام انہی کے ہاتھ میں تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ایک مرتبہ یہ تحریک فرمائی کہ جماعت میں سے کوئی اَن پڑھ نہ رہے۔ تائی اماں کو ہماری بہن نادرہ نے انگریزی سکھانی شروع کی۔ بڑھاپے کے باوجود انہوں نے کئی جملے انگریزی کے سیکھ لئے۔ ان کے ساتھ ہنستے کھیلتے وقت گذرتا تھا۔ ہم نے اپنے

ان بزرگوں کے ساتھ حسین زمانہ گزارا اور مَیں سمجھتی ہوں کہ بزرگوں کی برکات ان گنت ہوتی ہیں جو لحد تک انسان کے ساتھ رہتی ہیں اور ان سے آئندہ نسلیں بھی حصّہ پاتی ہیں۔آپ کو اللہ تعالیٰ نے آٹھ بچوں سے نوازا جن میں سے پانچ حیات ہیں۔ساری اولاد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نیک اور خلافت سے دلی تعلق رکھنے والی ہے۔

آپ کی اولاد نے ان کی بہت خدمت کی۔آخری عمر میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر ربوہ میں وفات پائی۔آپ موصیہ تھیں اور بہشتی مقبرہ ربوہ قطعہ نمبر 17 میں دفن ہیں۔

آپ کے والد محترم حکیم اللہ دتہ درگاہ والی کی وجہ سے آپ کے خاندان میں احمدیت کا بیج بویا گیا۔درگاہ والی ایک دور افتادہ گاؤں ہے جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی آمد کی خبر پہنچی۔آپ کا شوق تجسس بڑھا۔آپ اُٹھے اور گھر اطلاع کئے بغیر قادیان کو چل پڑے اور وہاں ایک ماہ ٹھہرے رہے۔قادیان میں آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پہلی کتاب براہین احمدیہ پڑھی۔حضورؑ کی صحبت میں رہے۔آپ کی بارہا زیارت کی اور بیعت کی درخواست کی مگر اجازت نہ ملی۔کچھ دن کے وقفہ کے بعد دوبارہ پھر سہ بار درخواست کی تو حضورؑ نے آپکی بیعت لے لی اور فرمایا ابھی قادیان میں اور ٹھہریں۔پھر کئی مرتبہ پوچھنے کے بعد گھر واپس آنے کی اجازت ملی۔آپ کتاب براہین احمدیہ لے کر گھر آ گئے۔آپ کے والد محترم حاکم علی صاحب نے استفسار کیا تو کہا کہ صبح جواب دوں۔اگلی صبح آپ براہین احمدیہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ کے والد، جو کہ منشی تھے اور انگریزوں کے استاد تھے، نے کتاب ایک ہفتہ میں پڑھ ڈالی اور کہا کہ جس نے اس شان کی کتاب لکھی ہے وہ ضرور اس زمانہ کا مجدد ہے۔پھر والد صاحب بھی قادیان تشریف لے گئے اور حضورؑ کی زیارت کر کے بیعت کر لی۔پھر آپ کی بیوی اور ساری اولاد بھی احمدی ہو گئی۔

بھائی خالد مجید

25 اگست 2010ء کو ہمارے بھائی خالد مجید احمد صاحب، جو تائی اماں کے بطن سے تھے، کی اچانک دل کے حملہ کے باعث وفات ہوگئی۔ آپ نہایت مخلص احمدی، کم گو، نماز باجماعت قائم کرنے والے اور اہل وعیال کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنے والے تھے۔ طبیعت میں شرافت تھی۔ جلسہ وغیرہ کے موقعہ پر ہم بہنوں کو باہر لے جا کر کھلاتے پلاتے۔ ہمیں بھی ان کا انتظار رہتا۔ بحث، بیکار باتوں اور جھگڑے وغیرہ سے اجتناب کرنے والے تھے۔ ان کو والدہ کی خدمت کی بہت توفیق ملی۔ ایک لمبا عرصہ آپ کویت میں رہے۔ جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تو وطن واپس آ گئے۔ ربوہ میں ہمارے یہی عزیز باقی رہ گئے تھے۔ ان کے ہاتھ ہم ضرورت مندوں کو رقوم بھجواتے وہ بخوشی ہر کام کر دیا کرتے۔ بینک سے رقم نکلوانی یا غیر ملکی کرنسی تبدیل کروانی اور پھر مختلف گھروں میں ذمہ داری سے دے کر آنا۔ ہمارا ان سے بہت تعلق تھا۔ آخر وقت تک انہوں نے ہم پردیسیوں کی بہت خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ انکو جزائے خیر عطا فرمائے۔

3 ستمبر کی الفضل میں آپ کے بارے میں صدر محلہ کا مندرجہ ذیل نوٹ چھپا ہے۔ مکرم محمد رفیع خان شہزادہ صاحب لکھتے ہیں:

''ہمارے محلہ کے ایک مخلص دوست مکرم خالد مجید صاحب ولد مکرم کیپٹن ڈاکٹر بشیر صاحب مؤرخہ 25 اگست 2010 کو ہارٹ اٹیک کی وجہ سے بعمر 66 سال وفات پا گئے۔ مرحوم کی نماز جنازہ مؤرخہ 27 اگست کو مسجد راجیکی میں مکرم مقصود احمد قمر صاحب مربی سلسلہ نے پڑھائی اور عام قبرستان میں تدفین کے بعد مربی صاحب موصوف نے ہی دعا کروائی۔

مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند، کم گو اور نیک شہرت رکھنے والے تھے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور تین بیٹے سوگوار چھوڑے ہیں۔ احبابِ جماعت سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔''

اُمی جان ''مبارکہ قمر سیالکوٹی''

امی جان کا پورا نام مبارکہ قمر تھا۔آپ 1920ء میں سیالکوٹ شہر کے محلہ اراضی یعقوب میں پیدا ہوئیں۔آپ کے والد حضرت مہر غلام حسین ؓ صحابی اور والدہ محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ صحابیہ تھیں۔والد باغبان قوم کے ایک معزز رکن تھے۔پیشہ کے لحاظ سے کسان تھے۔شہر سے تقریباً ایک کوس کے فاصلے پر واقع زرعی اراضی کے مالک تھے۔اس زمانے میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ٹریکٹر کی شکل تک لوگ نہیں جانتے تھے،دوسرے ترقی یافتہ زرعی آلات بھی موجود نہ تھے۔کسان کی سب سے بڑی جائیداد اس کے بَیل تھے۔بَیلوں کی جوڑی سونا اگلنے کا ذریعہ تھی،جن سے ہل چلانے کا کام لیا جاتا تھا۔کولہو سے تیل نکالا جاتا تھا نیز راہٹ والے کنوئیں سے پانی بھی نکالا جاتا تھا۔اسی سے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔بَیل راہٹ کے کنوئیں سارا سارا دن کھینچتے تھے تب کہیں جا کر بمشکل کھیت سیراب ہوتا تھا۔یوں سمجھ لیجیے بَیل زمینوں کو زندگی بخشنے کا ذریعہ تھے۔بَیل زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوتے تھے۔بَیل سے ہی کسان کی روزی اور روٹی چلتی تھی۔جس وقت امی کی پیدائش ہوئی عجب سانحہ ہوا۔امی کی پیدائش سے چند دن پہلے یکے بعد دیگرے دو بیل مر گئے۔کسان نہایت مشکل سے پیسہ جوڑتا تھا۔اس وقت وسائل بھی نہایت محدود تھے۔جمع شدہ پونجی سے بَیل خریدے گئے جو زندہ نہ رہے۔اب نانا جان تیسرا بَیل خرید کر لائے تو وہ بھی بیمار ہو گیا۔گھر میں اچانک وقتی طور پر سخت تنگی آ گئی۔جس رات ہماری امی کی پیدائش ہوئی اس وقت چراغ میں صرف چند قطرے تیل باقی تھا،اور باہر تیسرا بَیل دم توڑ رہا تھا۔عجب پریشانی تھی۔والدین نے نوزائیدہ بچی کا نام مبارکہ رکھا۔

ہماری نانی جان کی تمنا تھی کہ یہ بیمار بَیل شہر کی حدود سے باہر جا کر ہمارے کھیتوں پر دم توڑے تو کم از کم اس کی کھال کے پیسے مِل جائیں کیونکہ اگر کوئی جانور کمیٹی کی حدود میں مر جاتا تو

کمیٹی والے اس کے ذمہ دار ہوتے اور جانور کی کھال کمیٹی کے کھاتے میں چلی جاتی جو کافی مالیت کی ہوتی تھی۔ اگلے دن نانی اماں نیم مُردہ بَیل کے قریب گئیں۔ دعائیں پڑھتے ہوئے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بَیل کو چمکارا، نیم مُردہ بَیل نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھا۔ بَیل نے چلنا شروع کیا اور شہر کی حدود پار کرنے کے بعد نانا جان کے کنوئیں کے پاس پہنچ کر دم توڑ دیا۔ یوں نانی جان کی یہ دعا بھی قبول ہوئی اور انہوں نے اس مشکل وقت میں بیل کے چمڑے کو فروخت کر کے کچھ رقم وصول کر لی۔ گویا یہ بھی ایک معجزہ تھا یا نئی بچی کے گھر میں آنے کی برکت تھی، خدا تعالی نے فضل فرمایا۔ امی کو مبارک، مبارک کہہ کر پکارا جانے لگا۔ بعض بچے واقعی خوش بختی لے کر آتے ہیں۔ ہمارے نانا جان کے گھر میں بھی یہی ہوا کہ اس بیٹی کے بعد پھر خوش حالی کا دور دورہ ہوا، مالی حالات بہتر ہو گئے۔ جانور بھی بچ رہے۔ اس سال فصل اچھی ہوئی۔ جلد ہی امی کی پیدائش کے بعد گھر میں خوشحالی آ گئی۔

تعلیمی سرگرمیاں اور فنِ تقریر

آپ نے ابتدائی تعلیم احمدیہ گرلز سکول سیالکوٹ میں حاصل کی۔ یہ مدرسہ احمدیہ مسجد کے ساتھ تھا جو کبوتروں والی مسجد کہلاتی تھی۔ احمدیہ سکول کا معیار بہت اعلی تھا۔ پڑھائی کے علاوہ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی رہیں۔ اپنے ادارے کی بہترین کھلاڑی کی حیثیت سے پہچانی گئیں۔ دینیات میں چاندی کا تمغہ اور دوسرے متعدد انعامات مختلف سرگرمیوں میں حاصل کئے۔ احمدیہ سکول میں آپ نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد لیڈی اینڈرسن انگریزی سکول (عیسائی ادارہ) میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔

آپ کی تمنا تھی کہ ڈاکٹر بنیں۔ آپ نے سکول کی ڈگری امتیازی نمبروں میں حاصل کر لی اور میڈیکل کے لئے چن لی گئیں۔ دیرینہ آرزو پورا ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ جس کے خواب دیکھا کرتی تھیں اب اس کی تعبیر سامنے تھی مگر اسی سال خواتین کے اس ادارے کو مخلوط بنا دیا گیا، اس

شرط پر کہ اگر خواتین نہ آئیں تو اگلے سال ان کی نشست برقرار رکھی جائے گی۔ ابتدائی صحابی کی بیٹی کے لئے یہ ناممکن تھا۔ امی اکثر مجھ سے اس واقعہ کا ذکر کرتیں۔ کاش مخلوط تعلیم نہ ہوتی اور مَیں ڈاکٹر بن جاتی۔ دنیاوی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ کالج کی انتظامیہ نے وعدہ کے مطابق آپ کا نام اگلے سال کی فہرست میں بھی رکھا مگر مخلوط تعلیم کو بھی جاری رکھا۔ ان کا یہ نیا تجربہ کامیاب ہو گیا اور یہ ادارہ مخلوط تعلیم کے نام سے ہندو لڑکیوں کی نشستوں پر چلتا رہا۔ حالانکہ کوئی مسلمان یا سکھ لڑکی بطور احتجاج نہ بھیجی گئی۔

انہی دنوں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے عورتوں اور مردوں کی دینی و روحانی تعلیم و ترقی کے بارے میں سوچا۔ یہ دینیات کا چار سالہ کورس تھا جس میں آپ نے داخلہ لے لیا۔ اس کلاس کے منتظم اعلیٰ خود حضور تھے۔ اس کے علاوہ سید سرور شاہ صاحب، مولانا ابوالعطاء جالندھری، مولانا عبدالمالک جیسے قابل اصحاب کے ہاتھوں آپ کے علم کو جلاء ملی۔ آپ کے دل میں اپنے اساتذہ کی بہت عزّت تھی جس کا وہ اکثر ذکر کرتیں اور ان کو دعائیں دیتی تھیں۔ انہوں نے علم دینے والے کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کیا۔ خود بھی علم دوست تھیں اور علم کی قدر کرنا جانتی تھیں نیز ہمیں استاد کی عزت کرنے کی ہمیشہ نصیحت کی۔ ایک بات وہ چلتے پھرتے دہرایا کرتی تھیں۔ ''بے ادب بے نصیب با ادب با نصیب'' ہماری تربیت ان کا مقصد تھا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان میں تقریر کرنے کی خداداد صلاحیت بہت نمایاں تھی۔ ہر فن کو نکھرنے کے لئے کوئی وسیلہ چاہئے۔ آپ کی صلاحیتوں کو چمکانے میں دو استانیوں آپا فضیلت بیگم صاحبہ اہلیہ محترم میر عبدالسلام سیالکوٹ اور آپا عصمت صاحبہ سیالکوٹ (معلمات مدرسہ احمدیہ سیالکوٹ) کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ آپ فی البدیہہ بولتی تھیں۔ آپ نے پہلی تقریر ساتویں جماعت میں کی اور لُطف کی بات ہے کہ اتنی چھوٹی عمر میں خود ہی تقریر تیار کی۔ دراصل ان کا حافظہ غیر معمولی تھا اگرچہ قوت گویائی والد سے ورثے میں ملی تھی۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھیں۔

سیالکوٹ کی لڑکیاں جماعت کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہیں۔ سیالکوٹ ایسی جگہ تھی جس کو عیسائیوں نے اپنے مفاد کے لئے چن لیا تھا۔ یہ نہ صرف عیسائیت کا گڑھ تھا بلکہ صنعتی مرکز ہونے کے لحاظ سے یہاں ہندو، سکھ، مسلمان، انگریز ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ رہتے تھے۔ جلسے، تقاریر، جلوس ہماری تہذیب کا حصہ ہیں۔ یہی ایک کارآمد ہتھیار تھا جس کے ذریعہ سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پیغام پہنچایا جاتا تھا۔ آپا فضیلت صاحبہ اجلاس کے دوران لڑکیوں کو جی بھر کر بولنے کا موقعہ دیتی تھیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ طالبہ کو بددل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اگر وقت ختم ہو جاتا اور کچھ طالبات رہ جاتیں تو اگلے دن بھی جلسہ بلا لیا جاتا۔ انہوں نے کسی لڑکی کو کبھی یہ نہ کہا تھا کہ تم دو یا تین منٹ لو گی بلکہ جتنا مرضی بولنے کی کھلی اجازت تھی۔

احمدیہ سکول میں دوسرے مذاہب کی لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ جلسہ شروع ہوتا، امی تقریر کے لئے کھڑی ہوتیں۔ کوئی لڑکی ہنستی یا مذاق اڑاتی تو آپ قطعاً نہ گھبراتیں، اُلٹا اس کو تیوری چڑھا کر گھورتیں۔ یوں بھی ہوتا کہ آپ نے اسلام کے محاسن کے موضوع پر بولنا شروع کیا۔ اتنے میں کوئی عیسائی طالبہ یا عیسائی مہمان پنڈال میں داخل ہوئے۔ امی نے موضوع تبدیل کر لیا اور وفات مسیح پر یا ردِّ کفارہ کے موضوع پر بولنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد دیکھا کہ سکھ لڑکیاں آئی ہیں تو گورو نانک دیو جی کا موضوع چھیڑ دیا۔ ہندو طالبات پر نظر پڑی تو ہندو مذہب کا اسلام کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب امی کی عمر تقریباً چودہ یا پندرہ برس تھی۔ اتنے بچپنے میں ان کو ان تمام مسائل کے بیان کرنے پر عبور حاصل تھا۔ قرآنی آیات حفظ تھیں، بائیبل کے حوالے زبانی یاد تھے، گورو گرنتھ کی عبارتیں یاد تھیں۔ صداقت حضرت مسیح موعودؑ کو بیان کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد احادیث یاد تھیں۔ آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیاں عربی اور فارسی حوالوں کے ساتھ یاد تھیں۔ آپ کی اس دینی تربیت میں والدین کے علاوہ بڑے بھائی حضرت مولانا نذیر احمد مبشر صاحبؓ کا بھی ہاتھ تھا۔

سیالکوٹ کے جلسوں میں بارہا تقریر کرنے سے آپ صیقل ہو چکی تھیں۔ پھر جب آپ مزید

تعلیم کے لئے قادیان کی دینیات کلاس میں شامل ہوئیں تو آپ کے فن کو مزید جلا ملی۔ ذیل میں چند خاص موقعوں کا اختصار سے ذکر کیا جاتا ہے:

امام مہدی کے دور کی ایک خاص بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف اور مدح کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان کے طُول وعرض میں جلسہ سیرۃ النبیؐ کا قیام تھا۔ پھر سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلسے غیر احمدیوں میں بھی رواج پا گئے۔ تاریخ لجنہ اماء اللہ میں درج ہے۔ انہی دنوں لاہور کی ایک انجمن نے ''جلسہ مذاہب پیشوایان'' منعقد کیا۔ چنانچہ جماعت نے مبارکہ قمر صاحبہ کو محترمہ اُستانی میمونہ صاحبہ کی سرپرستی میں محمڈن ہال لاہور میں بطور نمائندہ تقریر کرنے کے لئے بھیجا۔ جس کا ذکر تاریخ میں یوں ملتا ہے:

''مستورات لاہور کا جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال بیرون موچی دروازہ جو کہ محمڈن ہال بھی کہلاتا تھا میں، زیرِ صدارت نواب بیگم صاحبہ منشی فاضل مدرسہ تہذیب البنات، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلسے کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا گیا۔ یہ جلسہ دو دنوں پر مشتمل تھا۔ جس میں کثیر تعداد میں غیر مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی اور مُسلم خواتین اور بچیوں نے شرکت کی۔ جس میں مختلف بہنوں نے تقاریر کیں۔ وہاں مبارکہ قمر صاحبہ کو دو تقاریر کرنے کا موقعہ ملا۔ آپ نے نہایت عُمدہ انداز میں اسلام کے محاسن بیان کئے۔" (تاریخ لجنہ اماء اللہ۔ حصہ اوّل)

تاریخ لجنہ اماء اللہ سے پتہ چلتا ہے کہ مبارکہ بیگم صاحبہ کو مختلف جلسہ ہائے احمدیت یعنی جلسہ سالانہ، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خلافت سلور جوبلی، تحریک جدید، جلسہ مسیح موعودؑ میں تقاریر کرنے کا موقعہ ملتا رہا۔ آپ نہایت مؤثر تقریر کرتیں۔ چونکہ ان کی آواز بہت بلند ہوتی تھی اس لئے ان کی تقریر شوق اور توجہ سے سُنی جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت مسیح موعودؑ کے پیروکاروں کو بھی آپ کے الہام ''مضمون بالا رہا'' کا ورثہ نصیب ہوتا رہا۔ خدا تعالیٰ اس ورثہ کی برکتیں ہماری اگلی نسلوں میں بھی قائم رکھے۔ آمین۔ اس وقت کی دینیات کلاس کا تاریخ میں ایک یوں بھی ذکر ملتا ہے کہ نصرت

گرلز سکول کی دینیات کلاس درجہ ثالثہ کی طالبات کی قائم کردہ ''سوسائٹی اشاعت مصباح'' جس کا مقصد مصباح کے معیار اور اشاعت کو بڑھانا تھا۔اس کے تحت امی نے پانچ خریدار بنانے پر انعام حاصل کیا۔(بحوالہ تاریخ لجنہ اماء اللہ)

آپ کو ادب سے بہت لگاؤ تھا۔کبھی کبھار لکھتی تھیں۔مگر جو بھی لکھا ادبی انداز میں خوبصورت لکھا۔درثمین اور کلام محمود کی کئی نظمیں رٹی ہوئیں تھیں۔کبھی کبھار شعر کہا کرتی تھیں۔ان کی ایک نظم مصباح میں چھپی تھی۔جس کے دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں:

خلیفہ ہمارا جو رشک قمر ہے
خدائی صحیفوں میں اس کی خبر ہے
ارے مُنکرو کھول کر کان سُن لو
ٹھکانہ تمہارا یہی اک شجر ہے

آپ کی شادی تقریباً 22-23 سال کی عمر میں ہوئی۔اس وقت نانی جان کی وفات ہو چکی تھی۔ ہماری بہن امۃ الآخر نے امی کی شادی کے بارے میں اپنی یادوں کو کچھ یوں سمیٹا ہے:

''جب اباجی نے شادی کا پیغام دیا تو نانا جان (حضرت غلام حسنؓ صاحب) نے سات راتیں استخارہ کیا۔ایک رات خواب میں ہر طرف پھول اور بعد میں درخت دیکھا۔اس خواب کی تعبیر انہوں نے یوں نکالی:

پھولوں سے مراد بیٹیاں ہوں گی اور ان کا سامان بھی اللہ تعالیٰ خود ہی کرے گا۔

پھر ایک رات وہ استخارہ کر رہے تھے اور نہایت زاری سے دعا کر رہے تھے۔جب وہ قیام کے لئے کھڑے تھے تو انہوں نے کشفاً ایک نظارہ دیکھا کہ آپ کے کھیت میں تین گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔حضرت مسیح موعودؑ تشریف لائے ہیں۔آپ کے ہاتھ میں ایک بوٹا ہے جو آپ نے درمیانی گڑھے میں لگا دیا ہے۔اس نظارے کے بعد نانا جان کو خوب تسلی ہوگئی اور امی کی شادی طے پا گئی۔''

شادی کے بعد جلد ہی ابا جی کو دوسری عالمگیر جنگ لڑنے کے لئے بلاوہ آ گیا۔اس وقت کا حال امی یوں بتایا کرتی تھیں:

''دوسری جنگِ عظیم کے باعث گھر میں پیسہ باقاعدہ نہ آتا تھا۔اس قلیل آمدنی کے باوجود بھی میں اکثر بکرا صدقہ کے طور پر دیا کرتی تھی۔ ہر وقت سانس سوکھا رہتا تھا نہ جانے کس وقت بری خبر آ جائے گی وہ محاذ پر ہی تھے کہ امی کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔''

خدمات دین

اب مَیں اپنی بہن نبیلہ رفیق فوزی کے مضمون کا کچھ حصہ بیان کرتی ہوں جو یادِ رفتگان کے کالم کے تحت ماہنامہ مصباح میں چھپ چکا ہے۔

''امی کا بیان ہے کہ اپنے بزرگان اور بھائی کی نیک اور جوشیلی صحبت کی وجہ سے بچپن ہی سے میرے اندر بھی دعوتِ الی اللہ اور تقاریر کا جذبہ شدت سے بھر چکا تھا۔میرا یہ شوق دیکھ کر جماعت کے ایک بزرگ محترم اللہ دتہ صاحبؓ نے دعوتِ الی اللہ اور جماعتی دوروں کے سلسلہ میں مجھے اپنے ساتھ لے جانا شروع کیا۔وہ مجھ سے خواتین میں تقریریں کرواتے اور لجنہ کی تنظیم قائم کرواتے۔اس بزرگ ہستی کی ہمراہی میں عاجزہ نے بہت سی لجنات کی تنظیمات قائم کیں۔ مثلاً گودھپور، درگاہ والی، رسول پور، پنڈال، ظفروال، چونڈہ، پھٹے، باگو(اور بھی بہت تھیں جواب ذہن میں نہیں)اس کا ذکر تاریخ کے حوالے سے ملاحظہ ہو:

''19/اپریل 1941ء کا واقعہ ہے کہ درگاہ والی اور مُگرا ضلع سیالکوٹ میں لجنہ کی تنظیم قائم ہوئی۔صبح دس بجے جلسہ کیا گیا اور افتتاح ہوا۔مبارکہ قمر اور رفیقہ حیات نے تقریریں کیں۔یہ گاؤں پاس پاس ہیں اس لئے درگاہ والی،مُگرا اور رسول پورہ کی ایک لجنہ کی تنظیم قائم ہوئی۔

(مصباح جون 1941)

دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے 5 سال تک سیکرٹری ناصرات الاحمدیہ سیالکوٹ شہر کی

حیثیت سے خدمت کرنے کی توفیق ملی۔شادی کے بعد میَں اپنے سسرالی گاؤں بوبک متر، جو کہ سیالکوٹ کے نواح میں ہے، چلی گئی اور وہاں اپنی ساس محترمہ کے ساتھ مل کر تعلیم اور تبلیغ کا کام 2 سال تک جاری رکھا۔میری محترمہ ساس صاحبہ اللہ کے فضل سے قرآن و حدیث کا بہت علم رکھتی تھیں۔سارے گاؤں کے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔میَں نے بھی ان کے ساتھ مل کر تبلیغ اور تعلیم کا کام شروع کیا۔پھر میَں اپنے میاں کے پاس کشمیر چلی گئی۔1946ء کا سال تھا۔اس دوران میَں نے کشمیر سری نگر میں جا کر لجنہ قائم کی اور سری نگر کی پہلی لجنہ کی صدارت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈالی گئی۔میَں نے سیکرٹری تعلیم محترمہ امۃ المہدی اہلیہ ڈاکٹر بشیر محمود سیکرٹری تعلیم کو لے کر گھر گھر دورے کئے۔اس سے بہت بیداری پیدا ہوئی۔خواتین اجلاسات میں کثرت سے آنے لگیں۔ان کے اجلاس بھی مسجد میں ہونے لگے جہاں ان کو تربیتی مضامین سننے کو ملتے۔یہاں ہمارا قیام اکتوبر 1947ء تک تھا۔گویا ایک سال تک بطور صدر لجنہ سری نگر کشمیر خدمتِ دین کی توفیق ملی۔1947ء سے 1951ء تک موضع دسوہا میں قیام رہا۔اس گاؤں میں ہمیں زرعی اراضی ملی تھی گاؤں میں سخت مخالفت تھی مگر نامساعد حالات کے باوجود مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہاں بھی ان 4 سالوں میں تبلیغ کی توفیق ملتی رہی۔

1951ء سے 1955ء تک میاں کے ساتھ قادیان میں درویشی کی زندگی بسر کی کیونکہ حضرت مصلح موعودؓ نے ڈاکٹر صاحب کو ہسپتال کھولنے کی غرض سے قادیان بھیجا ہوا تھا۔میرے قادیان پہنچنے پر حضرت مولانا عبدالرحمانؓ جٹ صاحب نے عاجزہ کو سارے ہندوستان کا صدر مقرر کیا۔ چنانچہ عاجزہ نے قادیان میں رہ کر 5 سال تک بطور صدر لجنہ ہندوستان خدمت دین کی توفیق پائی۔“

زمانہ درویشی میں قادیان میں خدمت دین کے مواقع

محترمہ صاحبزادی سیدہ امۃ القدوس بیگم صاحبہ کی تحریر کردہ کارگذاری رپورٹ ملاحظہ ہو:

1947ء کے بعد بھارت میں احمدی خواتین کی خدمات دینیہ کا خاکہ

رپورٹ کارگذاری لجنہ اماء اللہ مرکزیہ قادیان (بھارت)

تقسیم ملک کے چار سال بعد جب مستورات کو قادیان آنے اور رہنے کی اجازت ملی اور قادیان میں کچھ عورتوں نے مستقل رہائش اختیار کرلی تو اس وقت یعنی 1951ء میں محترمہ مبارکہ بیگم صاحبہ اہلیہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب انچارج احمدیہ ہسپتال قادیان نے لجنہ اماء اللہ کے کام کی طرف توجہ دی اور نہ صرف قادیان میں بلکہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں مختلف مقامات پر جہاں بھی احمدی مستورات تھیں لجنہ کے کام کو عملی طور پر باقاعدگی سے شروع کروایا۔ چنانچہ ان کی کوشش کے نتیجہ میں 1953ء تک چند مقامات پر مثلاً حیدرآباد، سکندرآباد (دکن) بنگلور، مدراس، بھاگلپور، بھرت پور اور چنتہ کنٹہ میں لجنات کا کام شروع ہوگیا اور ان کی طرف سے مرکز میں چند سال کے تعطل کے بعد رپورٹ آنی شروع ہوگئی۔

آپ فرماتی ہیں:

''میں جب 1953ء کے شروع میں قادیان آئی تو مجھے جنرل سیکرٹری لجنہ اماء اللہ منتخب کیا گیا اور میں نے صدر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ مبارکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ مل کر جون 1953ء سے 1955ء تک حسب توفیق لجنہ اماء اللہ کا کام کیا۔ چنانچہ 1955ء کے آخر تک سولہ مقامات پر لجنہ اماء اللہ کے کام کا اجراء ہوگیا۔

1955ء میں محترمہ مبارکہ بیگم صاحبہ صدر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ مستقل طور پر پاکستان چلی گئیں اور مئی 1955ء میں میرا انتخاب بطور صدر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ و مقامی قادیان عمل میں آیا۔''

(بحوالہ۔ الفرقان ربوہ۔ درویشانِ قادیان نمبر)

اس کے علاوہ آپ کو خدمتِ دین کے بعض دوسرے مواقع بھی ملتے رہے۔ جب سے مَیں نے ہوش سنبھالا، مَیں نے اپنی والدہ کو گھر سے دینی علوم کی بہترین استاد کی وجہ سے مشہور پایا۔ پھر جولائی 1955ء میں پاکستان آنے کے بعد مختلف خدمات کی توفیق ملتی رہی۔ 1964ء میں حضرت سیدہ چھوٹی آپا صاحبہ نے آپ کو دارالرحمت شرقی ب کی صدر لجنہ مقرر فرمایا خدا کے فضل سے آپ نے یہ ذمہ داری کئی برس نبھائی۔

1985ء میں لندن آئیں تو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے مختلف حلقہ جات میں جا کر تقاریر کرنے کا ارشاد فرمایا۔ لہٰذا آپ نے برطانیہ میں قیام کے دوران مختلف حلقہ جات میں لجنہ و ناصرات میں مختلف فقہی اور اختلافی مسائل پر تقاریر کیں۔

پھر ان کو صدر موصیان بنایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو 1991ء تک 9 سال تک کام کرنے کی توفیق دی۔ ان کو کم وبیش 29 سال خدمت کی توفیق ملی۔ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

آپ تمام عمر تبلیغ کے مواقع ڈھونڈتی رہیں۔ اپنی سمجھ کے مطابق تبلیغ کرتیں۔ نہایت خوداعتمادی سے بولتیں۔ آپ کے ذریعہ کئی لوگوں کو ہدایت نصیب ہوئی۔ آپ کی ایک ہم جماعت نے بھی احمدیت قبول کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آخر وقت تک سلسلہ سے منسلک رہیں۔ امی کی ایک خوبی ان کا نڈر ہونا تھا۔ ہر جگہ سفر وحضر میں احمدیت کی اشاعت کے مواقع ڈھونڈتی رہتیں۔ نہ بھی موقعہ ملے تو خود ہی موقع پیدا کر کے تبلیغ شروع کر دیتیں۔

حضرت سیدہ چھوٹی آپا صاحبہ آپ کو ربوہ سے باہر دوسری جماعتوں میں تربیتی کلاسز لگانے کے لئے بھیجا کرتی تھیں۔ چنانچہ آپ کو تین مرتبہ سرگودھا، دو مرتبہ فیصل آباد، دو مرتبہ لاہور، تین مرتبہ اوکاڑہ اور ایک مرتبہ گوجرانوالہ میں 10- 15 روزہ تربیتی و قرآن کلاسیں منعقد کرنے کی توفیق ملی۔ سرگودھا کی کلاسیں بہت کامیاب رہیں۔ حاضری %100 ہوتی تھی۔ صرف سرگودھا شہر ہی نہیں بلکہ اردگرد کے دیہات سے بھی خواتین تشریف لائیں۔ (تاریخ لجنہ اماء اللہ)

لاہور کی کلاس کو ایک مرتبہ جنگ کی وجہ سے اور دوسری مرتبہ مذہبی فسادات کی وجہ سے مقررہ

وقت سے پہلے ختم کر دینا پڑا۔ دونوں دفعہ نہایت گرمجوشی سے کثیر حاضری کے ساتھ کلاس شروع ہوئی مگر تکمیل تک نہ پہنچی۔ آپ کا طریق نہایت آسان اور عام فہم ہوتا تھا۔ کہانی کے سے انداز میں سمجھایا کرتی تھیں۔ قرآن پاک کا کچھ حصہ با ترجمہ اور تفسیر احادیث، فقہی و اختلافی مسائل، وفات مسیح، خاتم النبیین، ردّ کفارہ اور امام مہدی کے ظہور کے موضوع پر آسان انداز میں سیر حاصل بحث ان کی کلاس کا اہم حصہ تھا۔ تاریخ اسلام اور تاریخ احمدیت بھی کہانیوں کی صورت میں سناتیں۔ درثمین کی بعض نظموں کی تشریح اور صداقت حضرت مسیح موعودؑ کا بیان بھی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ علمی سوال و جواب کی محفل ہوتی۔ خواتین اور بچیوں نے روزمرہ پیش آنے والے اعتراضات لکھ کر رکھے ہوتے تھے، جن کا ان کو جواب ملتا تھا۔ جن دنوں امی کلاس لگاتیں لجنہ تبلیغی سرگرمیاں تیز تر کر دیتی تا کہ جن اعتراضات کے وہ خود جواب نہ دے سکیں ان کا جواب حاصل کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ لجنہ اپنی واقف کار غیر از جماعت خواتین کو بھی ساتھ لے کر آتیں۔ امی کی ایک بڑی خوبی تھی کہ ماحول کو بہت خوشگوار رکھتی تھیں۔ دوستانہ ماحول میں چٹکلے لطیفے سناتے ہوئے دوسرے کو قائل کرنا ان کو آتا تھا۔

لڑکیوں کی مزید تعلیم کے لئے جامعہ نصرت کالج ربوہ کا قیام عمل میں آیا تو کچھ عرصہ کے بعد ''جامعہ نصرت آرگنائزنگ کمیٹی'' بنائی گئی۔ چنانچہ آپ کو بھی اس کمیٹی کا آنریری ممبر بنایا گیا۔ اس کمیٹی کے اجلاسات میں آپ دلچسپی سے حصہ لیتی تھیں۔ خاص طور پر آپ نے لڑکیوں کو سائنس پڑھانے کی طرف بہت توجہ دلائی۔ آخر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سائنس بلاک کا اجراء ہوا اور سائنس کی کلاسیں شروع ہو گئیں۔

جامعہ نصرت گرلز کالج کی کمیٹی کے اجلاسات میں آپ نے کالج کے سالانہ فنکشن کے موقع پر ''اسلامی مذاکرہ'' کو رواج دینے کے لئے زور دیا۔ نئے اور اچھوتے مقابلے کا جامعہ نصرت کے پروگرام میں اضافہ کر کے پاکستان کے تمام کالجوں کو دعوت نامے بھجوا دیئے گئے۔ جو ٹیمیں ربوہ آئیں ان کو یہ مقابلہ بہت پسند آیا۔ اس کے بعد واپس جا کر انہوں نے بھی اپنے یہاں

اسلامی مذاکرے کو رواج دیا۔ اور یوں سارے پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اسلامی مذاکرہ کو پسند کیا جانے گا۔

احمدیہ گرلز ہائی سکول سیالکوٹ کا 50 سالہ جشنِ تشکر

احمدیہ گرلز ہائی سکول سیالکوٹ کا ادارہ اس وقت تک ہزاروں احمدی اور غیر احمدی لڑکیوں کو علم کے زیور سے آراستہ کر چُکا ہے 50 سالہ جشنِ تشکر کے موقعہ پر سکول کی قدیم طالبات کو بلایا گیا۔ حضرت چھوٹی آپا صاحبہ نے امی کو خصوصی دعوت نامہ بھیجا اور فون کر کے بھی جانے پر اصرار کیا۔ اس موقعہ پر تقریباً تمام قدیم طالبات موجود تھیں۔ چنانچہ امی نے مندرجہ ذیل تقریر اس موقعہ پر کی:

تقریر

لجنہ اماء اللہ سیالکوٹ کی مساعی جمیلہ

(تحریر مبارکہ قمر صاحبہ)

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

مَیں بھی اسی چمن کی کبھی بُلبل ہوا کرتی تھی۔ اسی چمن میں فنِ گویائی سیکھا اور بعد میں مبارکہ قمر سیالکوٹی کے نام سے معروف ہوئی۔

آج میرے لئے بہت ہی خوشی کا مقام ہے کہ تیس سال کے بعد مَیں پھر اسی بھرے مجمع سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ مجھے اپنی بزرگ ہستیاں یاد آ رہی ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر ایک اپنے کام کی داد چاہتا ہے۔ اسی سکول کے جلسوں میں تقریر کرنے کے بعد سٹیج پر محبت و پیار بھری شاباش اپنی محبوب صدر سیّدہ فضیلت صاحبہ کے منہ سے تعریف سُننے کے بعد سیدھی اس پیاری ہستی کے پاس، جو آج ہم میں نہیں اور ان کی بیٹی نصرت راشدی آپ کے ساتھ وابستہ ہے،

محترمہ آپا زبیدہ صاحبہ مرحومہ کے پاس جاتی اور مرحومہ مترنم قہقہہ کے ساتھ ''مرحبا میری بیٹی آؤ پیار کروں'' کہہ کر اپنے ساتھ چمٹا لیتیں اور ماتھا چومتے ہوئے کہتیں کہ ''بیٹی آج تم نے میرا دل خوش کر دیا۔''

میری ہم سفر بہنو! آپ سیالکوٹ کی لجنہ اماء اللہ جتنا بھی اپنی خوش قسمتی پر فخر کرے کم ہے کیونکہ اس زمانہ کے موعود فرستادہ نے فرمایا:

''مَیں سیالکوٹ کی زمین اور قادیان کی زمین کو ایک سمجھتا ہوں''

اپنی زندگی کا ایک اہم اور لمبا حصّہ حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام نے سیالکوٹ میں ہی گذارا اور وہ کام، جو کہ مستقبل میں خدا تعالیٰ آپ کو سونپنے والا تھا، اس کا آغاز کر دیا۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انہوں نے اپنا پہلا تبلیغی مشن لدھیانہ میں قائم کیا اور دوسرا تبلیغی اڈّہ، جس میں خدائے واحد ویگانہ کی جگہ تین خداؤں کے نام کا پرچار ہونے لگا، سیالکوٹ ماجی پورہ میں قائم کیا۔ یہیں پر آپ عیسائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ انگریز اپنی بڑھتی ہوئی ترقی کو دیکھ کر اپنی لندن کانفرنس میں یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یسوع مسیح کا جھنڈا مکہ اور مدینہ پر اور ہندوستان یسوع مسیح کی روشنی سے جگ مگ کرے گا اور ہندوستان (ہندوستان۔ پاکستان) میں بھی نمونہ کے لئے ایک مسلمان نہیں ملے گا۔ وہ کاسرِ صلیب جو سیالکوٹ میں عین جوانی کے دنوں میں آ کر ٹھہرا اور اپنے دلائل سے اسلام کا دفاع کیا اور آج اسلام جارحانہ رنگ میں یورپ پر یلغار کر رہا ہے اور تین خداؤں کے ماننے والوں کو توحید کے جھنڈے تلے جمع کر رہا ہے۔

آج، جبکہ لجنہ اماء اللہ سیالکوٹ اپنی پچاس سالہ جوبلی منا رہی ہے، مَیں اپنے چشم دید واقعات بیان کرتی ہوں۔ کیونکہ قومیں اپنی تاریخ سے ہی زندہ رہتی ہیں۔ 1924ء میں ایک دردمند دل رکھنے والی باہمت نوجوان خاتون حضرت محترمہ سیدّہ فضیلت صاحبہ نے اپنے شہر کی مستورات کی تربیت کے لئے ایک درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جماعت سیالکوٹ کے

اکابرین نے آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرت بابو روشن صاحب اور حضرت ماسٹر عبدالعزیز صاحب عملی طور پر مدد فرماتے اور درس دیا کرتے۔ میری عمر اس وقت پانچ برس کی تھی۔ خدا نے حافظہ اچھا عطا کیا تھا۔ ہر بات جو دیکھی اور والدین سے گھر میں سُنی ساری دل پر نقش ہوگئی۔ لجنہ قائم ہوئی، اس کا کوئی فنڈ نہ تھا۔ بالکل تہی دست لیکن ارادہ نیک تھا۔ اتنے بڑے کام کا بیڑا اُٹھا لینا بہت بڑی بات ہے۔ سب سے پہلے عمارت کا سوال پیدا ہوا تو حضرت مولوی فیض دین صاحب کی دونوں بیٹیاں جو کہ اپنے باپ کی جائیداد کی وارث تھیں، انہوں نے کمال حوصلہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے قربانی کی اور اپنی ساری زمین جو کہ احمدیہ مسجد کے ساتھ ملحق تھی سکول کی عمارت کے لئے وقف کر دی۔ ایک ان میں سے محترمہ آپا فاطمہ صاحبہ بیگم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کامتی والی ہیں اور دوسری محترمہ آپا میمونہ صاحبہ مرحومہ مغفورہ جو کہ امۃ القدیر صاحبہ پرنسپل جونیئر ماڈل سکول ربوہ اور مکرم عبدالسلام صاحب اختر کی والدہ ماجدہ تھیں۔

میری دو ٹرینڈ بہنیں استانی محترمہ صدیقہ صاحبہ اور محترمہ استانی محمودہ صاحبہ جو کہ مہر غلام حسین اور مہر غلام علی صاحب مرحوم کی لڑکیاں تھیں انہوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور دو اَن ٹرینڈ بہنیں سیدہ محمودہ بیگم و سیدہ مبارکہ بیگم صاحبہ جو کہ میر حسام الدین صاحب کی پوتیاں ہیں، ان چاروں نے پڑھانا شروع کر دیا اور پورا ایک سال بغیر ایک پائی لئے اس درسگاہ یعنی احمدیہ گرلز ہائی سکول کی بنیاد رکھی اور چلایا۔ ان میں سے صرف ایک محترمہ سیدہ محمودہ بیگم صاحبہ بنت میر حامد شاہ صاحب بقید حیات ہیں۔ آپا سکینہ صاحبہ مرحومہ نے اپنے 20 تولے کے کڑے سکول کے لئے بطور عطیہ دیئے۔ آپ تا حیات لجنہ کی سیکرٹری رہیں۔

حضرت مولوی عبدالرحیم صاحب نیرّ مرکز سے اس سکول کا افتتاح کرنے آئے۔ محترمہ فہمیدہ کھوکھر اور محترمہ امۃ المھدی نے ہمیں سبز دوپٹے دیئے۔ ہم سب بچیوں نے صدر محترمہ سیدہ فضیلت صاحبہ کا لکھا ہوا ترانہ پڑھا جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے:

مبارک ہو یہ افتتاح تیرے ہاتھ اے نیّر
صدق وصفا کی ہو درس گاہ، بے شک تو فرح فال ہے

زمین تو خدا نے عطا کر دی اب عمارت بننے والی تھی۔ مسجد کا صحن، مہمان خانہ اور مستورات کے جمعہ پڑھنے والی جگہ پر سکول بن گیا۔سکول کا اثاثہ کیا تھا! چند ٹاٹ، ایک کرسی، ایک میز، ایک حاضری کا رجسٹر، چار پیڑھیاں اور تختہ سیاہ وغیرہ۔

اساتذہ نے اتنی خوش اسلوبی سے کام کیا کہ بیک وقت چار کلاسیں کُھل گئیں اور خدا کے فضل سے اگلے سال ہی گورنمنٹ نے منظور کر لیا اور گرانٹ ملنی شروع ہوگئی۔ اس سکول کے چلانے کی ساری ذمّہ داری لجنہ پر تھی۔ مردوں پر کوئی بار نہ تھا۔ لجنہ اماء اللہ کی تاریخ میں یہ ایک واحد مثالی سکول ہے جس کا بوجھ اور چلانے کی ذمّہ داری لجنہ اماء اللہ سیالکوٹ کی ممبرات کے ناتواں کندھوں پر تھی۔ حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے لجنہ اماء اللہ سیالکوٹ کا چندہ ممبری اس سکول میں دینے کا ارشاد فرمایا۔ ممبرات اس سکول کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتی تھیں۔ معزز گھرانوں کی مستورات جن کو خدا تعالیٰ نے دنیاوی جاہ وحشمت بھی عطا کی تھی وہ بھی اس سکول کی خاطر اپنے ہاتھ سے سلائی کر کے اُجرت سکول کی مد میں بھیجتیں اور سکول کی خاطر کام کرنے کو عار نہ سمجھتیں۔ ایک سال تک مذکورہ بالا اساتذہ نے مفت پڑھایا اور سکول کی بنیاد بنائی اور جب گورنمنٹ کی طرف سے مدد ملنے لگی تو نصف تنخواہ گورنمنٹ سے ملتی اور نصف ادارہ کی طرف سے۔ مگر ہزاروں سلام ہو اُن قربانیاں کرنے والیوں پر، وہ رجسٹر پر پوری تنخواہ وصول پائی کے الفاظ لکھتیں مگر نصف واپس چندہ میں دے دیتیں۔

چونکہ یہ سکول خالص مذہبی رنگ میں تربیت کے لئے کھولا گیا تھا اس لئے دینیات کے لئے محترمہ حضرت آپا سیّدہ رفعت صاحبہ مرحومہ مغفورہ کو مقرر کیا گیا۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں گھرانوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ یہ سکول ایک نمونہ تھا صحیح اسلامی تعلیم کا۔ احمدی لڑکیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ سارا سکول غیر احمدی لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ احرار کے زمانہ میں لوگوں

نے بہت شور مچایا کہ مرزائی کافر ہیں ان کے سکول سے بچیوں کو نکال لو۔مگر والدین آگے سے جواب دیتے کہ ہماری لڑکیاں اس سکول میں جا کر سچی مسلمان ہوگئی ہیں اور جب ہماری بچیاں نماز کا ترجمہ اور پورے چھ کلمے فَر فَر سُناتی ہیں تو ہم شکر کرتے ہیں کہ مرزائیوں نے احمدیہ سکول جاری کر کے سیالکوٹ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔

مروّجہ نصاب جو کہ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ تھا وہ بھی پڑھایا جاتا تھا اور نماز باترجمہ ساری کی ساری۔ چھ کلمے باترجمہ اور دس آخری سورتیں یاد کرنا ہوتی تھیں۔مسلمان کی تعریف، مومن کی تعریف، منافق کی تعریف ازبر یاد کرائی جاتی۔اس نصاب میں پاس ہونا لازمی تھا۔خدا کے فضل سے گورنمنٹ نے سکول کی تعلیمی حالت دیکھ کر بہت جلد مڈل سکول منظور کر لیا۔

اس وقت سارے شہر سیالکوٹ میں آٹھ مڈل سکول تھے اور صرف ایک ہائی سکول تھا جو کہ خالص گورنمنٹ کا تھا۔ان سارے سکولوں کے ساتھ مقابلہ تھا۔یہاں تک کہ پرائمری کا امتحان بھی گورنمنٹ کے ماتحت ہوتا تھا۔خدا تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان تھا کہ احمدیہ گرلز ہائی سکول سب سکولوں میں ممتاز تھا۔

ایک بہت بڑی خوبی اس سکول کی یہ تھی جو کہ اور کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی اور لوگ حیرت سے دیکھتے تھے، وہ تھی لڑکیوں میں تقریر کرنے کا ملکہ پیدا کرنا۔حضرت آپا فضیلت صاحبہ جو کہ لجنہ کی صدر اور سکول کی ڈائریکٹرس تھیں، ان کو خدا تعالی نے بہترین تقریر کرنے کی اور مجمع کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہئے کہ اس وقت سارے ہندوستان و پاکستان میں صرف ایک ہندو لیڈی سروجنی نائیڈو اور دوسری آپا جان سیدہ فضیلت صاحبہ تقریر کرنے والیاں تھیں۔احمدیہ سکول نے تھوڑے ہی عرصہ میں تقریر کرنے والیوں کا ایک گروپ تیار کر لیا۔

محترمہ سیدہ فضیلت صاحبہ ہر ہفتہ جمعرات کے روز سکول آتیں اور بچیوں اور استانیوں کی تربیت تقریر کے ذریعہ کرتیں۔سارے سکول کو اکٹھا کر کے کبھی کسی لڑکی سے اس کی تعلیمی قابلیت

کا اندازہ کرتیں اور کبھی دوسری سے۔اس طرح سے بچیوں کو شوق ہوتا تھا کہ ہم کلمے اور نماز وغیرہ یاد رکھیں تا کہ ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑے اور اساتذہ کو یہ خیال ہوتا کہ اگر میری شاگرد لڑکی سے پوچھ لیا گیا اور وہ نہ بتا سکی تو ٹیچر کو شرمندگی ہوگی۔ یہ احساس استاد اور شاگرد کو چوکنّا رکھتا۔ادھر حضرت بابو روشن دین صاحب استانیوں کو قرآن کریم با ترجمہ پڑھاتے۔ لجنہ اماء اللہ کا ہر ماہ اجلاس ہوتا۔حوصلہ افزائی کی خاطر لڑکیوں میں انعام تقسیم ہوتے۔حضرت میر عبدالسلام صاحب مرحوم جو کہ جماعتِ احمدیہ سیالکوٹ کے امیر تھے اور آپا فضیلت صاحبہ کے شوہر تھے، وہ ہندوستان میں کرکٹ کے مایۂ ناز کھلاڑی تھے اور کرکٹ کھیلنے کے واسطے مغربی ممالک میں جایا کرتے تھے۔ وہ ہر ملک سے پیارے پیارے کھلونے لے کر آیا کرتے تھے اور دیگر چیزیں لاتے جو سکول کے سالانہ جلسہ میں بطور انعام بانٹ دی جاتیں۔

بچیاں تقریروں کی مشق کرتیں اور ہر لڑکی کو موقع دیا جاتا۔ مجھے اپنا یاد ہے کہ دورانِ تقریر مجھ پر کبھی وقت کی پابندی نہ لگائی گئی۔ مَیں جتنا چاہتی خوشی سے بول لیتی۔مستورات کی علم کی زیادتی کے لئے مختلف طریقے استعمال ہوتے۔ چنانچہ سکول کے جلسہ سالانہ کے موقع پر مناظرے کرائے جاتے،یعنی مذہبی مناظرہ۔ایک لڑکی احمدی ہوتی تو دوسری غیر احمدی۔احمدی لڑکی چھوٹی سی تقریر کرتی تو غیر احمدی لڑکی ہزاروں کے مجمع میں کھڑے ہوکر اس تقریر پر سوالات کرتی۔ پھر احمدی لڑکی اس کو جواب دیتی اور اس کی ہر طرح تسلی کرا دیتی۔اسی طرح ایک لڑکی ہندو بنتی تو دوسری مسلمان۔ ہندو لڑکی اسلام پر اعتراض کرتی تو مسلمان لڑکی جواب دیتی اور اسلام کی حقانیت اس پر واضح کر دیتی۔اسی طرح عیسائی اور مسلمان کے درمیان مناظرے کرائے جاتے۔

تربیت کے لحاظ سے اس بات کا پورا خیال رکھا جاتا کہ لڑکیوں پر مغربی تہذیب اثر انداز نہ ہو اور لڑکیاں اپنی رفتار، اپنی گفتار اور اپنے کردار سے احمدیت کی صحیح تصویر پیش کر سکیں۔ آپا سیدہ فضیلت صاحبہ کا ہمارے دلوں پر اتنا رعب تھا کہ جب ہم مڈل سکول کا امتحان پاس کر کے احمدیہ سکول سے جا چکے تھے تو ہائی سکول میں ایک ڈرامہ تھا۔اس ڈرامہ میں ایک راہب کا پارٹ ادا کرنا تھا جس نے ایک فاحشہ عورت کو ہدایت دینی تھی۔ میری آواز بھی بلند تھی اور یہ کردار ادا

کرنے کے لحاظ سے موزوں تھی۔ میری ٹیچر نے مجھے بہت ہی اکسایا۔ پیار سے اور رعب سے منانے کی کوشش کی کہ ڈرامے کے اس کردار کو ادا کروں مگر مَیں نے انکار کر دیا کہ احمدی لڑکی کے لئے یہ اچھا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپا جان کو پتہ لگے گا تو ناراض ہوں گی۔ مَیں نے تو ان سے یہی سبق سیکھا ہے کہ راہبر یا معلم باعمل ہونا چاہئے تبھی زبان سے نکلی بات اثر پیدا کرتی ہے۔

اس سکول میں ہمیں یہ سکھایا گیا کہ لباس جو چاہو پہنو لیکن اس میں عریانی نہ ہو۔ اب کئی قسم کے لباس نکل آئے ہیں۔ ہمارے وقت میں صرف ساڑھی اور شلوار قمیص ہوتی تھی۔ لیکن کسی لڑکی یا اُستانی کو چھوٹی آستین والی قمیص یا بلاؤز پہننے کی جرأت نہ ہوتی۔ مَیں نے بہت کثرت سے ساڑھی پہنی۔ اپنے اُستادوں کو پہنتے دیکھا۔ آپا جان کی بیٹیاں تنویر، قمر اور شاما کو پہنتے دیکھا لیکن عریانی کی حدود میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی۔ قول سے زیادہ فعل اثر انداز ہوتا ہے۔

سکول کے لئے مالی امداد حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے سوچے جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ عید کے موقعہ پر ہم چھوٹی لڑکیوں کو موتیے کے ہار دیئے گئے کہ عید کے موقعہ پر جب اکابرینِ جماعت نماز پڑھ کر واپس جانے لگیں تو ان کے گلے میں موتیا کے پھولوں کے ہار ڈالتے ہوئے عید مبارک کہنے کے بعد سکول کے لئے عیدی وصول کی جائے۔ جامع مسجد کبوتراں والی میں سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے ہم بچیاں دونوں طرف کھڑی ہو گئیں اور ہر جانے والے کو عید مبارک کہہ کر گلے میں ہار ڈال کر عیدی وصول کرتیں اور کم از کم 4 آنے سے لے کر 5 روپے تک قیمت وصول کرتیں جبکہ ہار کی قیمت صرف ایک پیسہ ہوتی۔ تبلیغی میدان میں بھی لجنہ اماء اللہ سیالکوٹ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ جب خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے حکم سے تبلیغی دن منائے جاتے اور حکم ہوتا کہ سکول بند کر کے مختلف دیہات میں ٹولیوں کی صورت میں تبلیغ کرنے نکل جائیں۔ ہم ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں اور عیسائیوں کے گرجاؤں میں ٹریکٹ تقسیم کرتیں۔ غیر مسلموں کو دعوتِ حق پہنچانے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے۔ کبھی ان لوگوں کو اپنے ہاں بلا کر امام الزمان کا پیغام پہنچاتیں اور کبھی ان کے گھر جا کر اسلام کی

دعوت دیتیں اور عیسائیوں کے جلسہ میں ان کے سٹیج پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت بیان کرتیں۔ ہندو، سکھ اور عیسائی لوگوں کو مدعو کیا جاتا اور ان کو اپنے احمدیہ سکول کے سٹیج پر بولنے کی دعوت دی جاتی۔

(نوٹ۔تقریر کا اتنا مواد مل سکا ہے جو مَیں نے لکھ دیا ہے باقی شاید ضائع ہو چُکا ہے)

اب مَیں قبولیت دعا کے چند واقعات درج کرتی ہوں۔

قبولیت دُعا کے چند ایمان افروز واقعات

☆ امی ہمیں بزرگوں کی دعاؤں کے قصے سنا سنا کر ہمارے دلوں میں درویشان احمدیت کا پیار ڈالتی تھیں۔ یہ واقعہ ہماری امی نے کہانی کی صورت میں ہمیں کئی بار سنایا۔ایک مرتبہ ہماری بہن ناصرہ اہلیہ چوہدری رشید احمد صاحب سیکرٹری پریس حال لندن دو سال کی عمر میں بہت سخت بیمار ہو گئیں۔ٹائیفائڈ کا شدید حملہ ہوا۔ تیز بخار چڑھا۔ بچی کی زبان سوکھ کر تالو کے ساتھ جا لگی اور گردن کندھے کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔ بچی باوجود کوشش کے گردن سیدھی نہ کر سکتی تھی۔اچھی بھلی باتیں کرنے والی بچی بالکل گنگ ہو گئی۔ان دنوں ابا جی قادیان میں درویش تھے۔ان کے پاس پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی بس دعاؤں کا سہارا تھا۔امی ابا جی کو ہر خط میں بیٹی کا حال لکھتیں جو بظاہر معذور ہو چکی تھی۔ابا جی ان کو حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کرتے اور آپ نے امی کو لکھا کہ دماغ تیار رکھو، بچی معذور ہو چکی ہے، کفن کے لئے کپڑا خرید کر رکھ لو، کچھ پیسے بھی ہر وقت پاس ہونے چاہئیں ان حالات میں کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

ابا جی ہر جمعہ یا دوسرے مواقع پر دعا کے لئے اعلان کرواتے۔اللہ تعالیٰ، جو کہ سمیع و مجیب ہستی ہے، نے ان درویشوں کی عرض سن لی۔عید کے دن باجی نے اٹک اٹک کر کہا ''میں نے بھی ساتھ جانا ہے۔'' گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔دعا کا یہ معجزہ امی نے ہمیں بہت کثرت سے سنایا اور نہایت محبت سے ذکر کیا کرتیں کہ میری بیٹی کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے درویشوں کی

پُرخلوص دعاؤں نے دوبارہ زندگی دی۔ان کے دل میں درویشوں کی محبت ایسے رچی ہوئی تھی گویا پھول کے ساتھ خوشبو ہو۔

☆ جب ہمارے بھائی خالد منیر احمد (حال لندن) کی پیدائش ہوئی تو چونکہ وہ سات بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لئے اس کی غیر معمولی خوشی تھی۔ پھوپھی محترمہ رشیدہ بیگم صاحبہ نے اس موقع پر بھائی کو سونے کی انگوٹھی تحفہ میں دی۔اس زمانے میں سونے کی انگوٹھی بہت اہمیت رکھتی تھی۔اب امی وَإِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ کے تحت یہ تحفہ واپس لوٹانا چاہتی تھیں۔ان کی طبیعت پر بہت بوجھ تھا۔وہ ابا جی کو کبھی تنگ نہ کیا کرتیں بلکہ دن رات اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اپنی توجہ دعا کی طرف پھیر لیتیں۔دن گذرتے رہے۔ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا۔ابا جی اپنی نئی شیروانی سلوا کر لائے۔امی نے اس کو استری کرنا چاہا تو ان کو محسوس ہوا کہ دائیں جیب کے نیچے اَستر میں کوئی چیز ہے جو استری کرنے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔امی نے ٹٹول ٹٹول کر اسے سلائی والی جگہ پر لا کر تھوڑی سی سلائی ادھیڑ کر اسے باہر نکالا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگئیں کہ ایک نہایت خوبصورت انگوٹھی تھی۔ابا جی اگلے دن اسی درزی کے پاس یہ انگوٹھی لے کر گئے اور کہا کہ آپ نے اسے میری شیروانی میں سی دیا ہے، آپ اسے واپس لے لیں۔درزی نے انکار کر دیا۔ابا جی نے اردگرد سب لوگوں سے پوچھا پر کوئی اس انگوٹھی کا مالک نہ نکلا۔سنار کو دکھائی، وہ واقعی سونے کی انگوٹھی تھی۔دل کو سمجھایا، اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔کچھ عرصہ کے بعد عید تھی۔امی وہ انگوٹھی پھوپھی جان کو تحفہ کے طور پر دے کر آئیں۔یوں اللہ تبارک تعالیٰ نے امی کی مراد پوری کی۔آپ نے قبولیت دعا کا یہ واقعہ ہمیں بہت مرتبہ سنایا اور دعا پر استقامت اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کرنے کی ہمیشہ تلقین کی۔ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا۔

☆ آج سے کوئی چالیس برس پیچھے لوٹیں تو آپ کو ربوہ ایک چھوٹا سا قصبہ نما گاؤں نظر آئے گا۔کوئی رکشہ، ویگن، بس یا ٹانگوں کی بھرمار نظر نہ آئے گی۔سفید پوش لوگ پیدل سفر کیا کرتے تھے۔سامان اٹھانے کے لئے قُلی مل جاتے تھے۔ان دنوں ربوہ میں صرف دو ہی ٹانگے والے

تھے جو شہر بھر کی خدمت کرتے اور ان کی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ **فجزاھم اللہ**۔

ایک مرتبہ امی جان کو اچانک سفر پر جانا پڑا۔ صبح سویرے سحری کے وقت ان کو بس کے اڈہ پر جانا تھا۔ ٹانگا میسر نہ آ سکتا تھا۔ وقت نکلا جا رہا تھا۔ ہمارا گھر دارالرحمت شرقی ب میں واقع ہے۔ جب کہ دونوں یکے والوں کا گھر بہت فاصلے پر الف محلہ میں تھا۔ اس وقت شہر میں فون بھی نہ ہوتا تھا۔ آپس میں رابطہ بہت مشکل تھا۔ امی کو بس کے اڈے پر چل کر پہنچنا مشکل تھا۔ ہاں قادر وقدیر خدا پر یقین ضرور تھا۔ امی نے نہایت زاری سے رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ پڑھنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ کہتی جاتیں مجھے میرے اللہ نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اچانک گلی میں گھوڑے کے ٹاپوں کی صدا سنائی دی۔ پھر یہ آواز نزدیک ہوتی گئی۔ صبح سویرے یہ کون ہو سکتا ہے؟ جلدی سے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اجنبی یکے والا ہے جو کبھی پہلے اس طرف نہیں آیا تھا۔ یکہ بھی خالی تھا۔ اس سے پوچھا۔ وہ سواری چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔ امی نے اپنے رحیم و کریم خدا کا شکر ادا کیا اور فوراً یکے پر بیٹھ گئیں۔ گھوڑا سرپٹ دوڑا اور بس کو جا لیا۔ الحمد للہ۔ آپ بہت مان سے کہا کرتی تھیں میرے پیارے اللہ نے مجھے کبھی نہیں ٹھکرایا۔

☆ 1987 میں امی اور ابا جی نے اکٹھے یورپ کے سفر کا ارادہ کیا۔ جب آپ لندن سے سویڈن کے لئے جہاز پر سوار ہوئے تو چھوٹا سا بیگ جس میں پاکستان واپسی کی ٹکٹیں اور خرچ کے لئے ایک کثیر رقم موجود تھی چیک ان کرنے والے کمرے میں بھول گئے۔ جب رقم والے چھوٹے پرس کی عدم موجودگی کا احساس ہوا اور یاد آیا کہ کہاں رہ گیا ہے تو اس وقت تک جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور طیارہ پرواز کرنے والا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی سیڑھی بھی ہٹا دی گئی تھی۔

امی نے ابا جی کو بتایا تو ابا جی کہنے لگے اب جانے دو اور اناللہ پڑھ ڈالو۔ امی کہاں چپکی بیٹھ رہنے والی تھیں۔ یوں گویا ہوئیں یہ میرا حلال کا پیسہ ہے اور حلال مال کبھی ضائع نہیں ہوتا اور مجھے اپنے قادر خدا پر یقین ہے۔ چنانچہ وہ کھڑی ہو گئیں اور جہاز کے انگلش عملے کو اپنا مسئلہ بتایا۔ ایسے موقعہ پر انسان گھبرا جاتا ہے جہاز کے دوسرے مسافروں نے بھی شور مچایا۔ عملے نے سیڑھی

واپس لگائی۔ امی دُعا کرتے ہوئے نیچے اُتریں اور سیدھی اسی کمرے میں واپس پہنچیں جہاں ان کی چیکنگ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل دیکھئے۔ پرس جُوں کا تُوں پڑا تھا اور سب کرنسی محفوظ تھی۔ اس کو لے کر واپس آئیں۔ کچھ مسافر حیران ہو کر کہہ رہے تھے اس خاتون کا اللہ پر کیسا یقین تھا کہ خدا تعالیٰ ان کو مایوس نہیں کرے گا۔

☆ 1991ء میں آپ چھوٹی بیٹی کے ساتھ لندن تشریف لائیں۔ ایک موقعہ پر آپ کو کچھ رقم کی ضرورت پیش آئی۔ اپنی اولاد سے مانگنا پسند نہ کیا محض اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے دُعا شروع کر دی۔ ابھی دُعا کرتے ہوئے ایک رات ہی گذری تھی کہ ایک پُرانے جاننے والے اپنے ہی گاؤں کے بزرگ ہمسایہ نے تحفتاً ان کو 200 پاؤنڈ بھجوا دیئے۔ امی بہت محبت سے اور تشکّر بھرے لہجے میں کہا کرتی تھیں کہ میرے خدا نے مجھے کبھی نہیں بُھلایا اور کبھی اپنے در سے خالی نہیں لوٹایا۔ بلند آواز سے اور نہایت رقت بھرے لہجے میں اللہ تعالیٰ کی حمد کیا کرتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے بلند آواز سے دعائیں کرتی رہتیں۔

☆ ہماری بہن محترمہ فاخرہ اہلیہ محترم مرزا سعید صاحب کے بچے اکثر ہمارے ہاں چُھٹیوں میں آتے۔ چاٹی کا بلویا ہوا مکھن اور دودھ ان کا مَن بھاتا کھاجا ہوا کرتا۔ ایک مرتبہ عزیزم نوید احمد اور عزیزہ منزہ کرن ہمارے گھر آئے۔ اتفاق سے بھینس سُوکھ چُکی تھی۔ نوید میاں نہایت ضدّی اور تیز مزاج رکھتا تھا۔ ایک دم سے دھمکی آمیز لہجے میں بولا ''نانی جان چاہے کچھ ہو جائے مَیں تو ہر روز تازہ مکھن کھاؤں گا۔''

امی بے چاری بہت گھبرائیں اور آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری شروع کر دی۔ اللہ جو ہر بات پہ قادر ہے اور ہم گناہ گاروں کو بار بار اپنی قدرت نُمائی کا جلوہ دکھاتا ہے اب بھی امی کو نہ ٹھکرایا۔ اگلے دن کیا دیکھتی ہیں کہ بھینس کا دودھ اُترا ہوا ہے۔ امی نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے دودھ دوہنا شروع کیا اور دعاؤں کے ورد پر ہی یہ کام ختم کیا۔ خدا تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ جتنے دن یہ دونوں بچے ہمارے ہاں رہے بھینس دودھ دیتی رہی بچوں نے جی بھر کر مکھن کھایا اور

دودھ پیا اور جس دن وہ گھر سے رخصت ہو گئے، دوبارہ بھینس سوکھ گئی۔

بچوں کی تربیت آپ نے بہت عمدہ اور اچھے انداز میں کی

امی نے چونکہ قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا ہوا تھا اور عربی کی اچھی سمجھ رکھتی تھیں، ہمیں بھی قرآن پاک کا لفظی ترجمہ سکھایا۔ آپ جہاں بھی رہیں اردگرد کے بچوں اور بچیوں کو قرآن پاک پڑھایا۔ آپ کو سکھانے اور پڑھانے کا خوب فن تھا۔ آپ کو انگریزی زبان کی بہت سمجھ تھی۔ اردو اور فارسی زبان اچھی طرح جانتی تھیں۔ آپ کی گفتگو میں محاورہ بندی شامل تھی۔ غرباء کے بچوں کو تعلیم دلوانے میں ان کی مالی مدد کرتیں۔ ان کو کتابیں خرید کر دیا کرتیں اور دوسرے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار رہتیں۔

ان کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو قناعت تھا۔ ہم نے کبھی ان کو حرص و ہوس کی رو میں بہتے نہیں دیکھا تھا۔ طبیعت میں نہایت درجہ سادگی تھی۔ خوراک بھی سادہ، لباس بھی سادہ اور طور طریقے بھی سادہ۔ ان کو یہ قطعاً پسند نہ تھا کہ ہم پُرتکلف کھانے پکانے پر وقت ضائع کریں۔ ہمیں ہمیشہ نصیحت کی کہ اپنی صلاحیتوں کو ضائع نہ کرو، یوں خدا تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

مستحق اقرباء اور ہمسایوں کی ضروریات و حالات دریافت کرتی رہتیں اور پھر حسبِ توفیق ان کی مدد کرتیں۔ اقرباء پروری اور غرباء پروری ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ گھر کے خدمت گاروں کے ساتھ ان کا بہت عمدہ سلوک ہوتا تھا۔ ان کی یہ صفت بہت مشہور تھی۔ ہمارے خدمت گار بھی ہمارے گھر چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے تھے اور امی کے محبت بھرے سلوک کی وجہ سے بہت وفا کا تعلق رکھتے تھے۔

آپ کی طبیعت غریب پرور تھی۔ خاص طور پر جب کوئی غریب ضرورت مند قرض لینے کو آتا تو انکار نہ کیا کرتیں۔ قرض لینے والی چاہے کوئی غریب بھٹیارن ہو یا جمعدارنی ہو، دودھ فروخت کرنے والی ہو یا گھر میں کام کرنے والی ہو، سوالی کو نہ ٹھکراتی تھیں۔ ہمیشہ ہمیں نصیحت کیا کرتی

تھیں کہ غریب کے لئے دل وسیع کرو، غریب کو قرض کوئی نہیں دیتا۔ مسکینوں کے لئے دل میں تکبر نہ رکھو۔ اور پھر یہ صفت بھی بہت نمایاں تھی کہ قرض دے کر بھول جاتی تھیں۔ ہم نے کبھی ان کو قرض لینے والے سے پلٹ کر مطالبہ کرتے نہ دیکھا۔ ایک مرتبہ عجب واقعہ ہوا۔ 40 سال قبل کا دیا ہوا قرض واپس آ گیا۔ مَیں نے خاص طور پر اس بات کا مشاہدہ کیا کہ مسکین لوگ امی کو آ کر ان کا قرض واپس کر جاتے تھے۔

ہماری بہن محترمہ نادرہ یاسمین اہلیہ عبدالحمید رامہ بیان کرتی ہیں:

''میرے نانا اور نانی صحابی تھے اور دینی مسائل کا دونوں بہت علم رکھتے تھے۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ میرے والدین میں اکثر بحث مباحثہ دینی مسائل پر ہوا کرتا تھا۔ بلکہ نانا جان کو غصّہ آیا کرتا تھا کہ یہ زیادہ فقہ کے نکتے نکال لیتی ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے والے بچے بھی ظاہر ہے ایسے رنگ میں رنگے جائیں گے۔ میری والدہ کو بھی دین کے ساتھ بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپ میڈیکل کالج میں داخلہ ملنے کے باوجود مخلوط تعلیم کے باعث ڈاکٹر نہ بن سکیں لیکن دل میں اس پیشے سے محبت تھی اس لئے اللہ سے دعائیں مانگنی شروع کر دیں کہ خدایا میں خود تو ڈاکٹر نہیں بن سکی۔ اب مجھے ساتھی ڈاکٹر عطا فرما دینا۔ کئی دفعہ ہنس کر کہا کرتی تھیں کہ جو خوبیاں میں اپنے ساتھی میں چاہتی تھی خدا سے دعا میں مانگا کرتی تھی لیکن کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ خدایا کنوارہ ساتھی عطا فرمانا۔ ہم سے بھی کہا کرتی تھیں کہ خدا سے مانگنے میں کیا شرم ہے اپنے لئے جیسا ساتھی چاہتی ہو خدا سے دعا میں مانگا کرو، انشاءاللہ وہ عطا فرمائے گا۔

میں سمجھتی ہوں کہ اگر ایک جوڑا مثبت سوچ والا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کا اثر اگلی نسلوں میں بھی لمبا عرصہ قائم رہتا ہے۔ اپنے والدین کو ہم نے نہیں دیکھا کہ کبھی انہوں نے رشتوں کا احترام نہ کیا ہو۔ دراصل خاندانوں میں نفرتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب والدین احتیاط کرنے والے نہ ہوں اور زیادہ فرض ماں کا ہوتا ہے۔ بہن بھائیوں، رشتہ داروں میں اختلافات ہو جاتے ہیں۔ ان کا ذکر اولاد کے سامنے منفی رنگ میں نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح

اگلی نسل کے دل سے بزرگوں کا احترام اٹھ جاتا ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ اپنے بزرگوں کا احترام نہ کرنے والی اولادیں آپس میں بھی پھٹ جایا کرتی ہیں۔ امی نے خود سب کی عزت کی اور ہمیں بھی اس حکم خدا کو ماننے کی تلقین کی۔

عورتوں میں یہ عام عادت پائی جاتی ہے کہ کسی منفی رنگ میں سنی سنائی بات کو فوراً آگے پھیلانا شروع کر دیتی ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے کہ جس کے متعلق بات کر رہی ہیں اس کو اس کا کتنا نقصان پہنچے گا۔ کیونکہ سننے والی نے بھی چسکے لے لے کر آگے بیان کرنی ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بات کی گواہ ہوں کہ اگر امی کے سامنے یہ بات کی جاتی تو وہ ناراض ہو جاتی تھیں کہ توبہ کرو توبہ کرو کسی پر الزام لگاتے ہوئے ڈرو۔ ہمیشہ حسن ظنی سے کام لیتی تھیں۔ بلکہ ہمارے کئی عزیز اس بات پر ناراض بھی ہوتے تھے۔ ہمیشہ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا۔ میں نے انہیں کسی سے حسد کرتے نہیں دیکھا۔ دل بہت نرم اور دوسروں کا درد رکھنے والا تھا۔ اپنی رائے کا اظہار کرنے میں بہت دلیر تھیں۔ بہت ہی کم لوگوں میں یہ دلیری پائی جاتی ہے۔ ہر کوئی اچھا بننے کی فکر میں رہتا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ میری والدہ کے اندر جرأت بھی تھی اور انصاف بھی تھا۔ اگر ان کے سامنے کسی کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہوتی فوراً بول پڑتی تھیں۔ بلکہ ہم امی سے اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ کیا ضرورت ہے آپ کو بُرا بننے کی۔ جس کا معاملہ ہے وہ خود نمٹے۔ لیکن دلچسپ بات ہے کہ امی کے سب تجربے دیکھنے کے باوجود آہستہ آہستہ ہم سب بہن بھائیوں کے اندر بھی امی کی جین (gene) کی یہی چیز آ گئی ہے، جو نکالے نہیں نکلتی۔"

ذیل میں چند محبت کرنے والی خواتین کے بیانات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ محترمہ بیگم منصورہ سمیع صاحبہ بنت حضرت مرزا عبدالحق صاحب سرگودھا بیان کرتی ہیں:

"محترمہ مبارکہ اہلیہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحبہ اپنے وقت کی مشہور مبلغہ اور سپیکر تھیں۔ جلسہ سالانہ پر ان کی تقاریر بھی ہوتی تھیں۔ پاکستان میں مختلف تربیتی کلاسز میں ان کو مدعو کیا جاتا۔ آپ اپنی ساری گھریلو مصروفیات چھوڑ کر ہفتہ دو ہفتہ کے لئے وقت پر تشریف لے جاتیں۔ ایسی ہی ایک

کلاس ہمارے یہاں سرگودھا میں محترم بشیر احمد پراچہ صاحب مرحوم کے ہاں سیٹلائٹ ٹاؤن میں لگی۔ جس میں مجھے ان کی شخصیت کو قریب سے جاننے کا موقعہ ملا۔ ان کے پاس علم و فضل کے خزانے تھے جن سے ہم لوگ مستفید ہوئے۔

دوسری مرتبہ ہماری پوسٹنگ گوجرانوالہ میں ہوئی۔ ان دنوں وہاں بھی تربیتی کلاس لگی تو آپ وہاں بھی تشریف لائیں۔ کافی دنوں کی کلاس تھی اور آپ اس کلاس کی روحِ رواں تھیں۔ ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا۔ بعد ازاں آپ کی ایک بیٹی فاخرہ ہماری بھابھی بنیں۔ اپنی والدہ کی تربیت کے نقوش ان میں بھی نمایاں تھے۔ محترمہ مبارکہ بیگم صاحبہ اپنے آخری ایّام میں کچھ عرصہ صاحبِ فراش رہیں۔ ان کی بیٹی فاخرہ بھابی اور ان کے بچوں نے ان کی خدمت کا حق ادا کیا۔ ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کی ساری اولاد کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے، آمین۔ ان کی اولاد مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی ہے اور خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے سب مخلص احمدی ہیں۔"

محترمہ رضیہ عاطف درد صاحبہ جامعہ نصرت کا بیان کرتی ہیں:

"ہماری بہن مبارکہ بہت لائق، دیندار اور پُر اعتماد خاتون تھیں۔ مَیں نے بھی کبھی انہیں لکھی ہوئی تقریر کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بعض لوگ جب زبانی تقریر کرتے ہیں تو کچھ اشارے سامنے تحریر کئے ہوئے رکھ لیتے ہیں لیکن وہ تو خالی ہاتھ سٹیج پر تشریف لاتیں اور محفل پر چھا جاتیں۔ عالم و جاہل دونوں کی دلچسپی کو ملحوظِ خاطر رکھنے کا کمال ملکہ حاصل تھا۔ تسلسل، روانگی، دلچسپ واقعات اس پر طرزِ بیان ایسا کہ دل چاہتا سُنتے چلے جائیں۔ کئی واقعات بار بار سُنے، ہر دفعہ ایک نیا مزہ آتا۔ آپ کا نام تقریر کے لئے آتا تو حضرت سیدہ اُمِّ متین صاحبہ کئی بار مُسکراتے ہوئے فرماتیں! اب ذرا دل تھام لو میری باری آئی، اور آہستہ سے آپ کو بڑی شفقت و محبت سے تقریر کے لئے سٹیج پر آنے کی دعوت دیتیں تو بہت لُطف آتا۔

وقفِ عارضی اور تربیتی کلاسوں کے لئے اکثر مختلف لجنات آپ کو اپنے ہاں مدعو کرتیں۔ مجھے

بھی کئی مرتبہ آپ کے ہمراہ جانے کی سعادت ملی۔ مستقل مزاجی سے قیام فرماتیں۔ ہر قسم کے علم سے آراستہ، ذہین، باذوق طبیعت کی مالک، گُل وگلزار شخصیت تھیں۔ آپ کو علمی گفتگو کرتے ہی دیکھا۔ اللہ تعالیٰ پر توکل، خلافت سے عشق اور علم سے محبت کی مالک تھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔''

محترمہ استانی رضیہ بیگم دارالرحمت شرقی ب ربوہ بیان کرتی ہیں:

''محترمہ مبارکہ قمر صاحبہ ہماری بہت اچھی ہمسائی تھیں۔ 1956ء کے جلسہ سالانہ کے بعد آپ نے یہ گھر بنایا۔ ان کا اور میرا گھر اکٹھا ہی بنا تھا۔ درمیان کی دیوار مشترکہ تھی جو اکٹھی بنائی گئی۔ اس دیوار کی وجہ سے کبھی ہمارا جھگڑا نہ ہوا۔ ہمسایہ ہونے کے ناطے وہ میرا بہت خیال رکھتیں۔ مَیں اکیلی خاتون تھی۔ دو چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میری بڑی مشکل یہ تھی کہ مَیں سکول میں پڑھاتی تھی۔ پاکستان میں رہتے ہوئے ایک تنہا عورت کے لئے بہت مسائل ہوتے ہیں۔ دفاتر کے کاموں میں آپ کا گھرانہ میرا مددگار تھا۔

مَیں چونکہ ہیڈ مسٹرس تھی میری ڈیوٹی کبھی جھنگ یا چنیوٹ میں لگا دی جاتی اور لمبا سفر ہونے کی وجہ سے مَیں گھر وقت پر نہ پہنچ پاتی تو میری بیٹی بشریٰ سکول سے واپس آتی اور گھر کا دروازہ مقفّل پا کر آپا مبارکہ کے گھر چلی جاتی تو آپ فوراً اس کو کھانا پیش کرتیں اور اصرار سے کھلاتیں نیز بہت پیار کی باتیں کرتیں۔ آپ نے اپنی بیٹیوں کی بھی بہت اچھی تربیت کی۔ وہ ضلع جھنگ کی سالانہ کھیلوں میں ہمیشہ اوّل انعام لے کر آتیں۔ ایک دفعہ مجھے جھنگ کی سالانہ کھیلوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ وہاں مجھے ڈسٹرکٹ انسپکٹر ضلع محترمہ مسز گیلانی صاحبہ سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے بہت حیرت سے بتایا کہ ربوہ ہر کھیل میں اوّل رہا ہے۔ وہ آپا مبارکہ کی ہم جماعت تھیں اور دونوں نے اکٹھے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ان کی امی کی تربیت کا نتیجہ ہے اور یہ ان کی بچیاں ہیں جو ہر میدان میں آگے رہتی ہیں۔ ہماری لڑکیوں کی کارکردگی پر وہ بہت خوش تھیں۔

وہ میری ایک ناصح بہن بھی تھیں۔ ایک مرتبہ میری ایک بیٹی کا رشتہ آیا۔ بظاہر دینی و دنیاوی

لحاظ سے بہت مناسب جوڑ تھا۔ تعلیم بھی بہت اچھی تھی۔ مجھے بار بار منذر خوابیں آرہی تھیں لیکن مجھ ناسمجھ کا دھیان اس طرف سے نہ ہٹتا تھا۔ آخر مَیں نے آپا مبارکہ سے مشورہ لیا تو انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس رشتہ کو جو بظاہر بہت اچھا ہے چھوڑ دو، خدا تعالیٰ سے ٹکّر نہ لینا۔ ان کی بات سُن کر مجھے درست فیصلہ کرنے کی توفیق ملی کیونکہ بعد میں مجھ پر ان لوگوں کی حقیقت کھلی۔ اللہ تعالیٰ آپا مبارکہ کو جزائے خیر دے۔''

2007ء میں مَیں نے اور میرے بچوں نے قادیان کا سفر اختیار کیا۔ وہاں مختلف درویشوں کی بیویوں سے مل کر امی کی یادوں کو دہرایا۔ ذیل میں چند لوگوں سے ملاقات کا حال بیان کرتی ہوں:

حضرت صاحبزادی امتہ القدوس صاحبہ اہلیہ حضرت مرزا وسیم احمد صاحب نے بیان کیا:

''مارچ 1953 میں مجھے قادیان کا ویزا ملا اور مستقل طور پر قادیان میں رہائش پذیر ہوگئی۔ میری آمد کے بارے میں قادیان کے لوگوں کو معلوم تھا۔ لجنہ اماء اللہ نے اپنے طور پر تیاری کی ہوئی تھی۔ محترمہ مبارکہ اہلیہ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب درویش (جو اس وقت بطور صدر لجنہ اماء اللہ ہندوستان کا کام سنبھالے ہوئے تھیں) نے میرے استقبال کے لئے لجنہ اماء اللہ کا ایک وفد بہشتی مقبرہ بھیجا۔ اس کے بعد ہماری گاڑی دارالمسیح کے سامنے چوک میں ٹھہری تو لجنہ نے میرا پُر تپاک استقبال کیا۔ اندر آکر مبارکہ صاحبہ نے دالان حضرت اماں جان میں مجھے محبت سے ریسیو کیا۔ قادیان کی بہت سے بہنیں مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ پھر مبارکہ صاحبہ نے میرے لئے سپاسنامہ پڑھا۔ یہیں ہم سب نے مل کر دعا کی اور یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔

میرے آنے کے کچھ عرصہ بعد چند اور خواتین آگئیں۔ پاسپورٹ سسٹم کھل گیا کچھ عرصہ بعد 10 یا 12 افراد کو آنے کی اجازت ملتی تھی۔ اور احباب وخواتین کے قافلے قادیان میں آتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے 20 - 25 خواتین کی تعداد مرکزِ احمدیہ میں پہنچ گئی۔

محترمہ مبارکہ قمر صاحبہ نے مجھے آتے ہی جنرل سیکرٹری کا عہدہ دیا۔ چونکہ تعداد زیادہ ہوگئی تھی اس لئے کام کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ ہفتہ یا دو ہفتے کے بعد لجنہ کا اجلاس ہوا کرتا تھا جو ان کے اپنے

گھر میں ہوتا تھا۔ پھر انہوں نے جماعتوں سے تعلق قائم کرنے اور مختلف لجنات کو خطوط لکھنے کی ہدایت کی۔ ان کے وقت میں کئی نئی جگہوں پر لجنہ کا اجراء ہوا۔ چنانچہ ان کی کوشش کے نتیجہ میں 1953ء تک چند مقامات پر مثلاً حیدرآباد، سکندرآباد (دکن) بنگلور، مدراس، بھاگلپور، بھرت پور، اور چنتہ کنٹہ میں لجنات کا کام شروع ہو گیا اور ان کی طرف سے مرکز میں چند سال کے تعطل کے بعد رپورٹ آنی شروع ہوگئی۔'' (رپورٹ کارگذاری لجنہ اماء اللہ بھارت کا ذکر اوپر آچکا ہے۔)

محترمہ بشیر بیگم زوجہ محترم منظور احمد چیمہ صاحب درویش قادیان نے بیان کیا:

'' آپا مبارکہ نہایت قابل خاتون تھیں۔ علم بھی بہت تھا۔ ہم لوگ گاؤں سے آئے تھے۔ میرا عربی کا تلفظ درست نہیں تھا۔ آپا مبارکہ نے اس طرف خاص توجہ دی اور ہمیں قرآنِ پاک کو صحت کے ساتھ پڑھانے کا انتظام کیا۔ آپ کی اس تحریک اور انتظام نے بہت لوگوں کو فائدہ دیا۔ ان کا طرزِ بیان بھی بہت اچھا تھا۔ ان کے وقت میں اجلاس علمی اور دینی علوم سے بھرپور ہوتا تھا جس سے ہم لجنات کو بہت فائدہ پہنچتا تھا۔ اُنہوں نے مختلف وقتوں میں تربیتی کلاسیں لگائیں، قرآن پاک کا ترجمہ پڑھایا۔ ہمیں ان سے بہت مانوسیت تھی۔ ہماری دینی اور علمی ترقی کے لئے وہ مختلف اقدام کیا کرتیں۔''

محترمہ رشیدہ بیگم صاحبہ زوجہ مکرم مستری محمد دین صاحب درویش نے بیان کیا کہ:

'' آپ نے بہت اچھا کام چلایا۔ میرے ساتھ بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ آپ مجھے ہر اجلاس میں نظم پڑھنے کے لئے کہتی تھیں۔ ان کا بیان بہت عمدہ ہوتا تھا۔ ایسی تقریر کیا کرتی تھیں کہ سوئے ہوئے بیدار ہو جائیں۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ فی البدیہہ تقریر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ وہ ہمیں بھی تقریر کرنے اور آگے بڑھنے کی تحریک کرتی تھیں ایک دفعہ مجھے بتایا کہ 'میَں نے جب تقریر سیکھی تو چھت پر چڑھ جاتی تھی۔ دیواروں کو پبلک تصور کرتی اور بے جھجک بولتی چلی جاتی'۔

وہ کیا زمانہ تھا۔ آپس میں کیسا پیار تھا۔ آپ کی زیرنگرانی لجنہ کا ہفتہ وار اجلاس ہوا کرتا تھا جو

ہماری تربیت گاہ تھا۔خواتین کا سالانہ جلسہ بھی ہوا کرتا تھا۔ مجھے آپ نے خدمتِ خلق کی سیکرٹری کا عہدہ دیا۔ باہر سے آنے والے عطیات وتحائف کو دوسرے مستحقین میں بانٹنا بہت ذمہ داری کا کام تھا جس کو انہوں نے بہت احسن طریق سے نبھایا۔ آپا مبارکہ کی سیرت کا ایک بڑا پہلو یہ تھا کہ وہ دوسروں کو سکھانا اور اُٹھانا جانتی تھیں۔انہوں نے اپنی قابلیت نہ صرف ہمارے سامنے ظاہر کی بلکہ ہمیں بھی قابل بنایا۔''

محترمہ رشیدہ بیگم اہلیہ محترم غلام قادر صاحب نے آپ کا یوں ذکر کیا کہ:

''محترمہ مبارکہ قمر صاحبہ دین کا خوب کام کرتی تھیں۔ بہت اچھی ملنسار تھیں اور سب کی خبر رکھتی تھیں۔انہوں نے ہندوستان کی لجنہ کو بیدار کرنے میں بہت کردار ادا کیا۔جب بھی ان کو ضرورت ہوتی مجھے بُلا بھیجتیں۔ مجھے بھی ان سے عقیدت تھی، میری بھی کوشش ہوتی تھی کہ ان کی اطاعت کرسکوں اوران کی قیادت میں خدمت دین کرسکوں۔''

سیدہ نصرت جہاں اہلیہ عبدالعظیم صاحب درویش صوبہ اڑیسہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کی شادی نوجوانی اور کم عمری میں ہوئی۔ پردیس میں دل لگنا مشکل ہوتا ہے۔آپ بیان کرتی ہیں:

''آپا مبارکہ سے مجھے بہت پیار تھا۔وہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔اکثر مَیں ان کے ہاں آجاتی تھی کیونکہ ان کا مجھ سے نہایت محبت کا سلوک تھا۔میں بھی چھوٹی عمر کی تھی۔نیک خاتون تھیں ،طبیعت میں ملنساری تھی۔ ہر عمر اور طبقے کے ساتھ گھل مِل جایا کرتی تھیں۔لجنہ کا کام نہایت ذمہ داری اور ایمانداری سے سرانجام دیا۔ان کی مساعی کے باعث لجنہ نے خُوب ترقی کی ،انہوں نے مجھے بتایا کہ سلیمہ میری بیٹی ہے۔کبھی اس کے بارے میں سوتیلی کا لفظ استعمال نہ کیا اور نہ کبھی ہم نے ان کا کوئی اختلاف دیکھا۔''

نوٹ: ۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی جب خلافت جوبلی منائی گئی تو امی نے حضورؓ کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو مصباح میں چھپ چُکا ہے۔اس کے علاوہ چند بزرگوں کی وفات کے بعد انہوں نے بعض کے بارے میں مضامین لکھے، جو یہاں درج کئے جاتے ہیں:

سیرت طیبہ کے چند دلنواز پہلو

(مبارکہ اہلیہ محترم ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ربوہ۔ بحوالہ مصباح، خلافت نمبر۔ دسمبر۔ جنوری 1964ء)

حضور اقدس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی پہلی زیارت کا حال مختصراً یہ یاد ہے کہ مَیں 1929ء میں سات آٹھ سال کی تھی۔ ایک شام گھر کے سب لوگ مکان کو تالا لگا کر ریلوے سٹیشن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر میری والدہ مرحومہ نے بتایا کہ آج کشمیر سے واپسی پر حضور اقدس سیالکوٹ کے راستہ سے گذر رہے ہیں اور دو تین گھنٹہ سیالکوٹ میں قیام بھی ہوگا۔ مَیں بڑی خوش ہوئی کہ حضور پُرنور کی زیارت ہوگی۔ ریلوے سٹیشن پر بے شمار مرد اور عورتیں جمع ہو گئے۔ عورتوں کے لئے علیحدہ جگہ مخصوص کر دی گئی۔ گاڑی آئی جو کافی لمبی تھی۔ اسی گاڑی کے آخری ڈبے عین اس جگہ کھڑے ہوئے جہاں عورتیں جمع تھیں۔

حضور اقدس حُسنِ اتفاق سے ان آخری ڈبوں میں سوار تھے۔ گاڑی رکنے پر حضور ڈبے سے اترے اور اکیلے ہی سیدھے عورتوں کی طرف تشریف لائے۔ مَیں نے حضور کی فوٹو دیکھی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی حضور کو پہچان لیا اور بھاگ کر حضور سے چمٹ گئی اور حضور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اخاہ جی حضرت صاحب آ گئے، وہ نظارہ ہمیشہ میرے دل کو گرماتا ہے۔ حضور میرا ہاتھ پکڑے پلیٹ فارم پر چلتے چلے جا رہے ہیں اور نہایت پیارے لہجہ میں میرا اور میرے والد صاحب کا نام پوچھ رہے ہیں تو مَیں نے عرض کیا! مہر غلام حسن صاحب محلہّ اراضی یعقوب شہر سیالکوٹ۔ حضور ہنس کر فرمانے لگے۔ ’’اتنا لمبا نام ہے تمہارے ابا کا‘‘۔ مسماۃ اللہ رکھی صاحبہ مرحومہ ایک صحابیہ عورت بھی عورتوں کے ہمراہ تھیں۔ انہوں نے بھی حضور اقدس کو دیکھ لیا اور حضور کی طرف لپکی اور مصافحہ کرنے کے لئے حضور کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ حضور نے منع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ’’مردوں کا عورتوں کے ساتھ مصافحہ کرنا اسلام میں جائز نہیں۔‘‘ وہ سادہ لوح خاتون تھیں بولیں ’’تو پھر اس کڑی نے کیوں ہتھ پھڑیا ہویا اے۔‘‘ حضور نے دوبارہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ یہ تو بچی ہے، اس

کا کوئی حرج نہیں۔ اتنے میں سب عورتیں حضور کے گرد جمع ہو گئیں اور بعض عورتوں کی درخواست پر وہیں کھڑے کھڑے حضور نے عورتوں کی بیعت قبول فرمائی۔

مرد، جو ابھی تک اِدھر اُدھر بھاگم بھاگ حضور کو ڈھونڈ رہے تھے، ان میں سے کسی نے حضور کو عورتوں میں گھرے ہوئے دیکھ لیا اور پکارا کہ حضور تو اِدھر ہیں۔ اتنے میں مکرم میر عبدالسلام مرحوم بھی تشریف لے آئے، جو اس وقت امیر جماعت تھے۔ پھر حضور ان کے ہمراہ مردوں کی طرف تشریف لے گئے۔

سن 1931ء میں ایک مرتبہ سیالکوٹ شہر سے قریباً 8 میل دور اپنی تایا زاد بہن کے پاس گئی ہوئی تھی۔ میری اس آپا کے خُسر سیالکوٹ سے آئے اور کہنے لگے کہ آج شہر میں بڑا شور ہے کہ مرزا محمود احمد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں۔ میرے کان میں یہ آواز پڑنی تھی کہ مَیں بے قرار ہو گئی۔ ہائے میرے حضور میرے شہر میں تشریف فرما ہوں اور مَیں شہر سے دور پڑی ہوں۔ ساری رات بے قراری میں دعائیں کرتے گذری۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو علی الصبح ہی سیالکوٹ جا پہنچی۔ لجنہ اماء اللہ کی دعوت قبول فرماتے ہوئے حضور احمدیہ گرلز سکول میں سہ پہر کو تشریف فرما ہوئے۔ عجب نورانی چہرہ۔ آنکھیں تاب نہ لاسکتی تھیں۔ سیاہ گھنی ڈارھی جس میں صرف تین سفید بال جو ڈارھی کی لمبائی تک پہنچے ہوئے تھے بڑے پیارے معلوم ہوتے تھے۔ حضور نے لجنہ کو چند نصائح فرمائیں اور محترمہ آپا فضیلت صاحبہ کی مساعی جمیلہ کو خوب سراہا۔

عاجزہ میٹرک پاس کرنے کے بعد قادیان دینیات کلاس میں داخلہ کے لئے گئی۔ حضور انور کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ فرمایا: ''کہاں رہائش رکھو گی'' عرض کیا کہ مَیں نے نیاز منزل محلہ دارالرحمت میں رہائش کا انتظام کر لیا ہے۔ حضور نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے، اجازت ہے۔ بے شک اب خوشی سے تعلیم حاصل کرو۔

1938ء کا ذکر ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ حضور اقدس نے اندرونِ خانہ اپنی گھر کی مستورات میں درس دینے کا انتظام فرمایا اور مسجد مبارک کے بالائی صحن میں جو کھڑکی کھلتی ہے اس

کے پاس بیٹھ کر حضور درس فرماتے۔ اندرونِ خانہ مستورات ہوتیں۔ باہر مسجد میں مرد حضور کا درس سنتے۔ عاجزہ بھی اس درس میں روزانہ شریک ہوتی۔ کسی کو کاپی پنسل کے بغیر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ مردوں میں حضرت میر محمد اسحاق صاحبؓ اور مکرم مولوی ابوالعطاء صاحب جیسے عالم فاضل بھی قلم دوات کاغذ لئے حاضر ہوتے۔ مسئلہ شفاعت بیان ہو چکا تو حضور نے فرمایا: ''اب امتحان ہوگا۔ کہ ہر ایک اپنی اپنی یادداشت کے مطابق جو کچھ درس سے سمجھ آئی ہے۔ سوالات کے جوابات لکھ کر لائے۔'' قریباً سب سامعین اس امتحان میں شامل ہوئے۔ حضور نے سب پرچے خود ہی ملاحظہ فرمائے اور پھر نتیجہ بھی خود ہی سنایا۔ حضور نے تین درجے مقرر فرمائے تھے۔ بہت اچھا، اچھا اور قف۔ حضور ہر ایک کا نتیجہ سناتے جاتے اور ریمارکس بھی دیتے جاتے۔ نتیجہ سنانے کی گھڑی بھی اچھی خاصی تفریح بن گئی۔

صرف ایک بزرگ مکرم سیف الرحمان صاحب پاس ہوئے۔ جنہیں 'بہت اچھا' کی سند ملی۔ مکرم چوہدری خلیل احمد صاحب ناصر کا نتیجہ سناتے وقت فرمایا'' کہ یہ نوجوان پوری قوت سے اُڑ کر میرے دماغ پر حاوی ہو چلا تھا۔ مگر لبِ بام پہنچتے پہنچتے زمین پر آ رہا اور اپنی تحریر کا رُخ الٹی طرف کر دیا۔''

میرا پرچہ مجھے ملا۔ اس پر پہلے ''پاس'' لکھا اور اس کے ساتھ ''اچھا'' کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ لیکن جب نتیجہ سنانے لگے۔ تو فرمایا ''اتنا اچھا نہیں'' جب مجلس برخاست ہوئی تو ہم چونکہ اُمِ طاہر کے مکان کے صحن میں سے گذر کر اپنے گھروں کو واپس جایا کرتی تھیں۔ حضور اقدس کا گذر بھی اسی راستہ سے ہوا۔ مَیں نے موقع پا کر عرض کر دیا کہ حضور ایک مرتبہ میرے پرچہ پر اچھا لکھ کر پاس فرمایا تھا۔ تو پھر پاس ہی رہنے دیتے۔ ہنس کر خاموش ہو گئے اور بات کا رُخ دوسری طرف موڑ کر فرمانے لگے کہ جیسے مرغ پہنچا مار کر ایک ہی جَست میں کوٹھے پر چڑھنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی خلیل ناصر نے کیا مگر

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

دوسرے روز شام کے وقت جب مَیں حاضر ہوئی تو باجی امۃ القیوم صاحبہ نے بتایا کہ تمہارے جانے کے بعد ابا جان دیر تک کچھ گنگناتے رہے اور پھر فرمایا کہ کل جب مبارکہ آئے تو اسے کہنا کہ اپنے پرچہ پر یہ شعر لکھ لے۔

اچھا نہیں ہوا اگر کاٹا ہوا تو ہے
ثابت نہیں ڈپلومہ تو پاٹا ہوا تو ہے

ادھر سے میاں طاہری (صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب) مجھے دیکھ کر شور مچانے لگے۔

اچھا نہیں ہوا اگر کاٹا ہوا تو ہے
ثابت نہیں ڈپلومہ تو پاٹا ہوا تو ہے

مَیں نے ہنستے ہوئے کہا۔ میاں ڈپلومہ تو مل گیا گو بعد میں پھٹ ہی گیا۔ اس شام درس ختم ہونے کے بعد سیڑھیاں اترتے وقت حضور سے ملاقات ہوئی۔ سلام عرض کیا۔ فرمایا۔ ''مبارکہ میرا شعر مل گیا'' مَیں نے کہا جی حضور! قربان جاؤں پیارے آقا پر۔ کتنی بے تکلفی سے دلجوئی فرمائی۔

چونکہ مَیں شام کے درس میں شریک ہوتی تھی واپسی دیر سے ہوتی۔ حضور کو اس قدر فکر ہوتی کہ ہر دوسرے تیسرے روز دریافت فرماتے کس کے ساتھ واپس جاؤ گی؟ ہم عرض کرتے ماسی چیمی کے ساتھ۔ (ماسی چیمی ایک دلیر عورت تھیں)

تو حضور فرماتے ''بہت اچھا ہے۔''

مجھے اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے سات بچیاں عنایت فرمائیں۔ ساتویں بچی کی پیدائش پر حضور کی خدمت میں دعا کے لئے عرض کیا۔ خط پڑھ کر فرمایا۔ لکھ دو بچی کا نام امۃ الآخر۔ اس بچی کی عمر چار ماہ کی تھی۔ ایک دن مَیں حضور اقدس کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئی۔ حضرت آپا جان ام متین صاحبہ نے حضرت اقدس سے عاجزہ کے لئے دعا کے لئے عرض کیا۔ کہ سات بچیاں ہو گئیں ہیں۔ اب نرینہ اولاد کے لئے حضور دعا فرمائیں۔ حضور نے فرمایا ''مَیں نے تو بچی کا نام امۃ الآخر رکھ دیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ آخر ہی فرمائے گا۔'' پھر میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا

''دیکھ لی تمہارے ڈاکٹر کی ڈاکٹری۔ سات بچیاں اکٹھی کر لیں۔ اب میری ڈاکٹری دیکھنا۔ یہ دوائی استعمال کرو۔ انشاء اللہ ضرور لڑکا ہی ہوگا اور خوبصورت بھی ہوگا'' اللہ تعالیٰ بھی اپنے پیارے بندوں کی لاج رکھتا ہے۔ اس واقعہ سے پورے ایک سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خوبصورت لڑکا عطا فرمایا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

حضور نے عاجزہ کو فرمایا تھا۔ کہ جب لڑکا پیدا ہو تو دوسری عورتوں کو بھی جو پوچھے یہ نسخہ بتانا۔ چنانچہ چھ بہنوں کے متعلق مجھے یاد ہے، جس جس کو مَیں نے یہ نسخہ بتایا۔ اللہ تعالی نے ان سب کو اولادِ نرینہ سے نوازا۔ ثم الحمد للہ۔

ایسی بہت سی دل کے لئے سرور بخش یادیں لکھتے ہوئے دل نہیں بھرتا۔ دل چاہتا ہے لکھتی چلی جاؤں لیکن بچوں کا شور اور دوسرے تقاضے مانع ہیں اور شاید مصباح میں اتنی گنجائش بھی نہ ہو۔ پیارے آقا کا وجود کتنا نادر المثال ہے۔ ہر بات میں قوم کی اصلاح کی فکر ہے۔ پچھلا زمانہ یاد آتا ہے تو دل اچھل اچھل کر سینہ سے باہر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو قادر و توانا ہے۔ ہمارے پیارے آقا اپنے پیارے محمود کو ایک بار پھر اٹھا کہ وہ مجلسوں کی رونق بنیں، مسجدوں کی رونق بنیں، سٹیج کی رونق بنیں۔ اے ہمارے شافی اور قادرِ مطلق خدا آ اور اسلام کے لئے اِک معجزہ دکھا کہ تیرا موعود خلیفہ اسلام کو دنیا پر غالب کرنے کے لئے پھر جماعت کی جاندار قیادت اپنے ہاتھوں میں لے۔ آمین اللہم آمین۔

حضرت مرزا بشیر احمد صاحب قمر الانبیاء کے ساتھ ہمارے والدین کا بہت محبت کا سلوک تھا۔ ان کی وفات کے بعد امی نے ان کی یاد میں مندرجہ ذیل تحریر لکھی جو لجنہ اماء اللہ کے رسالہ مصباح قمر الانبیاء نمبر میں چھپ چکا ہے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کی چند شفقت بھری یادیں

محترمہ مبارکہ قمر اہلیہ محترم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب گولبازار ربوہ ''بحوالہ مصباح قمر الانبیاء نمبر''

حضرت میاں صاحبؓ کی نظرِ کرم سے ہر ایک نے حصہ پایا اور یہ نظر جو مجھ پر تھی اسے یاد کر کے دِل فخر سے بھر جاتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا۔ حضرت امیر المومنین (خلیفۃ المسیح الثانیؓ) کے گھر میں آنا جانا تو عاجزہ کا بچپن سے ہی تھا لیکن پارٹیشن سے پہلے حضرت صاحبزادہ میاں بشیر احمد صاحب سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

1947ء کے فسادات کے دوران مَیں کشمیر سری نگر میں تھی۔ جب ذرا امن ہوا تو حضرت اقدس اَیَّدَہُ اللہ (حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ) نے میرے شوہر محترم ڈاکٹر بشیر احمد کو حکم دیا کہ بچوں کو پاکستان چھوڑ کر واپس سری نگر چلے جائیں۔ جس دن ڈاکٹر صاحب سری نگر واپس پہنچے اسی دن کشمیر میں جنگِ آزادی کا آغاز ہوا۔ دسمبر 1947ء میں حضرت اقدس کے حکم سے میرے شوہر سری نگر سے مظفر آباد کشمیر تک پیدل واپس آئے اور وہاں سے حضور اقدس کی خدمت میں لاہور پہنچے تو حضور نے ان کو قادیان جانے کا ارشاد فرمایا۔

1949ء میں قادیان کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لئے پاکستان سے احمدیوں کا پہلا قافلہ تیار ہوا۔ عاجزہ نے بھی اس میں شمولیت کی درخواست دے دی۔ لیکن مجھے اس کی نامنظوری کی اطلاع کے ملنے پر سخت تکلیف ہوئی کیونکہ میرا شوہر قادیان میں درویش تھا اور میں یقین رکھتی تھی کہ مجھے دیارِ حبیب کی زیارت کا موقع دے دیا جائے گا۔ چنانچہ میں نے حضرت صاحبزادہ صاحب کی خدمت میں بے وقوفی اور بے باکی سے لکھ مارا کہ حضرت عمر فاروق کے عہد میں تو سپاہیوں کو تین ماہ کے بعد گھر جانے کی اجازت ہوا کرتی تھی لیکن فضلِ عمر کے عہدِ مبارک میں بیوی کو درخواست کرنے پر بھی خاوند سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مَیں نے یہ لکھنے کو تو لکھ دیا۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ میرے انتہائی رنج کی حالت میں لکھے ہوئے الفاظ کیا اثر رکھتے ہیں۔

حضرت میاں صاحب نے میرا خط پڑھتے ہی میرے دیور مکرم محمد احمد صاحب کو لاہور سے میرے پاس لائل پور روانہ فرمایا تا کہ وہ میری دلجوئی کریں اور مزید دلجوئی کے لئے انہیں قادیان اسی قافلہ میں اپنے بڑے بھائی سے ملاقات کے لئے بھیج دیا۔ میرے دیور بیان کرتے تھے کہ قافلہ کی روانگی کے سلسلہ میں سارا دن کام کرتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ رکھا۔ آپ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد فرماتے کہ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے کہ مجبوراً مستورات کو نہیں بھجوا رہا۔ کیونکہ قادیان میں ابھی حالات مخدوش ہیں۔ صرف تین ضعیف العمر عورتیں تجربہ کے طور پر بھجوائی جا رہی ہیں۔ پھر میرے دیور کو فرمایا کہ قادیان جانے سے پہلے مبارکہ کے پاس دوبارہ جاؤ اور اسے تسلی دے کر آؤ کہ حضرت میاں صاحب صرف تمہاری خاطر محمد احمد کو قادیان بھجوا رہے ہیں۔ میرے دیور بیان کرتے تھے کہ جس طرح ایک دردمند باپ کو اپنی بیٹی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے ہی حضرت میاں صاحب کو تمہارا خیال تھا۔

یہ تھی میری پہلی اور غائبانہ ملاقات۔ چند روز بعد جلسہ سالانہ ربوہ میں شمولیت کے لئے مَیں گئی تو اپنی دونوں بچیوں کو ساتھ لے کر حضرت میاں صاحبؓ کی خدمت میں ملاقات کے لئے حاضر ہوئی۔ حضور کی خدمت میں السّلام علیکم عرض کیا۔ میری بچی نے بھی سلام عرض کیا حضور دروازہ سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟ تمہارے ابا کا نام کیا ہے۔'' بچی نے عرض کیا: ڈاکٹر بشیر احمد۔ فرمایا: ''لاہور والے ڈاکٹر بشیر احمد۔'' مَیں نے عرض کیا: نہیں حضور، قادیان والے ڈاکٹر بشیر احمد درویش۔ مسکراتے ہوئے بلند آواز میں فرمایا: ''اچھا، اچھا۔'' پھر خیریت پوچھی اور فرمایا: ''ہو تم عورت لیکن تحریر ماشاء اللہ مردوں کی سی ہے۔ مجھے تو تم عورت نہیں مرد معلوم ہوتی ہو۔ مَیں شرمندہ سی ہو گئی اور معذرت کی کہ مجھے حقیقتِ حال سے خبر نہ تھی مَیں نے سمجھا تھا کہ شاید درخواستیں زیادہ تھیں۔ اس لئے میری درخواست منظور نہ ہو سکی۔ فرمانے لگے'' مجھے تو تمہارا خط پڑھ کر خوشی ہوئی تھی کہ ہماری جماعت میں خدا کے فضل سے بیداری پائی جاتی ہے''

یہ میری حضور سے پہلی ملاقات تھی۔اس کے بعد مَیں نے ہمیشہ حضرت میاں صاحب کو باپ کی طرح شفیق پایا۔بلاجھجک آپ کے حضور پہنچ کر عرض معروض کرتی اور بسا اوقات ضد کر کے بھی اپنی بات منوا لیتی۔آپ تھوڑی سی پس وپیش کے بعد میری معروضات منظور فرما لیتے۔مَیں چند واقعات کا ذکر کرتی ہوں:

مَیں موضع دسوہہ ضلع لائلپور میں اپنی زمین پر رہتی تھی۔حضرت میاں صاحبؓ کے ساتھ خط و کتابت بھی رہتی تھی۔حضور جب لاہور وغیرہ جاتے تو وہاں سے بھی خطوں کے جواب با قاعدہ عنایت فرماتے۔جب واپس ربوہ تشریف لانے کا پروگرام ہوتا تو مجھے حکم فرماتے کہ ربوہ پہنچ جاؤ۔مَیں حسب الحکم ربوہ پہنچ جاتی۔تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ مَیں ربوہ پہنچی لیکن حضور کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔

مَیں نے ایک خط میں عرض کیا کہ آپ کے حکم کے موجب مَیں ربوہ پہنچ گئی تھی۔لیکن حضور تشریف نہ لائے اور مَیں واپس آ گئی۔اس کے جواب میں آپ نے بڑا ہی شفقت بھرا خط لکھا اور بار بار اس میں افسوس اور معذرت کا اظہار فرمایا۔آہ اب مَیں ایسی شفیق ہستی کی ہمدردیوں سے محروم ہو گئی۔

مَیں چوتھی مرتبہ جب ربوہ گئی تو حضور ربوہ تشریف فرما تھے۔مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بار بار میری پہلی تکلیف کا ذکر فرمایا اور مَیں حضور کے بار بار ایسا کرنے پر شرمندہ ہو جاتی۔

آپ مجھ سے میرے گھر کے ہر معاملہ کے متعلق دریافت فرماتے اور اس ٹوہ میں رہتے کہ معلوم کریں کہ انہیں کوئی مالی تنگی تو نہیں۔مَیں ہمیشہ اطمینان کا اظہار کرتی۔چونکہ ڈاکٹر صاحب قادیان میں درویش تھے۔اس لئے زمین کی دیکھ بھال مجھے ہی کرنی پڑتی۔مزارعین سے ہر وقت کا واسطہ رہتا۔ایک دفعہ فرمایا ’’کہ بتاؤ جب زمین پر جاتی ہو تو برقعہ پہن کر جاتی ہو‘‘۔مَیں نے عرض کیا کہ حضور مَیں تو چادر اوڑھ کر جاتی ہوں اور چادر اوڑھے ہی اپنے مزارعین سے کام کراتی ہوں۔اس طرح پردہ بھی ہو جاتا ہے اور کام میں بھی آسانی رہتی ہے۔

فرمانے لگے ''چادر اوڑھ کر دکھاؤ۔ کس قسم کا پردہ کرتی ہو۔'' مَیں نے چادر اوڑھ کر اپنے پردہ کا طریق دکھایا۔ آپ لیٹے ہوئے تھے۔ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے ''کہ یہی اسلامی پردہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک ایسے درویش ہیں جن کی طرف سے مَیں مطمئن ہوں۔ اور ان کے گھر کی طرف سے بھی مطمئن ہوں۔'' پھر فرمایا: ''ہم بھی زمیندار ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ہمارے گھر کی عورتیں بھی اپنی زمینوں سے ایسا ہی لگاؤ رکھیں''

چیچی والے ابا جی

پارٹیشن کے وقت میری بڑی لڑکی دو سال کی تھی اور چھوٹی لڑکی بعد میں پیدا ہوئی۔ دونوں بچیاں اپنے باپ کی شکل سے واقف نہ تھیں۔ حضرت میاں صاحب ؓ ان بچیوں سے بڑا پیار فرماتے۔ کئی قِسم کی چیزیں مٹھائیاں وغیرہ کھلونے، غبارے بچیوں کو دیتے اور بچیاں حضور کو چیچی والے ابا جی کہہ کر پکارتیں۔ آپ یہ نام سن کر خوب ہنستے اور فرماتے! ''میرا ایسا نام پہلے کسی بچی نے نہیں رکھا'' اور بچیوں کو گود میں لے کر پیار کرتے۔ حساس اتنے تھے کہ دوسرے کے متعلق کوئی تکلیف دہ بات سن کر بہت متأثر ہوتے۔ ایک مرتبہ مَیں بیمار ہوگئی تو لائلپور ایک ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے گئی۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کہہ کر بات کی تو میری بچی جس کو ہر وقت ابا کی انتظار رہتی تھی چونک پڑی اور کہنے لگی۔ ''امی یہ میرے ابا جی ہیں'' مَیں نے کہا نہیں۔ کہنے لگی ڈاکٹر جو ہیں۔

حضرت میاں صاحب یہ واقعہ سن کر آب دیدہ ہوگئے اور فرمایا: ''اے خدا! ان بچّیوں کو جلد ان کا باپ دکھا۔'' آپ کی طبیعت میں مزاح بھی تھا۔ ایک مرتبہ اُس خط کا جس کا مَیں اوپر ذکر کر چکی ہوں ذکر کرکے فرمایا: ''اچھا یہ بتاؤ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کیا ہوا کرتا تھا۔'' مَیں شرمندہ ہوگئی اور عرض کیا کہ حضورؓ کی ہی ایک کتاب میں یہ واقعہ پڑھا تھا۔ خوب ہنسے اور فرمایا۔ ''بلی نے شینہہ نوں پڑھایا۔ تے مُڑ بلی نوں کھاون آیا۔''

1950ء کے قافلہ میں مَیں قادیان جلسہ سالانہ پر گئی۔ واپسی پر میاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو بڑے خوش ہوئے اور فرمایا ’’الحمدللہ اب مَیں خوش ہوں۔ اب تمہارے خط کا بوجھ میرے دل سے اتر گیا ہے۔‘‘ اس کے بعد مَیں مستقل طور پر قادیان چلی گئی۔ وہاں حضورؓ کے پدرانہ خطوط آتے رہتے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی نصیحت کرنی ہوتی تو براہِ راست نہ لکھتے بلکہ مجھے مخاطب کر کے لکھتے۔ وہاں بھی میرے ہاں یکے بعد دیگرے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں آپ ہر لڑکی کی پیدائش پر بڑے تسلی بخش اور پُر امید خط لکھتے کہ اللہ تعالیٰ لڑکا بھی دے گا۔ اکثر فرماتے: ’’دیر ہے اندھیر نہیں۔‘‘

ایک مرتبہ کتاب ’’تذکرہ‘‘ کی ضرورت پڑی۔ مَیں نے حضورؓ سے یہ کتاب مانگی۔ مجھے دے کر فرمانے لگے ’’گُم نہ کر دینا۔‘‘ محتاط طبیعت اللہ تعالیٰ سے پائی تھی۔ دوبارہ فرمایا۔ ’’گُم نہ کر دینا‘‘ پھر تیسری دفعہ فرمایا۔ ’’گُم نہ کر دینا۔ احتیاط سے واپس کر دینا‘‘۔ پھر فرمایا ’’یہ کتاب لے جا رہی ہو۔ اگر گُم کر دی تو پھر دیکھنا‘‘۔ دوسرے دن مَیں ملنے گئی تو فرمایا: ’’کتاب لائی ہو‘‘ مَیں نے عرض کی: ابھی مضمون مکمل نہیں ہوا۔ فرمایا: ’’گُم کر دی تو پھر دیکھنا‘‘ تیسری مرتبہ گئی تو پھر یہی فرمایا کہ اگر کتاب گُم کر دی تو پھر دیکھنا۔ مَیں نے عرض کیا: فرض کر لیں کہ مَیں نے گُم کر دی تو پھر آپ کیا کریں گے۔ اس پر حضورؓ ہنس کر خاموش ہو گئے۔

ایک مرتبہ ایک ضروری عرض لے کر حضورؓ کی خدمت میں گئی اور باصرار اپنی بات منوانے پر زور دیا۔ حضورؓ (حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ) نے فرمایا: ’’مَیں تو تمہارے گھڑے کی مچھلی ہوں جب چاہا! پکڑ لیا۔ بڑی سرکار (حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ) میں جا کر اس طرح کرو تو جانیں۔‘‘ مَیں آب دیدہ ہو کر بولی: ایک زمانہ تھا کہ حضرت اقدس کے حضور بھی بلا جھجھک بات کر لیا کرتی تھی اب تو حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی بیماری کے پیشِ نظر قصرِ خلافت کی دیواریں حائل ہو گئی ہیں۔

میرے ہاں جب چھٹی لڑکی پیدا ہوئی تو مَیں واپس پاکستان آ چکی تھی۔ اطلاع ملنے پر حضور نے مجھے بہت تسلی کا خط لکھا اور جب مَیں کچھ عرصہ بعد ملاقات کے لئے حاضر ہوئی تو تسلی دیتے

ہوئے فرمانے لگے۔ ’’کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور لڑکا دے گا‘‘۔ مَیں نے عرض کیا۔ حضورؓ میری صحت اب بہت کمزور ہوگئی ہے۔ بلڈ پریشر کی بھی مریضہ ہو چکی ہوں۔ اب دعا کریں کہ اب بچہ پیدا نہ ہو۔ فرمایا ’’ایسا مت کہو اور ناامید نہ ہو۔‘‘ پھر مَیں نے اصرار کیا اور کہا: اب مَیں کچھ نہیں چاہتی تو فرمانے لگے۔ ’’میری یہ شدید خواہش ہے کہ تمہاری گود میں لڑکا دیکھوں۔ مَیں دعا بھی کرتا رہتا ہوں۔‘‘

پھر ساتویں لڑکی پیدا ہوئی تو حضور خاموش رہے۔ اور کوئی ذکر نہ کیا۔ حضور میرے لئے دعا کرتے رہے اور بعض دفعہ ڈاکٹر صاحب ملنے کے لئے جاتے، اگر کوئی بزرگ پاس بیٹھے ہوتے تو مِل کر دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو لڑکا عطا فرمائے۔

آخر اللہ تعالیٰ نے حضور کی دعائیں قبول فرمائیں اور عاجزہ کو لڑکا عطا فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب اطلاع دینے آپ کی خدمت میں گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں مٹھائی دیکھ کر سمجھ گئے اور بے تابی سے پوچھا۔ ’’جلدی بتاؤ کیا خبر لائے ہو‘‘ اور بغیر جوتا پہنے دروازہ تک جلدی قدم بڑھاتے آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا فرمایا ہے تو فرطِ انبساط سے ڈاکٹر صاحب کو سینہ سے لگا کر خوب بھینچا اور بار بار بغلگیر ہوتے اور فرماتے جاتے۔ الحمد للہ الحمد للہ۔ اور مجھے نہایت ہی شفقت بھرا مبارک باد کا خط لکھا کہ آخر اللہ تعالیٰ نے تمہاری سُن ہی لی۔

خدا شاہد ہے اتنا قلق لڑکا نہ ہونے کا کسی دادا، نانا کو نہیں ہوتا۔ جتنا ہمارے باپ سے زیادہ شفیق حضرت میاں بشیر احمد صاحب کو تھا۔ آپ کی زبان مبارک اتنی مبارک اور پاکیزہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کے قول کی لاج رکھ لی۔

جب ہم قادیان سے 9 سال کی درویشی کے بعد ربوہ آئے تو ہمارا تمام اندوختہ ختم ہو چکا تھا۔ کچھ سری نگر رہ گیا، کچھ قادیان کے زمانے میں خرچ ہو گیا۔ ربوہ میں کرایہ کے مکان میں رہنا پڑا۔ 35 روپیہ کرایہ تھا۔ بڑی مشکل کے دن تھے۔ ربوہ میں زمین مَیں پہلے ہی خرید چکی تھی اس

لئے اپنا مکان بنانے کا ارادہ کیا۔ مکان بنانے کے لئے روپیہ نہیں تھا۔ اس لئے زرعی زمین میں سے کچھ حصہ فروخت کر دیا اور سودا کر کے بیعانہ بھی وصول کر لیا۔ مَیں حضرت میاں صاحبؓ کی خدمت مبارک میں دعا کے لئے حاضر ہوئی۔ تمام قصہ کہہ ڈالا۔ سُن کر سختی سے منع فرمایا کہ زرعی زمین ہرگز فروخت نہیں کرنی۔ یہ کوئی عقل مندی نہیں کہ زمین بیچ کر مکان بناؤ۔ مَیں گھبرا گئی اور عرض کیا کہ ہمارے لئے ماہوار کرایہ دینا مشکل ہے اور اب تو سودا بھی پختہ ہو چکا ہے۔ بیعانہ بھی لے چکے ہیں اور مقررہ تاریخ پر باقی رقم وصول کرنی ہے۔ حضور نے فرمایا ''مکان خود بخود بن جائے گا۔ زمین نہیں بیچنی۔ مَیں بار بار عرض کرتی رہی کہ اب تیر ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ آپ بار بار یہی فرماتے ''نہیں، نہیں زمین نہیں فروخت کرنی۔ مکان بن جائے گا۔ دعا کرو اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا۔''

یہ ایک معجزہ ہے۔ جو الفاظ حضرت قمر الانبیاء کی زبانِ مبارک سے نکلے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ عظیمہ سے پورے فرمائے۔ الحمد اللہ۔ زمین کے گاہک نے جس تاریخ کو روپیہ ادا کرنا تھا کسی وجہ سے وہ لیٹ ہو گیا اور بموجب معاہدہ سودا فسخ ہو گیا۔ گو معاہدہ کی رُو سے زرِ بیعانہ ایک ہزار ہمارا حق تھا۔ لیکن ہم نے یہ رقم بھی اسی خوشی میں گاہک کو واپس کر دی۔ وہ بھی خوش ہو گیا۔ ہماری زمین ہمارے پاس رہی اور اللہ تعالیٰ کے پیارے کی بات پوری ہوئی۔

دوسرا مرحلہ مکان بنانے کا تھا۔ حضرت میاں صاحبؓ کی ہدایت کے مطابق 300 روپیہ انجمن سے قرض لیا اور مکان کی بنیادیں رکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل فرمایا کہ روزانہ مستری، مزدوروں اور دیگر چھوٹے اخراجات کے لئے وہ رقم بھیج دیتا اور جب تک مکان بنتا رہا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اُس سال زمین کی فصل سے بھی غیر معمولی طور پر زیادہ آمد وصول ہوئی اور مکان بنتے بنتے اچھی خاصی کوٹھی تیار ہو گئی۔ جو حصّہ مکان کا ہم نے اُس وقت نہ بنایا اب اکثر کفِ افسوس ملتے ہیں کہ اگر اُس وقت بنا لیتے تو اللہ تعالی کا خاص فضل جاری تھا، ضرور بن جاتا۔ اس وقت کی حالت یاد کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت یاد آتی ہے اور حیرانی ہوتی ہے کہ اتنا بڑا مکان بغیر

ٹھوس سرمایہ کے کیسے بن گیا اور حضرت میاں صاحبؓ کے پاکیزہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ مکان خود بخود بن جائے گا۔ حضور برابر یہ ہدایت فرماتے کہ صرف اینٹوں کا مکان کھڑا کر لو۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ کا خیال نہ کرنا۔ اندر سے پختہ کر لینا۔ ہم نے حضور کی ہدایت پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت آرام دہ اور فراخ مکان عطا فرمایا۔ گویا ہمارے لئے بنا بنایا مکان غیب سے عطا فرمایا۔

اب مضمون لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے مَیں ایک اور واقعہ کا ذکر کر کے ختم کرتی ہوں۔ میرے لڑکے کی پیدائش کے بعد مجھے رحم میں تکلیف رہنے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ رسولی ہے اور اس کا آپریشن ہی علاج ہے۔ مختلف معالجوں سے دو سال تک علاج کروانے کے بعد آخر مصمّم ارادہ کر لیا کہ آپریشن کروا لیا جائے۔ مَیں دعا کی عرض کرنے کے لئے آپ کی خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئی۔ تمام سرگذشت سننے کے بعد فرمایا۔ ''آپریشن نہیں کروانا'' مَیں نے عرض کیا کہ تین مرتبہ بیمار ہوئی ہوں اور آخری بار تو مَر کے بچی ہوں۔ فرمایا ''بچ تو گئی ہو، آپریشن نہیں کرانا۔'' مَیں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طرح حضورؓ راضی ہو جائیں اور آپریشن کی اجازت فرماویں اور دعا کریں۔ لیکن حضور کا ایک ہی حکم تھا کہ آپریشن نہیں کرنا۔ فرمایا۔ ''خدا تعالیٰ میں اتنی قدرت ہے کہ وہ بغیر آپریشن کے اچھا کر سکتا ہے۔ مَیں نے جھنجھلا کر عرض کی کہ کیا حضور کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپریشن نہیں کرانا۔ فرمایا ''کچھ سمجھ لو۔ میری یہ خواہش ہے کہ تمہارا بیٹا اکیلا نہ رہے۔''

ہم دعاؤں میں مشغول ہو گئے اور میرے میاں ڈاکٹر صاحب نے ایک دیسی دوائی تیار کر لی۔ مَیں نے استعمال کرنی شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ مجھے ایک ماہ کے استعمال سے ہی صحت محسوس ہونے لگی۔ مَیں پھر لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے دیکھ کر بڑی حیرانی کا اظہار کیا کہ وہ رسولی اور ورم وغیرہ سب کافور ہو چکے تھے۔ مَیں نے سب ماجرا بیان کیا کہ کس طرح حضرت میاں صاحب نے منع فرمایا تھا، یہ حضور کے کہے ہوئے الفاظ کا معجزہ ہے۔ لیڈی ڈاکٹر بہت متأثر ہوئی اور کہا کہ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ایسے بزرگ ملے ہوئے ہیں۔ چنانچہ

لیڈی ڈاکٹر نے دوا حاصل کرنے کے لئے اشتیاق ظاہر کیا۔ اس کو بھی وہ دوا مریضوں کے استعمال کے لئے دی گئی۔ اس کے علاوہ مَیں نے خود بہت سی مریض خواتین کو دی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر ایک کو نمایاں فائدہ ہوا۔

مَیں بہت خوش تھی کہ حضورؒ لاہور سے صحت یاب ہو کر واپس تشریف لائیں گے تو اپنی صحت کی بحالی اور حضور کے الفاظ پورا ہونے کا مژدہ سناؤں گی۔ لیکن آہ مجھ بدقسمت کو وہ گھڑی نصیب نہ ہوئی اور مَیں نے آپ کا رُخِ انور اس وقت دیکھا جب حضور اپنے مولا کو پیارے ہو چکے تھے۔

اِنَّالِلّٰہِ وَ اِنَّآاِلَیۡہِ رَاجِعُون، کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ ○ وَّیَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ ○۔ (سورۃ الرحمٰن: 28-27)

سینکڑوں مشکل مرحلے سامنے آتے ہیں اور بے ساختہ دل پکار اٹھتا ہے۔ ٹھہرو! حضرت میاں صاحبؒ سے مشورہ کر کے آتی ہوں۔ لیکن آہ! اب وہاں پہنچ کہاں۔ آپ تو سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قرب میں مسند نشین ہیں۔ مَیں زمینی انہیں کہاں پاؤں! اے شفیق باپ، تجھ پر ہزاروں سلام۔ دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں تیری حاضری تجھے مبارک۔ ہم صبر چاہتے ہیں۔ اے ذوالجلال خدا ہماری عاجزانہ دعاؤں کو اپنی رحمت سے قبول فرما۔ آمین۔

امی نے ہمیں ان بزرگوں اور جماعت کے دوسرے بزرگوں کی باتیں سُنا سُنا کر ہمارے دلوں میں ادب اور محبت پیدا کی اور ہمیشہ اس بات کی نصیحت کی کہ بزرگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، بزرگوں سے تعلق رکھو۔ آپ نے قادیان میں چند سال بطور درویش قیام کیا۔ درویشوں کی خدمت کی توفیق پائی اور تمام عمر ان کے ساتھ گذرا ہوا زمانہ محبت سے یاد کرتی رہیں۔

امی اور ابا جی میں بہت محبت کا رشتہ تھا۔ ہمارے خاندان میں آپ دونوں مثالی جوڑا کہلاتے تھے۔ چونکہ ابا جی بیمار رہتے تھے اس لئے امی کو بہت وہم رہتا تھا۔ جب ابا جی کام کے لئے گھر سے نکلتے تو دعا کرتے ہوئے رُخصت کرتیں اور جتنی دیر باہر رہتے زیرِ لب دعا کرتی رہتیں۔ ہمیں بھی ہر وقت دعا کی تلقین کیا کرتیں۔ ہم امی کی بہ نسبت ابا جی کا بہت زیادہ خیال کرتے کیونکہ امی

نے ہمارے دلوں میں ان کی محبت حد سے زیادہ بڑھا دی تھی۔ دونوں پڑھے لکھے تھے۔ علمی اور ادبی مزاج کے مالک۔ ہمیں ان کی علمی، دینی اور تاریخ کے موضوع پر سیر حاصل بحثیں سُننے کو ملتیں نیز ہمارے دوسرے بزرگ گھر میں آتے تو بیکار باتوں کی بجائے علمی اور دینی محفل لگتی۔

کہتے ہیں کہ محبت کا تعلق دوسرے جہان میں بھی جا کر نہیں ٹوٹتا۔ یہی معاملہ امی کے ساتھ بھی ہوا۔ اباجی کی وفات کے بعد آپ 40 دن تک ہر روز قبر پر دعا کے لئے گئیں۔ ایک دن اباجی کی قبر پر تھوڑی دیر رُکنے اور دعا کرنے کے بعد واپس جانے کو پلٹیں تو نہایت زور سے اباجی کی آواز سُنائی دی۔ آپ نے پنجابی میں پوچھا (ٹُر چلیّ ایں؟) کیا جا رہی ہو؟ امی نے بتایا ''مَیں سخت خوفزدہ ہوئی۔ چاروں طرف دیکھا قبروں کے سوا کوئی دوسرا وجود نہ تھا۔ ہُو کا عالَم تھا مَیں بہت ڈری اور واپس بیٹھ گئی اور دیر تک دعا کرتی رہی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ میرے جلدی چلے آنے پر ڈاکٹر صاحب کی روح کو تکلیف پہنچی اور مجھے کافی دیر تک بیٹھنا چاہیئے۔''

ہماری امی کی طبیعت میں سختی نہ تھی۔ ہمارے ساتھ دوستوں کی طرح باتیں کیا کرتی تھیں۔ مَیں سمجھتی ہوں میرے ساتھ ان کو بہت تعلق تھا۔ میرے ساتھ اپنے سارے راز و نیاز بیان کرتی تھیں۔ مجھے بھی ان کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ جب بھی مَیں ان کی ادنیٰ سی خدمت کرتی تو ڈھیروں دعائیں پاتی۔

1992 میں امی ناروے آئی ہوئی تھیں۔ اگست 1992 کو اللہ تعالیٰ نے مجھے رافعہ بیٹی عطا کی۔ امی کو پاؤں میں موچ آ گئی مگر وہ میرے پاس آنے کے لئے شدید بے چین تھیں آخر کار گھر والوں نے بھی ان کی بات مان ہی لی اور وہ میرے ہاں تکلیف کے باوجود چلی آئیں۔ میرے ہاں چند ماہ رہنے کے بعد براستہ لندن پاکستان چلی گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام بچّوں کی ذمہّ داریوں سے فارغ کر دیا تھا مگر پھر ان کی صحت گرنے لگی۔ یادداشت کمزور ہونے لگی۔ سب لڑکیاں بیاہ کر گھر سے رُخصت ہو چُکی تھیں۔ عزیزم خالد منیر احمد کی شادی لندن ہو گئی، پھر امی کو اپنی بیٹی فاخرہ سعید کے ہاں سرگودھا میں رہنا پڑا۔ آپ کی صحت دن بدن کمزور ہوتی گئی حتیٰ کہ یادداشت برائے نام رہ گئی۔ جتنی دیر امی نے ان کے ہاں قیام کیا

باجی فاخرہ، سعید بھائی اوران کے پانچوں بچوّں عزیزم مرزا نوید احمد، عزیزم مرزا مدثر احمد، عزیزہ منزہ، عزیزہ عافیہ اورعزیزہ مہرین نے ان کی بے لوث خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجرِ عظیم عطافرمائے اور دونوں جہانوں میں اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھے۔

دسمبر 1997ء میں بیماری بڑھ گئی۔ خوراک اندر نہ جاتی تھی اس لئے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ 8 دسمبر 1997ء کو بے ہوشی کی حالت میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور یوں ہماری ہر وقت دعائیں کرنی والی اور نہایت چاہنے والی ماں ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اگلے دن ان کا جنازہ ربوہ اباجی کے گھر لایا گیا اور پھر نماز جنازہ کے بعد بہشتی مقبرہ ربوہ میں قطعہ نمبر 20 میں دفنا دیا گیا۔

(باجی فاخرہ کے سوا ہم تمام بہن بھائی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حیات ہیں۔ ذیل میں اپنی مرحومہ بہن کی یاد میں چند سطور تحریر کر رہی ہوں:)

فاخرہ جبین اہلیہ محترم مرزا سعید احمد صاحب

ہماری فاخرہ باجی مرحومہ نہایت میٹھی اور سادہ طبیعت کی خاتون تھیں۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں نے ان کا نام سادھو بادشاہ، ملنگ شاہ رکھا ہوا تھا۔ آپ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے امی نے ایک خواب دیکھا وہ بیان کرتی ہیں:

”ایک رات جبکہ فاخرہ ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی مَیں نے ایک عجب خواب دیکھا کہ میری شادی ایک آدمی، جس کا نام عبدالحق ہے، سے ہوگئی ہے مَیں نے اس خواب کو بہت متوحش جانا۔ غم سے میرا بُرا حال تھا۔ رو رو کر آنکھیں سُوج گئیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے تسلی دیں کہ کیا مَیں تمہیں طلاق دے رہا ہوں جو تم اتنی پریشان ہوتی ہو۔ میری طبیعت میں بہت وہم تھا۔ ایک عرصہ دراز تک یہ خواب میرے حواس پر چھایا رہا اور جب فاخرہ کی شادی مکرم مرزا عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ امیر ضلع سرگودھا کے بیٹے عزیزم مرزا سعید احمد صاحب کے ساتھ طے پائی تو

مجھے کئی برس پہلے کی خواب کی تعبیر معلوم ہوئی۔‘‘

باجی فاخرہ کی بچپن میں صحت بہت اچھی تھی۔سُرخ سفید، ہنستی کھیلتی، چُست و چالاک بچی تھی اور بہت نڈر۔آپ کو کم عمری میں ٹائیفائیڈ ہو گیا اور گہرے نشان چھوڑ گیا جس کا صحت پر بہت بُرا اثر پڑا اور پڑھائی ایک مشکل امر ہو گیا۔طبیعت میں لا پرواہی تھی، مرنجاں مرنج کسی بات کا بُرا نہ مانتی تھیں۔کیسی بھی ناراض ہونے والی بات ہوتی ہنستی رہتی تھیں۔کوئی کچھ بھی کہہ لے، کینہ غصہ نہ رکھتی تھیں اور فوراً بھول جاتی تھیں۔

ہمارے والدین نے بچپن سے ہی نماز اور قرآن کی عادت ڈالی ہوئی تھی۔قرآن پاک کا ترجمہ وتفسیر توجہ سے پڑھی۔تجرید بخاری اور فقہ کی بہت سمجھ تھی۔اسلامیات سے بہت لگاؤ تھا۔باجی کو دین کی طرف ہمیشہ سے رغبت تھی۔آپ نماز بہت لمبی اور توجہ کے ساتھ پڑھا کرتیں پھر ان کی تسبیح بھی بہت لمبی ہوتی۔بچپن سے اجلاسوں میں جاتیں اور دینی سرگرمیوں میں حصّہ لیتیں نیز تلاوت اور نظم کے مقابلوں میں شوق سے حصہ لیا کرتی تھیں۔غریب پروری، صدقات دینا اور اقرباء کا خیال رکھنا ان کی نمایاں خوبیاں تھیں۔

آپ نہایت محنت سے سکول کے سبق اونچی آواز سے پڑھا کرتیں۔ان کے اس طرح پڑھنے سے مجھے بھی شوق پیدا ہوا اور میں نے بھی ان کی اسلامیات کی کتابیں اور فقہی مسائل کم عمری میں پڑھ ڈالے۔جامعہ نصرت ربوہ سے تعلیم حاصل کی۔اپنے وقت کی بہترین اتھلیٹ تھیں۔بارہا بورڈ اور یونیورسٹی کی منعقد کردہ کھیلوں کے مقابلہ جات میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔باجی کھیل کی بہت شوقین تھیں۔والی بال اور نیٹ بال بہت اچھا کھیلتی تھیں اور جامعہ نصرت کی ٹیم کے ساتھ باہر کے تعلیمی اداروں میں مقابلوں کے لئے جانے کا بھی موقعہ ملا۔اونچی چھلانگ اور لمبی دوڑوں میں اکثر انعام کی حقدار قرار پائیں۔ایبٹ آباد میں پہلی مرتبہ games camp لگایا گیا۔اس کیمپ میں پاکستان بھر سے لڑکیاں شامل ہوئیں۔کئی مقابلہ جات ہوئے۔جامعہ نصرت ربوہ کے حصّہ میں صرف ایک دوئم انعام آیا جو باجی نے اونچی چھلانگ میں حاصل کیا۔

کالج کی پرنسپل بہت خوش تھیں کیونکہ یہ ہمارے کالج کے لئے بڑا اعزاز تھا۔

والدین کی اطاعت کی عادت تھی۔آپ کی طبیعت بہت نڈر تھی، کیڑے مکوڑوں اور سانپوں سے بالکل نہ ڈرتی تھیں۔ایک مرتبہ گھر کے عقبی دروازہ کو رات کے وقت تالا لگانے گئیں وہاں ایک لمبا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔واپس لوٹ آئیں اور نہایت اطمینان سے ہنس ہنس کر اور جھوم جھوم کر بتایا۔

ان کے میاں نے ایک مرتبہ ان کی دلیری کا امتحان لینا چاہا۔رات کے بارہ بجے ہوئے تھے۔ بھائی جان نے منہ پر کپڑا لپیٹا اور چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے باجی بالکل نہ گھبرائیں اور ان کو چور سمجھ کر مارنا اور دھتکارنا شروع کر دیا۔ بے چارے بھائی جان ان کی اس جرأت پر خود ہی ڈر گئے اور منہ سے کپڑا ہٹالیا کہ کہیں پِٹ ہی نہ جائیں۔

اپنے بچوں کے اندر بھی بہادری کی اس صفت کو ودیعت کیا۔بچوں کو کبھی کسی چیز سے نہ ڈراتی تھیں۔ 1970-1971ء کی جنگ جاری تھی ۔سرگودھا میں دشمن کے جہاز ہر روز بمباری کرتے۔ جونہی بمبار طیارے آتے شہر کی فضا الارم کی آواز سے گونج اُٹھتی لوگ ڈر کر خندقوں میں پناہ لیتے۔ باجی نے کھانے کے بڑے میز کو اپنی محفوظ پناہ گاہ بنا رکھا تھا بچے کو لپیٹ کر اس کے نیچے گھُس جاتیں اور دونوں مزے سے کمرے میں سو رہے ہوتے۔کسی قسم کا کوئی ڈر آپ کے نزدیک نہ پھٹکتا تھا۔

آپ کھانا بہت عمدہ پکاتی تھیں۔ایک بڑی صفت ان کا ہر مشکل اور مصیبت میں صبر اور قناعت تھا۔تین بیٹیاں فوت ہوئیں۔ان کو نہلا دھلا کر صبر سے رخصت کیا۔انسانوں پر مختلف مشکلات اور مصائب آتے ہیں مگر آپ ہر مشکل کے وقت صبر کا پہاڑ دکھائی دیتیں۔1974ء میں جبکہ احمدیت کے خلاف شورش تھی ،آپ اپنے سسرال گودھا میں تھیں۔اچانک ایک روز دوپہر کے وقت سینکڑوں کی تعداد میں نعرے مارتے ہوئے اور غصے سے بپھرے ہوئے اسلام کے نام نہاد غازیوں نے آپ کے گھر پر دھاوا بول دیا۔اس وقت بھائی جان لاہور گئے ہوئے تھے اور

آپ تین کم سن بچوں کے ساتھ گھر میں آرام کر رہی تھیں۔ بھٹو سرکار کے مسلمان سر پر آ پہنچے اور اپنی وحشیانہ خصلتوں کا مظاہرہ کیا۔ لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کا نقصان تو ایک طرف، ان مہربانوں نے اللہ کے کلام پاک کو پھاڑ کر نہایت بے ادبی سے مغلظات بکتے ہوئے زمین پر پٹخا۔ پھر بارود چھڑک کر گھر کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس وقت باجی کو اپنی اور بچوں کی جان بچانے کی فکر تھی۔ ایک دو ماہ کی بچی عزیزہ عافیہ گود میں اٹھائی، دوسری بچی عزیزہ منزّہ ڈیڑھ سال کی تھی اسے بھی دوسرے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ تیسرا بیٹا عزیزم نوید احمد تقریباً اڑھائی سال کا تھا۔ گھبراہٹ اور بے چینی میں اسے اٹھا نہ سکیں مگر اس پُر آشوب وقت میں اسے چھوڑ بھی نہ سکتی تھیں۔ لہٰذا گھسیٹتے ہوئے نہایت مشکل سے گھر سے باہر نکل گئیں۔ ان کے سُسرال والے اس واقعہ کو نہایت تکلیف سے یاد کیا کرتے ہیں۔ نہایت مشکل سے انہوں نے ان تین معصوم جانوں کے ساتھ گھر کا بہت بڑا صحن پار کر ہی لیا۔ اس وقت ان کے سر پر فقط سادہ سا جارجٹ کا دوپٹہ تھا۔ چادر یا بُرقعہ اوڑھنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔ اسی حالت میں جو باہر نکلیں تو کچھ فاصلے پر ایک ہمسایہ نے، جس نے بھینسیں پال رکھی تھیں، جانوروں کے ڈھارے میں چُھپا کر ٹاٹ کا پردہ تان دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر عطا کرے۔ وہ ایسا مشکل وقت تھا کہ گھر والوں کے ساتھ بچے بھی سہمے بیٹھے تھے۔ چند ساعتوں کے بعد جب جلوس منتشر ہو گیا تو گھر کو لوٹیں۔ پُرانے وقتوں کی ہندووانہ طرز پر بنائی گئی یہ حویلی جل کر خاک ہو چکی تھی۔ کوئی جزع فزع کی نہ ماتم کیا۔ سامنے پولیس کی بھاری نفری بیٹھی آگ کے شعلوں میں ایک کے بعد ایک چھتوں کے شہتیروں کو گرتا ہوا دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ باجی ان کے پاس گئیں اور وہ جلی کٹیں سُنائیں مگر ان میں سے کسی کو جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ بھائی جان اس دن شہر سے باہر تھے جب یہ قیامت ٹوٹی۔ پھر بھائی جان کے ایک غیر از جماعت وفادار دوست کو پتہ چلا اور وہ ہماری بہن اور بچوں کو رات بارہ بجے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ربوہ چھوڑ گئے۔ گھر جلنے کا غم کس کو نہیں ہوتا۔ عزیز و اقارب آئے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ باجی ایک ہی بات تڑپ تڑپ کر کہتی جاتی تھیں کہ ”مجھے اور کسی چیز کا دُکھ نہیں۔ قرآن پاک کی جس طرح ان

لوگوں نے بے ادبی کی اور پھاڑ کر ہمارے قرآن زمین پر پٹختے رہے اس کی بہت تکلیف ہے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔‘‘

چھوٹی بچی کا نام ابھی تجویز نہیں کیا گیا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر امی جان نے کہا کہ بچی کا نام عافیہ رکھو، خدا تعالیٰ تمہارے گھر میں عافیت رکھے۔ چنانچہ انہوں نے امی کی خواہش کے مطابق اس کا نام عافیہ رکھا۔ پھر اس کے بعد اس گھر کے دوبارہ بننے تک ہمارے ہاں ربوہ میں ہی رہیں۔ یہ سارا وقت باجی نے نہایت صبر سے کاٹا اور جب واپس گئی ہیں تو نیا تعمیر شُدہ مکان بہت ٹھنڈا اور تکلیف دہ تھا اور پہلے جیسی سہولیات بھی نہ تھیں جس کی وجہ سے کچھ عرصہ صبر آزما تھا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے خاموشی سے گزارا۔

ان کو محنت کی بہت عادت تھی۔ جس کام کی دُھن لگ جاتی وہ کر کے چھوڑتی تھیں۔ ان کو والدین کی خدمت کی بھی خوب توفیق ملی۔ امی نے زندگی کے آخری سال آپ کے پاس گذارے۔ یوں باجی، بھائی جان اور ان کے بچوں کو امی کی بیماری میں ان کی خدمت کا خوب موقعہ ملا۔ امی کی یادداشت کمزور ہو چکی تھی۔ وفات سے چند ماہ پہلے امی کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور بالکل ہی معذور ہو کر رہ گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ بھائی جان، ان کے بچوں اور باجی کو اپنی جناب سے اجرِ عظیم عطا فرمائے اور اس خدمت کے عوض ان سب پر اپنے فضل و رحم کی بارشیں برسائے۔

باجی غریب پرور تھیں، صدقات کثرت سے ادا کرتیں۔ خدمتِ دین میں پیش پیش تھیں۔ ان کے ہاں محلے کا اجلاس ہوا کرتا تھا۔ جلسہ سیرت النبی ﷺ ذوق شوق سے منایا جاتا۔ اس جلسہ سے پہلے وہ سارے محلے کا دورہ کر کے کچھ رقم اکٹھی کر لیتیں تا کہ چائے کا انتظام کیا جا سکے اور پھر اردگرد کی غیر از جماعت خواتین اور بچیوّں کو مدعو کیا جاتا۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں مَیں خود بھی شامل تھی۔ نہایت معیاری جلسہ ہوا پھر اس کے بعد پُر تکلّف چائے پیش کی گئی جس میں اہلِ حلقہ کی کثیر تعداد نے شامل ہو کر ثواب حاصل کیا۔

ناصرات الاحمدیہ کی سیکرٹری کے طور پر ایک لمبا عرصہ کام کیا۔ ناصرات کو خود تقاریر لکھ کر دیا

کرتیں۔ان کو تیار کر کے ربوہ مقابلہ جات کے لئے لے کر آتی تھیں۔اسی طرح ان بچیوّں کو کھیل کے مقابلہ جات کے لئے بھی مرکز لے کر آنا آپ کے فرائض میں شامل تھا۔

ان کی صفات میں اقرباء پروری بہت نمایاں تھی۔ میکے اور سسرال والوں سے محبت ان کا خاصہ تھا۔ ماں باپ سے سسرال کے گھر جا کر بھی بہترین مگر سادہ زندگی گزاری۔ ہمیشہ سسرال سے عزت ہی پائی۔ حضرت ومرزا عبدالحق صاحب کو اپنی اس بہو اور بچوں سے خاص لگاؤ تھا۔ نہ کبھی کسی کا بُرا چاہا نہ غصہ کیا، نہ بے جا غیرت دکھائی، نہ تکبر نہ بڑائی، نہ لالچ کیا، نہ کبھی نمائش کا خیال آیا۔شادی کے بعد سارا زیور چوری ہو گیا، آپ نے انتہائی صبر کا مظاہرہ کیا۔

باجی نے لڑکپن سے ہی جماعتی کاموں میں حصہ لیا۔شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی سرگودھا شہر میں مختلف مرکزی اور علاقائی ذمہ داریوں کو نبھاتی رہیں۔پچھلے کئی سالوں سے سرگودھا سے لجنہ کو ربوہ مرکزی کھیلوں میں شرکت کے لئے لے کر جا رہی تھیں چونکہ خود بھی اتھلیٹ تھیں لہٰذا بچیوں میں بھی ان کا ورثہ خوب آیا۔ مجھے بچپن کی باتیں یاد ہیں کہ جن دنوں میں مسجد مبارک میں رمضان کے دنوں میں درس ہوا کرتا تھا سکول سے آ کر روزانہ درس سننے پیدل جایا کرتی تھیں ۔ ہر رمضان میں پورے روزے رکھتیں۔ رمضان بہت اہتمام سے منایا کرتیں۔ قرآن پاک کا دور ضرور ختم کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری بہن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین۔

باجی جماعت کی ہر تقریب بھرپور انداز میں منایا کرتی تھیں۔جس دن باجی کی وفات ہوئی ان کی طبیعت صبح سے ہی خراب تھی۔ایک ضرورت مند بچی کی شادی ہو رہی تھی۔اس کی مدد کرنے کے لئے کچھ رقم اور پارچات وغیرہ دینے کے لئے ایک دوسری عہدیدار کی معیت میں اس کے ہاں گئیں۔واپسی پر طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی۔کہیں رکنا مناسب نہ سمجھا۔گھر کے دروازے کے سامنے گر گئیں۔اپنی دہلیز پار کرنے کی توفیق نہ ملی اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئیں۔

مکرمہ نور زینب صاحبہ

مکرمہ نور زینب صاحبہ ہماری بڑی پھوپھی تھیں اور ابا جی سے چھوٹی تھیں۔ والدین نے گھر میں ہی لکھنا پڑھنا سکھایا اور قرآن پاک کا علم سکھایا۔ چھوٹی عمر میں مکرم محمد شفیع سے بیاہی گئیں اور میانہ پورہ چلی گئیں۔ تمام عمر خاوند کی بہت خدمت کی اور ان سے وفا کا سلوک کیا۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور احمدیت سے گہرا لگاؤ رکھنے والی تھیں۔ ہر سال تمام بچوں کو لے کر جلسہ سالانہ پر تشریف لاتیں۔ ان کی بیٹیاں جماعت کی دوسری تقریبات میں کثرت سے آتیں اور دینی جلسوں وغیرہ میں شرکت کرتیں۔ اپنی اولاد کی بہت اچھی تربیت کی۔ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دین سے لگاؤ رکھنے والی ہے۔ ان کے 5 بچے پیدا ہوئے جن میں سے چار حیات ہیں۔

محترم چوہدری نذیر احمد صاحب شہید

ہمارے چچا مکرم نذیر احمد دادا جان کی تیسری اولاد تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت مردانہ حُسن بخشا تھا۔ اُونچے کُلّے والی پگڑی باندھتے تھے۔ خوش پوش اور خوش اخلاق تھے۔ احمدیت کے لئے دل میں بہت غیرت رکھتے تھے۔ والدین نے اس زمانے میں دُور اُفتادہ گاؤں میں پڑھایا تھا۔ پھر دادا جان نے آپ کو وقف کر دیا اور حضرت سیدنا خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قادیان بھیج دیا۔ دادا جان نے آپ کو مبلّغ بنانے کے لئے بھجوایا تھا اور ان کی تمنا یہ تھی کہ آپ داعی الی اللہ بن کر تمام عمر راہِ حق کی طرف لوگوں کو بلائیں۔ آپ کی زبان میں لکنت تھی۔ حضور نے جب آپ کی یہ کمزوری دیکھی تو آپ کو دفتر تحریکِ جدید میں کام دے دیا۔ طبیعت میں لاپرواہی نہ تھی بلکہ فرض شناسی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جو کام بھی آپ کو دیا جاتا نہایت عُمدگی سے سرانجام دیتے۔

دادا جان نے اپنے بچوں کی اس رنگ میں تربیت کی تھی کہ بچپن سے ان کو صوم وصلوٰۃ کی

عادت پڑ گئی۔ آپ صبح سویرے اُٹھتے ،نماز وقرآن سے فارغ ہو کر سکول چلے جاتے۔ واپسی پر پڑھنے بیٹھ جاتے یا کبھی اپنے والد کا بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ آپ کی لکھائی بہت خوبصورت تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی جب انگریز افسر سکول کے معائنے کے لئے آتے تو چچا جان نذیر اور ہمارے چچاؤں کی تختیاں سامنے رکھی جاتیں۔ افسران آپ کی اعلیٰ خطاّطی کے نمونے دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کرتے اور سکول کے اساتذہ فخر اور خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ اس کے علاوہ آپ کے ہاتھ میں آرٹ بہت تھا۔ بہت خوبصورت پینٹنگز بناتے تھے۔ انہوں نے کہیں سے تربیت حاصل نہ کی تھی بلکہ یہ ان پر محض قدرت کا ایک بے انتہا انعام تھا۔ ان کی بنائی ہوئی تصاویر بھی انگریزوں کو دکھانے کے لئے سکول کی نمائش میں رکھی جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نیک خُو نوجوان کے ہاتھ میں بہت برکت رکھی ہوئی تھی۔ جو کام بھی کرتے اس میں غیر معمولی برکت پڑتی۔

افسوس عمر نے ساتھ نہ دیا اور تحریکِ جدید کا یہ پہلا شہید صرف زندگی کی 20 منزلیں طے کر پایا۔ والد کی بیماری کی ٹیلیگرام ملنے پر آپ نے گھر کی راہ لی۔ سائیکل پر ہی گھر کو چل دیئے۔ راستے میں شر پسند گھڑ سواروں نے گھوڑوں تلے روند ڈالا۔ صبح تین بجے آپ نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ عین اسی وقت آپ کے والد موضع بوبک متر میں مولائے حقیقی سے جا ملے اور ان دونوں نیک روحوں نے اپنا سفر فلک کی جانب اکٹھے شروع کر دیا۔

آپ کی شہادت کے بارے میں روزنامہ الفضل میں ایک کالم لکھا گیا جو مندرجہ ذیل ہے:

ایک مخلص نوجوان کی حسرت ناک وفات

''آہ چوہدری نذیر احمد صاحب''

چوہدری نذیر احمد ساکن بوبک متر ضلع سیالکوٹ نے ، جو چوہدری مہر الدّین صاحب احمدی کے فرزند ارجمند تھے، 9 نومبر 1930ء میں حضرت امیر المؤمنین کی تحریک وقفِ زندگی پر اپنے آپ کو پیش کیا اور چونکہ ان کی زبان میں قدرے لُکنت تھی اس لئے حضرت امیر المؤمنین کی

ہدایت کے بموجب انہیں دفتر تحریکِ جدید میں کام کرنے کی اطلاع دے دی گئی۔اس پر انہوں نے با قاعدہ دفتر میں کام کرنا شروع کر دیا اور آخر وقت تک مرحوم نے نہایت اخلاص اور جوش سے اس کام کو جوان کے سپرد کیا گیا تھا سرانجام دیا۔مرحوم نے اس عرصہ میں صرف بارہ دن کی رخصت لی۔اس سے ان کے کام کے شوق کا علم ہوسکتا ہے۔تبلیغی کاموں میں حصّہ لینے کا خاص شوق تھا۔ جب بوجہ بازو چوٹ لگنے کے چند دن کام کرنے کے قابل نہ تھے تو بھی دفتر میں با قاعدہ حاضر ہوتے رہے اور اس خیال سے کہ کام جمع نہ ہو جائے خود اپنی نگرانی میں دوسرے دوستوں سے کام کرواتے۔

6 ستمبر کو ساڑھے چار بجے بعد دوپہر ان کو ان کے بھائی نُور احمد کی طرف سے بذریعہ تار اطلاع موصول ہوئی کہ ان کے والد صاحب سخت بیمار ہیں اس پر انہوں نے گھر جانے کی اجازت لی۔ چونکہ گاڑی کے ذریعہ جانے میں زیادہ دیر لگنے کا خیال تھا۔اس واسطے 6 بجے شام کے قریب سائیکل پر سوار ہوئے۔بعد کے واقعات کے متعلق جو کچھ سُنا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب مرحوم وڈالہ کے قریب پہنچے تو سامنے سے چند آدمی بے تحاشا گھوڑیاں بھگاتے آرہے تھے۔ مرحوم نے کوشش کی کہ ایک طرف ہو کر ان کی زد سے بچ سکیں لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور گھوڑوں کے پاؤں تلے آکر کچلے گئے۔ان لوگوں نے ان کے کچلے جانے کی کوئی پرواہ نہ کی اور بھاگ گئے۔

اتفاقاًاسی وقت ایک احمدی فتح محمد صاحب ملازم سمال ٹاؤن کمیٹی قادیان اس راستہ سے جارہا تھا۔اس نے مرحوم کو زخمی دیکھا اور گاؤں والوں کو اطلاع دی۔گاؤں والوں نے اپنے چوکیدار کو تھانہ بٹالہ میں اطلاع کے لئے بھیجا اور سمال ٹاؤن کمیٹی کے ملازم نے مرحوم کو چونکہ قادیان میں دیکھا ہوا تھا اس لئے اس نے آکر اطلاع دی کہ اس حلیہ کا ایک جوان کچلا گیا ہے۔

یہ اطلاع 10 بجے شب کے قریب پہنچی۔اسی وقت پتہ لگانے کی کوشش کی گئی۔آخر قاری غلام مجتبیٰ صاحب پریذیڈنٹ لوکل جماعت قادیان کو معلوم ہوا کہ وہ چودھری نذیر احمد صاحب ہیں۔اسی وقت بھائی ڈاکٹر محمود احمد صاحب معہ چند دوستوں کے روانہ ہو گئے اور پولیس قادیان کے ایک دو

آدمیوں کو بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ چودہری نذیر احمد صاحب کو پولیس نے بٹالہ روانہ کر دیا ہے اور وہ راستہ میں جاتے ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن

اس پر یہ اصحاب واپس آ گئے۔ صبح کو چند اصحاب بٹالہ بھیجے گئے جو نعش بذریعہ لاری قادیان لے آئے۔ نعش رات کو ایک صندوق میں، جو اسی غرض سے بنوایا گیا تھا، برف کے ساتھ رکھ دی گئی۔ اگرچہ مرحوم کے عزیز و اقارب کو بذریعہ ایکسپریس جوابی تار جلد آنے کی اطلاع دی گئی۔ لیکن چونکہ ڈاکٹری مشورہ یہ تھا کہ باوجود کوشش کے نعش زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گی اس لئے حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانیؓ ایدہ اللہ تعالیٰ نے 8 ستمبر صبح 7 بجے نماز جنازہ پڑھائی۔ جس میں قادیان کے احباب کثرت سے شریک ہوئے اور پھر حضور کے ارشاد کے بموجب مرحوم کو بہشتی مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ حضور جنازہ کے ساتھ بہشتی مقبرہ میں تشریف لے گئے اور دفن کئے جانے تک وہیں ٹھہرے رہے۔ آخر حضور نے دعا فرمائی اور واپس تشریف لے آئے۔

اس حادثۂ جانکاہ کے موقعہ پر جن احباب نے مختلف انتظامات میں حصّہ لیا ہے ان کا شکریہ۔ خصوصاً شیخ احمد اللہ صاحب، سید اسلام صاحب، بھائی محمود احمد صاحب، صوفی عبدالرحیم صاحب، محمد اسماعیل صاحب، چودہری محمد حسین صاحب، احسان الٰہی صاحب، سید احمد صاحب، محمد اسحاق صاحب، عبدالمنان صاحب، راجہ محمد اسلم صاحب بی اے، اور مولوی امام الدین صاحب۔

مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ آج صبح اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مرحوم کے والد صاحب بھی انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

ان ہر دو حادثات پر ہم مرحومین کے خاندان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے دُعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ احباب مرحومین کا جنازہ پڑھیں اور اُن کے درجات کی بلندی کے لئے دُعا کریں۔ (انچارج تحریک جدید)

(روزنامہ الفضل قادیان مؤرخہ 10 ستمبر 1935ء)

اگلے دن کے اخبار میں ایک اور تکلیف دہ خبر شائع ہوئی جو درج ذیل ہے:

چودہری نذیر احمد صاحب مرحوم کے حادثہ کے متعلق چشم دید بیان

گذشتہ پرچہ میں ایک نوجوان چودہری نذیر احمد صاحب کی افسوس ناک وفات کا ذکر تحریک جدید کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔اس بارے میں معلوم ہوا ہے کہ مرحوم جب گھوڑوں کی جھپٹ میں آ کر گرِ گیا تو اس نے گھڑسواروں کو بُرا بھلا کہا۔اس پر تین چار گھڑسواروں نے اُتر کر اسے پیٹنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور وہ اسی حالت میں انکو چھوڑ کر بھاگ گئے۔یہ سب کچھ بعض لوگوں نے بچشمِ خود دیکھا اور بیان کیا۔پولیس اس حادثہ کی تفتیش کر رہی ہے۔

(بحوالہ روزنامہ الفضل قادیان دارالامان مؤرخہ 11 ستمبر 1935ء)

محترم چوہدری نذیر احمد صاحب نے وصیت نہیں کی تھی لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ازراہِ شفقت بہشتی مقبرہ قادیان میں دفنانے کا حکم فرمایا۔چنانچہ حادثہ کے اگلے دن مرحوم کو بہشتی مقبرہ میں قطعہ نمبر 1 حصہ 17 قبر 21 میں دفن کر دیا گیا۔آپ کے کتبہ قبر پر مندرجہ ذیل تحریر لکھی ہوئی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ وفات 35-09-07

چوہدری نذیر احمد ولد چوہدری مہر الدین صحابیؓ۔بوبک متر ضلع سیالکوٹ

تیری لحد پہ نُور کی بارش ہوا ے شہید

ملائک کریں سواگت جنت بھی ہو نصیب

نہایت مخلص واقفِ زندگی، جوشیلے داعی الی اللہ،تحریکِ جدید کے فرض شناس کارکُن تھے۔قادیان میں جامعہ میں زیرِ تعلیم تھے۔والد کی بیماری کی خبر سُن کر سائیکل پر گھر کو چل دیئے۔راستہ میں شر پسندوں کی زد میں آ کر شہادت کا رتبہ پایا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ جنازہ کے ساتھ گئے۔حضورؓ کے حکم سے بہشتی مقبرہ میں بلا وصیت دفن کئے گئے۔

مکرم محترم محمد احمد صاحب واقف زندگی

مکرم محمد احمد صاحب 1915ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے حسب روایت بوبک متر سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کا شوق تھا۔ آپ بھی ہونہار طالب علم تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے مزید پڑھنے کے لئے سیالکوٹ کا رخ کیا۔ وہیں ایف اے پاس کرلیا۔ ابھی تعلیم مکمل نہ کی تھی کہ والد کی وفات ہوگئی گویا کائنات ہی الٹ گئی۔ معاشی حالات کا بگڑ جانا ان کی بدنصیبی تھی۔ افسوس دنیاوی لحاظ سے ترقی نہ کر سکے۔

ان دنوں میں دوسری جنگ عظیم کے لئے بھرتی ہو رہی تھی۔ آپ نے بھی اپنا نام پیش کیا۔ صحت اچھی تھی۔ بلا کسی تردّد کے بھرتی کر لئے گئے اور محاذ پر بھیج دیئے گئے۔ کچھ عرصہ فوج میں رہنے کے بعد بیمار ہوگئے اور مصر کے ایک ہسپتال میں داخل کروا دئے گئے۔ بیماری نے طول پکڑا اور مزید فوجی خدمات ادا نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کو گھر بھیج دیا گیا۔ گھر آکر بھی بیماری کے باعث 10 برس تک کوئی نوکری وغیرہ نہ کر سکے اور نہایت صبر سے راضی بہ رضا رہے۔

آپ نے اپنی مرضی سے زندگی وقف کی اور تمام عمر استقامت دکھائی۔ پھر حضرت سیدنا محمودؓ نے آپ کو مجاہد دین بنا کر سنگاپور بھیج دیا۔ وہاں ایک لمبا عرصہ آپ کو بفضلِ خدا خدمت دین کی توفیق ملی۔ واپس آکر دفتر انجمن احمدیہ میں تا حیات کام کرتے رہے۔ آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھے۔

آپ کی بیٹی محترمہ ثمینہ اہلیہ محترم خالد مجید تحریر کرتی ہیں:

''آپ کی سب سے بڑی خوبی جھوٹ اور خوشامد سے نفرت تھی۔ کھری اور سیدھی بات کرتے تھے۔ چاہے لوگوں کی مخالفت مول لینی پڑے۔ صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، بہادر اور نڈر ہونا یہ صفات جو ہمارے دادا جی کی اولاد میں مشترک تھیں۔ اللہ تعالیٰ پر توکّل تھا۔ آخری دم تک دین کی خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کے ساتھ بہت محنت کی۔ ان

کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی۔ بچے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بہت قابل ہوئے۔

اکتوبر 1987ء کو دل کی تکلیف ہوئی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ چند دن بیمار رہ کر اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ نے لندن میں نماز جنازہ غائب پڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں آپ کا ذکر خیر کیا:

'مرحوم بہت بےنفس اور مخلص انسان تھے۔'

آپ کی طبیعت میں بہت قناعت تھی۔ جو ملا صبر سے گذارہ کیا اور کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ نظامِ خلافت پر تادمِ آخر جان چھڑکتے رہے۔ تمام اولاد صابر، قانع اور خلافت کی شیدائی ہے۔''

آپ کے ایک مخلص دوست محترم مرزا عبدالرشید دارالعلوم غربی بیان کرتے ہیں:

''محترم محمد احمد صاحب غریب پرور، بےنفس، واقفِ زندگی تھے۔ ٹی آئی کالج میں بطور کلرک کام کرتے تھے۔ بہت محنتی اور ایماندار انسان تھے۔ ان کی طبیعت میں چستی تھی، کام کو لٹکانا نہیں جانتے تھے۔ ہر کام وقت پر کرتے تھے۔ طالب علموں کے ساتھ شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ خواہ مخواہ لڑکوں کو روکنا ٹوکنا یا تنگ کرنا ان کی عادت نہ تھی۔

اس زمانے میں واقف زندگی کی تنخواہ نہایت قلیل ہوا کرتی تھی۔ ان کو جتنی تنخواہ ملتی تھی اسی میں صبر شکر سے نہایت احسن رنگ میں گزارہ کرتے تھے۔ چونکہ میرے ساتھ دوستانہ تھا، مجھے ان کے گھر کے حالات معلوم تھے۔ ہم دونوں کی مالی حالت کمزور تھی۔ ہمارے گھروں میں کبھی ماہ میں ایک مرتبہ گوشت پکتا تھا اور کبھی دو یا تین مرتبہ بھی کھانے کو مل جاتا تھا۔ ہم نے یہ وقت خوش وخرم گذارہ تھا۔ ان کے پاس لباس بھی واجبی سا ہوتا تھا۔ لنڈے بازار سے انہوں نے ایک لمبا سا کوٹ تقریباً بارہ آنے یا ایک روپیہ کا خریدا ہوا تھا۔ اس کوٹ کا نام ہم جاننے والوں نے

''ستّارالعیوب'' رکھا ہوا تھا۔

خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے وصیت کی سعادت پائی۔ مالی قربانی میں حسبِ توفیق حصہ لیا کرتے تھے۔ بہشتی مقبرہ ربوہ میں قطعہ نمبر 18 میں دفن ہیں۔

آپ کی شادی محترم لیفٹیننٹ ڈاکٹر محمد الدین صاحب کی بیٹی محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ کے ساتھ طے پائی۔ چچی فاطمہ کے والدین کے ہاں بہت فراخی تھی۔ دولت کی ریل پیل میں ناز و نعم سے پلیں۔ مگر آپ کی شادی کسی آسودہ حال سے نہ ہوئی۔ چچا جان محترم محمد احمد صاحب دوسری جنگ عظیم میں محاذ پر کئی برس رہے۔ واپس آئے تو جنگ کی سختیوں کی وجہ سے ایک لمبا عرصہ صاحب فراش رہے، پھر زندگی وقف کردی۔ اس زمانے میں واقف زندگی کو نہایت واجبی مشاہرہ ملتا تھا۔ چچی جان نے اپنے خاوند کے ساتھ خوب وفا کی اور کبھی شکوہ نہ کیا۔ نہات صفائی پسند اور باسلیقہ خاتون تھیں۔ بچوں کی بہت عمدہ طریق سے پرورش کی۔ بہت صابر، صوم وصلوٰۃ کی پابند اور خلافت کے ساتھ تعلق اور عقیدت رکھنے والی خاتون تھیں۔ حسبِ توفیق مالی قربانی میں حصہ لیتی رہیں۔ کچھ عرصہ صاحب فراش رہ کر وفات پائی۔ آپ تحریک جدید کی اوّلین مجاہدات میں شامل تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے موصیہ تھیں۔ بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔''

رشیدہ بیگم اہلیہ مکرم رامہ عبدالحق صاحب

آپ ہماری چھوٹی پھوپھی تھیں۔نہایت صابر خاتون تھیں۔جوان بھائی اور والد کی اکٹھی وفات نے ان کی طبیعت پر بھی بہت اثر ڈالا جس کی وجہ سے بہت حساّس ہوگئیں۔مگر ہم لوگوں نے کبھی ان کے منہ سے اس حادثہ کے متعلق کچھ نہ سُنا۔عادتاً خاموش رہتی تھیں۔باحیا اور شرمیلی طبیعت تھی۔کیسی بھی بات ہو جائے گرج برس کر غصہ نکالنے کی عادت نہ تھی۔تمام عمر بڑے بھائیوں اور بھاوجوں کا بہت احترام کیا۔والدہ کی خدمت کی بھی توفیق پائی۔

آپ بہت صفائی پسند، نہایت اعلیٰ درجہ کی باسلیقہ خاتون تھیں۔خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کیا کرتیں۔ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں۔سلائی کا بہت اچھا ہُنر تھا۔ایک مرتبہ مَیں پاکستان گئی۔ان کے گُھٹنوں میں بہت تکلیف تھی، اس کے باوجود مجھے محبت سے ملنے آئیں۔ان کے بیٹے محترم منیر الحق عین جوانی میں تین کمسن بچّے چھوڑ کر وفات پا گئے۔وفات سے پہلے کچھ عرصہ کینسر کی بیماری میں کاٹا۔اس تمام عرصہ میں اس بوڑھی ماں کا صبر قابل دید تھا۔

ان کی بیٹی محترمہ رفیعہ رامہ بیگم عبدالکریم صاحب شکاگو امریکہ بیان کرتی ہیں کہ:

''امی جان کو حکمت کی بہت سمجھ تھی۔ان کے ماموں بہت اچھے حکیم تھے۔ان کو بہت سے دیسی نسخوں سے واقفیت تھی اور یہ نسخے گھریلو ٹوٹکے کے طور پر خوب کامیاب رہتے۔معدہ کی تکلیفوں، اُلٹیوں وغیرہ کے لئے مجرّب قہوے تیار کرتی تھیں۔ان کے ہاتھ میں شفا تھی۔میرے بھائی حمید رامہ صاحب نے بہت سے پرندے اور جانور پالے ہوئے تھے۔ہمارا گھر چڑیا گھر بنا رہتا۔کبھی باز نے مرغی پر حملہ کر دیا اور کبھی بلی نے کبوتر پر حملہ کر دیا۔امی نے اس موقع کے لئے خاص اجزاء ڈال کر ہلدی تیار کی ہوئی تھی۔پرندوں اور جانوروں کی مرہم پٹی خود ہی کیا کرتیں۔گھر میں اکثر مہمانداری رہتی۔ابا جی کے ساتھ تصنیف کا کام کرنے والوں کی آمد صبح سویرے، ان کے شاگردوں کا جمگھٹا، عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہتا۔پھر تربیتی کلاس پر ہمارے ہاں بچیاں آکر

ٹھہرتیں۔امی مقدور بھر ان کی خدمت کرتیں۔عزیز واقارب کو بھی خوب نبھایا اباجی کو اپنی بہن کے بچوں سے بہت محبت تھی اس لئے امی کو بھی انکا خاص طور پر خیال رہتا۔‘‘

محترم عبدالحمید رامہ صاحب جرمنی بیان کرتے ہیں:

’’امی جان 1914ء میں حضرت میاں مہر دین صاحب رضی اللہ عنہ کے گھر پیدا ہوئیں۔مکمل دینی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ابتدائی دینی تعلیم اور قرآن شریف والدہ سے پڑھا۔پھر پرائمری تک گاؤں میں تعلیم حاصل کی۔کیونکہ قریب کوئی لڑکیوں کا سکول نہیں تھا اس لئے مزید تعلیم حاصل نہ کرسکیں۔لیکن چونکہ تعلیم کا شوق تھا اس لیے بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا اور ہر قسم کا لٹریچر جو دستیاب ہوتا آپ ضرور پڑھتیں۔اس لئے دینی اور دنیاوی علم کا معیار بہت بلند تھا۔جب کسی محفل میں بیٹھی گفتگو کر رہی ہوتیں تو کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ ایک کم تعلیم یافتہ اور دیہی ماحول سے تعلق رکھنے والی خاتون ہیں۔

1940ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ابا جان اس وقت دہلی میں اعلی سرکاری عہدہ پر فائز تھے۔دیہاتی ماحول سے نکل کر ملک کے اعلیٰ ترین ماحول میں اپنی دینی اقدار کو قائم رکھتے ہوئے اتنی جلدی ضم ہوگئیں کہ کوئی یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ آپ اس ماحول میں نئی ہیں۔

اباجان جماعت کے بہت فعال کارکن تھے۔ملازمت کے علاوہ باقی سارا وقت جماعتی خدمت میں صرف ہوتا،کبھی شکوہ نہ کیا بلکہ ہمیشہ ان کے ہر کام میں ان کی مددگار رہیں۔کبھی اپنی ذات کو اہمیت نہ دی بلکہ ہمیشہ کوشش کی کہ اباجان کو گھر کے مسائل سے آزاد رکھیں تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت جماعتی کاموں میں صرف کرسکیں۔شادی کے بندھن کو انتہائی وفا سے نبھایا۔اباجان کی ہر ضرورت کا خود خیال رکھا کرتی تھیں۔مجھے کبھی بھی یہ یاد نہیں کہ کوئی ایسا موقع آیا ہو کہ اباجان کو یہ کہنا پڑا ہو کہ میرا فلاں کام نہیں ہوا۔اباجان کی انتہائی عزت اور اطاعت کرتی تھیں کبھی اباجان سے بحث یا تکرار نہ کرتی تھیں چاہے معاملہ جتنا بھی مرضی کے خلاف ہو۔کبھی ان کے مونہہ سے اباجان کی کوئی شکایت نہ سنی۔میں جب اسلامی تعلیم میں بیوی کے فرائض کے متعلق پڑھتا ہوں تو بالکل یوں محسوس ہوتا ہے

کہ وہ اس تعلیم کی عملی تصویر تھیں۔اسی لئے ابا جان بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے ہمیشہ ان کی دلجوئی کا خیال رکھتے تھے اور ہمیشہ ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔یہ فقرہ تو اکثر میں نے ابا جان سے سنا ہے کہ ''رشیدہ نے میرے گھر کو جنت بنا دیا ہے''۔وہ ایک مثالی جوڑا تھا۔

جماعت سے وفا کا انتہائی گہرا تعلق تھا۔ہر معاملہ میں جماعت کو فوقیت دیتی تھیں خلفاء سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ ذرا سی بات بھی ان کے خلاف برداشت نہ کرتی تھیں چاہے کہنے والا کوئی بھی ہو۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خاندان مبارکہ کی عقیدت اور محبت گھٹی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ایک دفعہ سکول میں میری کسی معاملہ میں خاندان کے ایک صاحبزادہ صاحب سے تلخ کلامی ہو گئی۔گھر آ کر میں نے امی سے ذکر کیا تو انتہائی ناراض ہوئیں۔بار بار ایک ہی فقرہ دہراتی تھیں کہ کیا تمھیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ وہ کس ہستی کی اولاد ہیں۔

نماز سے عشق تھا۔ہمیشہ نماز وقت پر ادا کرتیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی میں نماز کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے اور نماز بہت اہتمام سے ٹھہر ٹھہر کر اور اس میں ڈوب کر پڑھتیں، یوں لگتا تھا کہ کسی اور جہان میں پہنچ گئی ہیں۔تہجد کی نماز کا عجیب منظر ہوتا تھا یوں لگتا تھا کہ خدا سامنے موجود ہے اور رو رو کر اس کو اپنا حال سنا رہی ہیں۔خدا سے دعائیں یوں کیا کرتی تھیں جیسے کوئی بہت ہی عزیز دوست ہے اور اسے سامنے بٹھا کر گلے شکوے ہو رہے ہیں۔چلتے پھرتے کام کاج کے دوران ذکرِ الٰہی اور دعائیں اونچی آواز میں جاری رہتیں۔دست بکار دل بایار کی چلتی پھرتی تصویر تھیں۔قرآن شریف کی تلاوت کا کبھی ناغہ نہ کرتی تھیں صبح نماز کے بعد لازمی قرآن کی تلاوت کرتیں۔بچپن میں قرآن کریم ناظرہ پڑھا تھا۔پھر جب ہم بچے کچھ بڑے ہو گئے اور ان کو کچھ فرصت مل گئی تو باقاعدہ ابا جان سے قرآن شریف باترجمہ سیکھا۔رمضان میں تو یہ حال ہوتا تھا کہ جہاں فرصت ملی قرآن لے کر بیٹھ گئیں اور تلاوت شروع کر دی۔مسجد مبارک میں رمضان کا درس ہوا کرتا تھا وہ ضرور سننے جاتیں اور جب تک صحت نے اجازت دی کبھی ناغہ نہ کیا۔

انتہائی صابر اور راضی برضا تھیں۔ ابا جان نے جب اپنی زندگی وقف کی تو ایک دم بہت اچھے معیار سے بہت نیچے آنا پڑا اور آمدنی بھی بہت کم ہوگئی۔ اولاد بھی ابھی چھوٹی تھی لیکن انتہائی وقار اور صبر سے وہ وقت گزارا۔ کبھی ناشکری کا فقرہ مونہہ سے نہ نکلا۔ اسی کم آمدنی میں ہم کو پالا۔ ہمیں تعلیم دلوائی کبھی اپنے لئے کچھ نہ بنایا سب کچھ ہمارے مستقبل پر لگاتی رہیں اور یہ ہی کوشش تھی کہ ہم پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائیں۔ آج اگر ہم کسی قابل ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد ان کی دعاؤں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔

بہت کم گھر سے باہر جاتی تھیں۔ عورتوں میں بیٹھ کر فضول گپ لگانے سے ہمیشہ اجتناب کرتی تھیں۔ فارغ وقت میں یا تو عبادت کرتی تھیں یا پھر مطالعہ۔ دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی کتب اور رسائل زیرِ مطالعہ رہتے۔ اخبار الفضل اور روزنامہ امروز کا روزانہ مطالعہ کرتی تھیں۔ بہت کم گو تھیں اور محفل میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی بالکل عادت نہ تھی۔ صرف ضرورت کے وقت بولتی تھیں لیکن جب بولتی تھیں تو بہت ناپ تول کر بولتی تھیں۔ خود مشورہ دینے کی عادت نہ تھی لیکن جب کوئی مشورہ مانگتا تو انتہائی خلوص سے مشورہ دیتیں لیکن اپنی رائے کو دوسرے پر مسلط نہ کرتی تھیں۔

مضبوط اعصاب کی مالک تھیں۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور دکھ میں اپنے آپ پر بہت جلد قابو پا لیتیں بلکہ دوسروں کو بھی حوصلہ دیتیں۔ کبھی بے صبری یا ناشکری کا جملہ ان کے مونہہ سے نہ نکلا۔ جوان بھائی سامنے فوت ہوا، جوان بیٹا فوت ہوا، پہلا پوتا جو بہت عزیز تھا حادثاتی طور پر فوت ہوا۔ ہر موقع پر خدا کی رضا میں راضی رہتے ہوئے ان عظیم دکھوں کو بہت حوصلے صبر اور وقار سے برداشت کیا۔

جب اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہوگئیں تو محلہ کے بچوں کو قرآن پڑھانے کا مشغلہ اختیار کیا اور پھر دم پسیں تک اس میں مصروف رہیں۔ آخر تک اپنے کام خود کیا کرتی تھیں کبھی کسی پر بوجھ نہ ڈالا۔ شاید اسی لئے جب آخری وقت آیا تو دو تین گھنٹے میں تیاری کی اور رخصت ہو گئیں۔ آپ کی وفات 16 اگست 1998ء میں 82 سال کی عمر میں ہوئی۔ آپ موصیہ تھیں اور بہشتی مقبرہ ربوہ قطعہ نمبر 26 لائن 14 قبر نمبر 5 میں مدفون ہیں۔ اللہ ان کو اپنی رحمت اور مغفرت کے سایہ میں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔

محترم میاں عبدالحق رامہ صاحب (سابق ناظر مال)

میاں عبدالحق رامہ صاحب، حضرت میاں مہرالدّین ؓ صحابی حضرت مسیح موعود کے داماد تھے اور حضرت مُنشی خدا بخش صحابی حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ ہماری چھوٹی پھوپھی مکرمہ رشیدہ بیگم کے شوہر تھے۔علم کے رسیا، وقت ضائع کئے بغیر گھنٹوں جماعت کی خاطر تصنیف کا کام کرتے تھے۔آپ کا گھر کُھلا مدرسہ تھا، جو چاہے آ کر علم حاصل کر لے۔ ہر موسم میں آپ کے ہاں کوئی نہ کوئی طالبِ علم فائدہ اٹھاتا نظر آتا۔ مجھے بھی آپ سے انگریزی نظم کا حصّہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔آپ کا طریقۂ تدریس بہت عمدہ تھا۔آپ کا خط اتنا عمدہ تھا کہ یوں گمان ہوتا تھا جیسے کسی کاتب نے لکھا ہو۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی نظر میں اتنی برکت دی ہوئی تھی کہ آخری عمر میں بھی چاند کی روشنی میں آسانی سے کتاب پڑھ لیتے تھے۔مطالعہ کئے بغیر سو نہ سکتے تھے۔

بہت غریب پرور انسان تھے۔خاکساری کی صفت نے کثیر تعداد میں دوست بنا دیئے تھے۔ سیرت کا ایک نمایاں پہلو یتامیٰ کی خبر گیری تھی۔کم گو انسان تھے۔اپنے کام سے کام رکھتے۔ فضول بیکار کاموں میں وقت ضائع نہ کرتے۔

محترم عبدالحق رامہ صاحب کے حالات زندگی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے شرفِ ملاقات کے ایمان افروز واقعات آپ کی کتاب ''درثمین فارسی کے محاسن۔بعنوان ''تعارف'' میں تفصیلاً چھپ چُکے ہیں۔اس میں سے تھوڑا سا حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

میاں عبدالحق رامہ صاحب (بحوالہ ''درثمین فارسی اور اس کے محاسن'')

میاں عبدالحق رامہ 1899ء میں اپنے آبائی گاؤں موضع بھاگورائیں تحصیل سلطان پور ریاست کپورتھلہ میں پیدا ہوئے۔کچھ خاندانی بزرگوں کی روایت کے مطابق آپ کے آباؤاجداد عرب حملہ آوروں کے ساتھ آٹھویں صدی عیسوی میں شام سے سندھ آئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے۔

اٹھارہویں صدی میں رامہ صاحب کے آبا ؤ اجداد نے سندھ سے پنجاب آ کر موضع بھاگورائیں آباد کیا۔ان کا پیشہ کاشتکاری تھا۔والدین نہایت مخلص ابتدائی احمدی تھے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبر لے کر پاس کیا اور سکالرشپ کے حقدار ٹھہرے۔پھر آپ نے کپورتھلہ کالج سے ایف اے اور بعد میں عربی اور فارسی میں منشی فاضل اور بی۔اے کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس کے محکمہ میں ملازمت اختیار کرلی۔دوران ملازمت مختلف شہروں میں تعینات ہوئے اور جہاں بھی رہے جماعت کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔1924ء میں جماعت احمدیہ پشاور کے سیکرٹری مال تھے اور 1940ء میں جالندھر کی جماعت کے صدر تھے۔پاکستان بننے سے پہلے آپ کی تقرری کراچی میں ہوگئی تھی چنانچہ آپ نے بطور سیکرٹری مال کام کیا۔آپ بفضلہٖ تعالیٰ تحریک جدید دفتر اوّل کے پانچ ہزاری مجاہدین میں شامل تھے۔

آپ کی خدمات کا ذکر مکرم شیخ رحمت اللہ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح فرمایا ہے:

''پاکستان کے قیام سے پہلے کراچی میں چندہ دینے والے احمدیوں کی تعداد 17 تھی۔تقسیمِ ہند کے فوراً بعد کراچی میں جماعت کا غیر معمولی اضافہ ہوا اور جماعت احمدیہ کے افراد کراچی کے طول وعرض میں آ کر آباد ہوئے۔انہی آنے والوں میں محترم عبدالحق رامہ صاحب بھی تھے جو دہلی سے تشریف لائے اور جماعت کے سیکرٹری مال مقرر ہوئے۔یہ ملٹری اکاؤنٹس کے آدمی تھے ساری عمر ہندوستانی فوج کے مالی معاملات کو کنٹرول کیا تھا اس لئے مالی معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا۔اس کے ساتھ مخلص، انتھک کام کرنے والے اور مالی سوچ میں گہری نظر کے حامل تھے۔انتظامی قابلیت بھی بہت تھی۔کراچی کو کئی حلقوں میں تقسیم کر کے ایسے رنگ میں محصل مقرر کئے تا چندہ دینے والوں کو سہولت رہے اور جماعت کے اموال بھی محفوظ رہیں۔اس سارے کام کی بنیادیں اس طرح استوار کیں کہ جلد جلد وسعت کی وجہ سے مالی معاملات میں خلل واقع نہ ہو۔بفضلہٖ تعالیٰ ان کی یہ سعی کامیاب رہی اور آج بھی کراچی جماعت کا مالی نظام معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے وضع کردہ خطوط پر چل رہا ہے۔

رامہ صاحب کی حُسن کارکردگی کا علم حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو بھی تھا اور ان کے کام پر بارہا اظہار خوشنودی فرما چکے تھے چنانچہ ایک موقعہ پر کراچی میں قیام کے دوران فرمایا کہ:

''رامہ صاحب جیسے کارکن کی مرکز میں زیادہ ضرورت ہے اس لئے ان کو ناظر بیت المال مقرر کرتا ہوں۔'' (الفضل 8 جنوری 1995ء)

دورانِ ملازمت محکمہ آپ کی ایک قابل، محنتی، اور دیانتدار افسر کی حیثیت سے بہت اچھی شہرت تھی اور اعلیٰ حکام کی نظروں میں بڑی عزت اور احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ دیانتداری کا یہ حال تھا کہ اس معاملے میں اپنے کیریئر کی بھی پرواہ نہ تھی۔ ایک بار آپ نے یہ واقعہ سنایا کہ دوسری جنگ عظیم کے شروع میں آپ کی تعیناتی شملہ میں ہوگئی تھی۔ آپ نے وہاں دفتر کا چارج سنبھالا تو معلوم ہوا کہ ٹھیکیداروں سے رشوت لینے کا سلسلہ اس خوبی اور مضبوطی سے قائم ہے کہ دفتر میں ہر کسی کو اس کی حیثیت کے مطابق حصہ تقسیم ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں رشوت لینے سے انکار کا مطلب باقی افسروں سے دشمنی لینے کے مترادف تھا اور ٹھیک طرح سے کام کرنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ آپ دہلی جا کر چوہدری محمد علی سے ملے جو بعد میں پاکستان کے وزیر اعظم بھی بنے اور فوری تبادلے کی درخواست دی۔ رامہ صاحب کے چوہدری صاحب کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے اور وہ اس محکمہ اکاؤنٹ میں اعلیٰ افسر تھے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی آپ کی تعیناتی کو چند دن ہوئے ہیں، قانون کے مطابق تبادلہ ممکن نہیں یہ صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب کسی افسر کا نااہلی کی وجہ سے تبادلہ کر دیا جائے۔ محترم عبدالحق رامہ صاحب نے اصرار کر کے جبری تبادلہ کروا لیا۔ اس طرح آپ کی ترقی کافی پیچھے جا پڑی مگر آپ نے کبھی اس پر ملال نہیں کیا۔ اس طرح ساری زندگی انہوں نے یہ خیال رکھا کہ کمائی میں ایک پیسہ بھی ناجائز شامل نہ ہو۔ آپ 1954ء میں ڈپٹی کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں زندگی وقف کرنے کی درخواست دے دی تھی اس کے بعد حکومت نے آپ کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کر دی لیکن چونکہ آپ کو نظارت بیت المال کا کام

سنبھالنے کا حکم مل چکا تھا اس لئے آپ ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے کر ربوہ حاضر ہو گئے اور زندگی کے آخری سانس تک بشاشت قلب سے جماعت کی خدمت میں مصروف رہے۔

1973ء تک محترم رامہ صاحب نے بطور ناظر بیت المال، ناظر زراعت اور اس کے علاوہ ممبر مسجد اقصیٰ کمیٹی، فضل عمر فاؤنڈیشن، نصرت جہاں اسکیم اور کئی دوسری ذمہ دار حیثیتوں میں جماعتی خدمات سرانجام دیں۔ اس کے بعد علمی کاموں کا سلسلہ آخری دم تک جاری رہا۔ نظارت بیت المال کا کام آپ نے بڑی محنت اور لگن سے جدید بنیادوں پر استوار کیا۔ خدا تعالیٰ نے غیر معمولی محنت کرنے کی توفیق عطا کی تھی۔ رات دیر تک جماعتی کاموں میں مصروف رہتے تھے اور صبح فجر کی اذان کے ساتھ اٹھ کر ادائیگی نماز اور بآوازِ بلند تلاوتِ قرآن کے بعد میز پر کام کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔ دفتر سے واپسی کے بعد کپڑے تبدیل کر کے پھر میز پر جا بیٹھتے۔ ارتکاز توجہ کا یہ عالم تھا کہ ارد گرد کچھ بھی ہو رہا ہو آپ کی توجہ ذرہ بھر اس طرف مبذول نہ ہوتی تھی۔ جب بھی نماز یا کھانے کے لئے یا کسی ملاقاتی کے لئے یا کسی اور کام کے لئے میز سے اٹھنا پڑتا تو بلاتردّد فوراً اٹھ بیٹھتے اور جونہی فارغ ہوتے، ایک منٹ ضائع کئے بغیر جہاں سے کام چھوڑا ہوتا وہیں سے دوبارہ شروع کر دیتے۔ چُھٹی والے دن بھی سارا دن کام میں مصروف رہتے۔ ایک دفعہ مَیں نے اُن سے دریافت کیا کہ اتنا کام کرنے سے کیا آپ کو کبھی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ جواب میں آپ نے لذّتِ کار کے فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جب انسان کو کسی کام کی لگن ہو تو اس کام میں اتنی لذّت پیدا ہو جاتی ہے کہ بجائے تھکاوٹ کے فرحت محسوس ہونی شروع ہوتی ہے۔

آپ کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا اور جماعت میں علمی ذوق رکھنے والے احباب، خصوصاً محمد احمد صاحب مظہر، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی صاحب اور بہت سے دوسرے احباب سے قریبی تعلق تھا۔ فارسی کے حوالے سے جماعت سے باہر بھی پہچانے جاتے تھے۔ خصوصاً کلاسیکل فارسی ادب پر آپ کی بہت گہری نظر تھی اور تمام فارسی صوفیانہ ادب کا آپ نے بڑی گہرائی سے مطالعہ

کیا تھا۔ بہت سے شاگردوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ درثمین فارسی کی طبع ثانی پر شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی صاحب کے ساتھ مل کر 1966ء تا 1968ء کے دوران بڑی لگن سے درثمین فارسی کی کتابت وغیرہ کی غلطیوں سے پاک کر کے دوبارہ شائع کیا۔

مکرم عبدالحق رامہ صاحب کو قرآن سے بہت محبت تھی۔ کوئی دس سال کی محنت شاقہ کے بعد آپ نے قرآن کریم کے تمام الفاظ کی معنوی اور گرائمر کے اعتبار سے ایک ضخیم فہرست تیار کی تھی۔ آپ کی عمومی صحت بہت اچھی تھی اور کم ہی بیمار پڑتے تھے۔ جوانی میں خوب ورزش کرنے کا شوق تھا۔ جسم اکہرا لیکن بہت کسرتی اور مضبوط تھا۔ اعلیٰ درجے کے پیراک بھی تھے۔ آخری عمر تک کئی میل روزانہ دریا تک تیز چل کر سیر کرنے جاتے تھے۔ طبیعت میں بلا کی خودداری، مکمل بے خوفی اور بے انتہا حوصلہ تھا۔ انتہائی مضبوط اعصاب، غیر معمولی قوت ارادی اور خود اعتمادی کے مالک تھے۔ کسی قسم کے حالات میں بھی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔

آپ کے چہرے پر ہر وقت ایک دلنواز مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ بڑی ہی دلکش انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ بہت سادگی پسند تھے اور کسی معاملے میں بھی دکھاوے اور بناوٹ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کسی بھی کام کے کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین اور بھروسہ تھا۔ اور زندگی وقف کرنے کے بعد اپنا معاملہ اس طرح ذات باری حق پر چھوڑ دیا تھا کہ نہ کسی تکلیف یا نقصان کی فکر تھی اور نہ ہی کسی صلے یا تعریف کی پرواہ تھی۔ کسی اصول یا حق کی بات سے پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ جھوٹ اور غلط بیانی سے سخت نفرت تھی اور اسے بزدلی اور ایمان کی کمزوری خیال کرتے تھے۔

زندگی کے آخری سانسوں تک خدائی کاموں میں مصروف رہے۔ انجمن سے ریٹائر ہونے کے بعد مولانا ابوالمنیر نورالحق کے زیرِ نگرانی الشرکتہ الاسلامیہ سے چھپنے والی جماعت کی کتب کی نظر ثانی آپ کے ذمّہ تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں چھپنے والے براہینِ احمدیہ کے نئے ایڈیشن پر آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کئی سال تک کام کیا۔ مئی 1981ء میں جب آخری بیماری کا

حملہ ہوا، اس دن صبح کو ایک جماعتی مسودّہ کی نظرثانی مکمل کر کے اور مولانا ابوالمنیر نورالحق کے گھر دے کر واپس آئے تھے۔لباس تبدیل کر کے میز پر کوئی اور کام شروع کرنے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ طبیعت خراب ہونے لگی پہلے تو اس ارادے سے اسی وقت اٹھ کر تیار ہونے لگے کہ ابھی سیر کر کے آتا ہوں اس سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر شاید اندازہ ہوا کہ معاملہ ان کی قوتِ ارادی سے آگے نکل چکا ہے اور آخری گھڑی آن پہنچی ہے چنانچہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔تلاوت کے دوران ہی فالج کا شدید حملہ ہوا اور خاموش ہو گئے۔اسی حالت میں مختصر بیماری کے بعد اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کر دی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآاِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے فضلوں سے آپ کی قربانیوں کو قبول فرمائے اور آپ کے درجات بلند فرمائے۔آمین۔ (بحوالہ۔درثمین فارسی کے محاسن۔بعنوان ''تعارف'')

مرحوم کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے روزنامہ الفضل ربوہ اپنی یکم جون 1981 کی اشاعت میں لکھتا ہے:

''انتہائی افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ سابق ناظر صاحب بیت المال محترم میاں عبدالحق رامہ صاحب 14 مئی 1981ء کو شام آٹھ بجے بعمر 82 سال ربوہ میں انتقال کر گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔اگلے روز 15 مئی کی صبح کو 10 بجے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر مولانا نذیر احمد مبشر صاحب نے نماز پڑھائی۔بعدازاں بہشتی مقبرہ میں تدفین عمل میں آئی۔

مرحوم 1955ء تا 1973ء بطور ناظر بیت المال، ناظر زراعت خدمات بجا لاتے رہے۔آپ نے علمی میدان میں بھی جماعت کی خدمت کی۔سلسلہ کی بہت سی کتب کی پروف ریڈنگ کی۔آپ فارسی زبان کے مسلم الثبوت استاد تھے اور اس سلسلہ میں جماعت کی گراں قدر خدمات بجالاتے رہے جامعہ احمدیہ کے طلباء آپ کے پاس اکتساب فیض کرنے آتے رہے۔''

جناب عبدالمنان مغنی صاحب ابنِ حضرت عبدالمغنی خان صاحب ناظر دعوت تبلیغ و وکیل تبشیر (جنہیں ایک مدت تک میاں عبدالحق رامہ صاحب کے ساتھ نظارت بیت المال میں کام کرنے کا موقعہ ملا) لکھتے ہیں:

''جب رامہ صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی محبت میں ڈوب کر درثمین فارسی کے فنّی محاسن کے بارے میں لکھنے کے لئے اپنا قلم اٹھایا تو یوں لگتا ہے جیسے روح القدس نے اس کی حرکت میں زور بھر دیا۔ آپ کو کلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت محبت تھی۔ دفتر میں صبح آتے ہی نائب ناظران اور خاکسار کو درثمین فارسی کا درس دیتے۔ اس کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ آپ درثمین کے ہر شعر کو قرآن کی تفسیر کے طور پر ثابت کر سکتے ہیں اور اس کی تائید میں اکثر اشعار کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔

آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نیاز کا شرف تو ضرور حاصل ہوا تھا مگر عمر کے لحاظ سے صحابی کہلانے کے زمرے میں نہیں آسکے۔ دنیاوی گوناگوں مصروفیات کو ختم کر کے آپ 1954ء میں ربوہ تشریف لے آئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو جماعت احمدیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور تا زندگی بھرپور انداز میں نبھایا۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کا ہر لمحہ خدمتِ دین کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ابتداء میں آپ کو نظارت بیت المال کی خدمت سونپی گئی جس کو آپ نے اپنی محنت شاقہ سے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائی، بعد ازاں انجمن میں ہی آپ کو اور شعبوں میں بھی خدمت کا موقعہ ملا۔

انجمن اور دفتر کے معمولی سے معمولی کام اور اس کی نوعیت کبھی بھی آپ کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی جماعت کے چندوں کی تفصیلات سے باخبر رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت عطا فرمائی تھی۔ ہر معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر صحیح اور مناسب حال فیصلہ فرماتے تھے۔ اپنے کارکنان سے بہت ہی شفقت اور نرمی کا سلوک روا رکھتے تھے۔ آپ اردو، فارسی، عربی اور انگلش کے عالم تھے اور ہندی اور گورمکھی میں بھی خاصا ادراک تھا۔ ان تمام

زبانوں کی شاعری خصوصاً صوفیانہ شاعری پر ان کی گہری نظر تھی۔ آپ عموماً پنجابی میں گفتگو کرتے تھے۔ آپ کی ہر بات قولِ سدید پر مبنی ہوتی تھی۔ ہر بات بہت ہی دلنشین پیرایہ میں ہوتی تھی۔ گفتگو میں بہت دھیما پن ہوتا تھا۔ اگر کبھی کسی کی سرزنش کا موقع بھی آیا تو خلوصِ دل اور نرمی سے سمجھایا۔ دنیوی مسائل کا ذکر تو کیا باریک سے باریک دینی مسائل پر بھی خوب عبور حاصل تھا۔

جماعت کے بجٹ اور چندوں کے احتساب کے وقت بھی عہدیداروں سے دلکش گفتگو فرماتے اور کسی کے سخت جملوں کا بھی بہت نرمی سے جواب دیتے۔ خوش طبع اور روشن ضمیر تھے۔ آپ کی فطرت کو الفت و محبت ودیعت کی تھی، مومنانہ فراست کے ساتھ آپ صاحبِ رؤیا اور کشوف بھی تھے لیکن اس کا اظہار قطعاً ناپسند فرماتے تھے۔

آپ طبعاً اعتدال پسند تھے، افراط وتفریط سے نفرت تھی اور نمود و نمائش کو کبھی پسند نہ فرماتے تھے۔ گوشہ نشینی کی طرف طبیعت راغب تھی۔ مزاج میں انتہا درجہ کی سادگی تھی۔ غرور و تکبر سے کوسوں دور تھے۔ حلیمی اور بردباری آپ کی طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔ ان کی زندگی کا آرام کام میں ہی تھا۔ گھر میں بھی حاجاتِ ضروریہ کے سِوا سب وقت کام میں ہی مصروف رہتے تھے۔ پیدل چلتے تو تیز چلا کرتے تھے۔ آپ کی شخصیت ایسی تھی کہ دیکھنے والے کے دل میں آپ کے لئے احترام کے جذبات ابھر پڑتے۔

آپ کا دروازہ ہر خاص و عام کے لئے کھلا رہتا اور بِلا امتیاز سب کو اسی خندہ پیشانی اور اخلاق سے ملتے اور حاجت مندوں کی حتی الوسع حاجت براری کرتے۔ علم دوست حضرات کا تانتا بندھا رہتا۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود درس و تدریس کا سلسلہ بھی تا دمِ مرگ جاری رہا۔ زندگی کے آخری ایام تک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کی پروف ریڈنگ کرتے رہے۔ جب تک حکمِ الٰہی نے آپ کی قوت حیات سلب نہ کر لی آپ خدمتِ دین اور خدمتِ خلق کے فریضہ کی ادائیگی سے باز نہ رہے۔

اس وقت رامہ صاحب کی اولاد میں سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی حیات ہیں۔''

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت کے خودنوشت واقعات

خاکسار کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بچپن میں متعدد دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زیارت کا موقع نصیب ہوا تھا۔ خاکسار کی پیدائش 1899ء کی ہے اور والد محترم منشی خدا بخش مرحوم خاکسار کی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے بیعت کر چکے تھے بلکہ ان کا بیان ہے کہ حضور کے دعویٰ سے پہلے بھی قادیان آیا جایا کرتے تھے۔ وہ موضع بیگووال ریاست کپورتھلہ میں پٹواری تھے اور اکثر جمعہ کے دن پیدل صبح چل کر نماز جمعہ قادیان میں ادا کرتے اور شام کو واپس اپنے حلقہ میں پہنچ جاتے۔ اور کبھی کبھی اس عاجز کو بھی کندھوں پر اٹھا کر یا پیدل چلاتے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت کے دو نظارے خاکسار کو اب بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ صبح کا وقت تھا۔ کافی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ خاکسار اور خاکسار کی والدہ اور ہمشیرہ سیڑھیاں چڑھ کر ایک برآمدے میں داخل ہوئے وہاں حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا دودھ بلو رہی تھیں۔ برآمدے میں ہمارے داخل ہوتے وقت آپ نے چاٹی سے ڈھکنا اٹھایا تو خاکسار نے دیکھا کہ چاٹی گلے تک دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ یہ امر خاکسار کے لئے تعجب کا موجب ہوا۔ کیونکہ خاکسار نے اپنے ہاں اور گاؤں کے دوسرے گھروں میں اتنی بھری ہوئی چاٹی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ہمیں دیکھ کر حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کھڑی ہو گئیں اور ہمیں سامنے دالان کے اندر حضور کی خدمت میں پیش کر کے واپس برآمدہ میں تشریف لے گئیں۔ حضور کمرے کے دائیں طرف ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پاؤں مبارک نیچے لٹک رہے تھے اور اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ ہم تینوں نے چاندی کا ایک ایک روپیہ حضور کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور خاکسار کی والدہ سے کچھ باتیں فرماتے رہے لیکن خاکسار کو ان باتوں میں کچھ بھی یاد نہیں۔ اور نہ یہ یاد ہے کہ وہاں

سے کب اور کیسے واپس ہوئے۔

دوسری مرتبہ بھی صبح کا وقت تھا۔سورج ابھی نکلا ہی تھا۔خاکسار کو یہ یاد نہیں کہ کس طرح اور کدھر سے مذکورہ برآمدہ میں داخل ہوئے۔صرف اتنا یاد ہے کہ برآمدہ کے دالان والے باہر کے کونے سے ایک دوسیڑھیاں چڑھ کر ایک اور برآمدہ میں داخل ہوئے۔جس کے بائیں طرف ایک کوٹھری میں حضور علیہ السلام تشریف فرما تھے۔اس کوٹھری کا دروازہ برآمدہ میں تھا اور دائیں طرف کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔شائد دروازے کے بالمقابل بھی ایک کھڑکی تھی۔لیکن اب ٹھیک طرح یاد نہیں۔کوٹھری میں صرف ایک دہکتی انگیٹھی تھی اور ایک چارپائی جس پر کوئی کپڑا اچھا ہوا نہیں تھا۔حضور چارپائی پر سرہانے کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔اور رُخِ مبارک پائنتی کی طرف تھا۔جو دروازہ کی طرف تھی۔حضور نے ایک کشمیری لوئی جس کا رنگ اونٹ کے بالوں کی طرح تھا۔اور کنارہ سبز تھا۔اپنے اوپر لپیٹی ہوئی تھی۔پاؤں مبارک اسی میں چھپے ہوئے تھے۔حضور خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔اس دفعہ بھی ہم تینوں ہی تھے اور چاندی کا ایک ایک روپیہ نذرانہ پیش کیا۔خاکسار کی والدہ سے حضور نے کچھ باتیں کیں۔لیکن خاکسار کو ان باتوں میں سے کچھ یاد نہیں اور نہ یہ یاد ہے کہ وہاں سے کب اور کس طرح واپس آئے۔البتہ حضور کی شبیہ مبارک دماغ میں نقش ہے۔

دو واقعات جو خاکسار کو تو یاد نہیں، والد صاحب مرحوم بیان فرمایا کرتے تھے:

''ایک دفعہ مسجد اقصیٰ میں کچھ احباب جمع تھے اور حضرت اقدس کا انتظار تھا۔یہ عاجز لوٹوں اور ٹونٹیوں سے کھیل رہا تھا کہ حضرت مفتی محمد صادق صاحب مرحوم نے جھڑکا۔اس عاجز نے رونا شروع کر دیا اور والد صاحب کے ہر چند کوشش کرنے پر چپ نہ ہوتا تھا۔آخر اس شرط پر چپ ہوا کہ جب حضور تشریف لائیں گے تو پھر رونا شروع کر دوں گا۔انہوں نے سمجھا یہ بچہ ہے اسے کہاں یاد رہے گا۔لیکن جب حضور تشریف لائے تو پھر رونا شروع کر دیا۔اس پر حضور علیہ السلام نے بچوں سے نرم سلوک کرنے کے متعلق کچھ عرصہ تقریر فرمائی۔''

دوسرا واقعہ جو والد صاحب مرحوم بیان فرمایا کرتے تھے یہ ہے کہ والد مرحوم حضرت محمد خان صاحب مرحوم کی عیادت کے لئے جایا کرتے تھے۔وہ ان دنوں قادیان میں زیرِ علاج تھے۔ایک دن ان کی قیام گاہ پر گئے تو یہ عاجز بھی ساتھ تھا۔اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی خان صاحب کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔آپ کے ساتھ بہت سے احباب تھے۔جن کی وجہ سے خاکسار کو بہت پیچھے ہٹنا پڑا اور رونا شروع کر دیا۔حضور نے دریافت فرمایا کہ بچہ کون ہے اور کیوں روتا ہے۔اس عاجز نے روتے روتے کہا کہ مجھے امام مہدی کے پاس نہیں آنے دیتے۔جس پر خاکسار کو حضور کے پاس جانے کے لئے راستہ دے دیا گیا۔حضور نے اس خاکِ پا کو گود میں اٹھالیا اور بہت شفقت فرمائی۔اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی عَبدِہِ الْمَسِیحِ الْمَوعُود وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ۔

31-01-1977 خاکسار عبدالحق رامہ

(بحوالہ درِثمین فارسی کے محاسن)

محترم عبدالحمید رامہ صاحب ابن محترم رامہ صاحب بیان کرتے ہیں:

ابا جان اپنے کام میں انتہائی محنتی اور ایماندار تھے اور خدا کا فضل شاملِ حال تھا اس لئے بہت جلد ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اونچے عہدوں پر پہنچ گئے۔آپ کی پوری زندگی میں اگر کسی کام کی اہمیت تھی تو وہ خدمتِ سلسلہ تھی اور ہر وقت ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہتے اور اس کے سامنے دنیاوی منفعت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے پہلی دفعہ وقف کی تحریک جماعت کے سامنے رکھی تو اس وقت آپ ملٹری اکاؤنٹس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔آپ نے اسی وقت حضور کی خدمت میں وقف کی درخواست لکھ دی۔حضور کی طرف سے جواب آیا کہ آپ خود کو وقف ہی سمجھیں اور اپنے عہدے پر کام کرتے رہیں انشاءاللہ خدا تعالیٰ آپ کو وہیں جماعت کی خدمات کا بہترین موقع دے گا اور پھر آپ کی ملازمت کا دور اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خلیفۂ وقت کے مونہہ سے نکلی ہوئی بات کو خدا نے کیسے پورا کیا۔

ملازمت کے دوران مختلف شہروں میں آپ کی تعیناتی ہوتی رہی اور ہر جگہ آپ جماعت کے عہدوں پر فائز رہ کر خدمات انجام دیتے رہے اور کیونکہ آپکو خدا نے بہترین انتظامی صلاحیتیں دی تھیں اس لئے ہر جگہ قیام کے دوران بہترین خدمات کی توفیق ملی۔ اپنی ملازمت کے دوران آپ کو دہلی، شملہ، جالندھر، جبلپور، راولپنڈی، پشاور اور کراچی وغیرہ میں جماعتی خدمات کی توفیق ملی۔

مکرمہ رفیعہ صاحبہ اہلیہ مکرم عبدالکریم صاحب صدر شکاگو بیان کرتی ہیں:

''آپ نے ہمیشہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے شعبہ مال کو اپنی محنت سے غیر معمولی ترقی دی جس جماعت کا بھی آپ کام سنبھالتے اللہ کے فضل سے وہاں %100 ادائیگی ہو جاتی۔

اس وقت جماعت کی مالی حیثیت بہت کمزور تھی۔ تمام کارکنوں کی تنخواہیں بہت قلیل تھیں۔ آپ نے حساب لگا کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں کارکنوں کی تنخواہیں بڑھانے کی درخواست کی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے اس کی اجازت نہ دی مگر آپ اصرار کرتے گئے۔

اسی سلسلہ میں ایک بہت پُرلطف بات حضرت مریم صدیقہؓ صاحبہ حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے امی کو سُنائی۔ آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ رامہ صاحب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے بہت بحث کر رہے تھے۔ حضور ان کی کسی بات پر ناراض ہو گئے اور فرمایا: میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ رامہ صاحب باہر جا کر کھڑے ہو گئے اور آواز دے کر کہا کہ حضور میں دور ہو گیا ہوں، اب آپ میری بات مان لیں۔ حضور ہنس دیئے اور فرمایا کہ اچھا مجھے حساب لگا کر بتاؤ۔ اباجی حضور کی طبیعت کو خوب سمجھتے تھے اور اس بات پر بھی یقین تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے ان الفاظ پر پورا اُترتے تھے کہ وہ دل کا حلیم ہوگا۔ پھر اباجی نے جماعت کی کل آمدنی کا حساب لگا کر گوشوارہ بنا کر جب حضور کے سامنے رکھا تو حضور نے کارکنان کی تنخواہیں بڑھا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ غریب کارکنوں کی بیویاں مجھے پیار کرتیں اور دعائیں دیتیں کہ تمہارے باپ نے ہمارا خرچہ بڑھا دیا۔

آپ کو مختلف زبانوں اردو، انگلش، عربی، گُورمُکھی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ جامعہ سے

فراغت پانے والے طلباء کو آپ کے پاس عربی اور فارسی کی مزید تعلیم کے لئے بھیجا جاتا۔ یادداشت ایسی کہ آپ سے کسی وقت قرآن پاک کا کوئی بھی حوالہ پوچھ لو، صفحہ نمبر اور حوالہ نمبر بھی بتا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کے حوالے اس کثرت کے ساتھ یاد تھے کہ عقل حیران رہ جاتی فرصت میں بلند آواز سے تلاوت کرتے تھے۔ عبادت سے محبت تھی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حد درجہ کی محبت تھی۔ امی کو ترجمہ اور تفسیر خود پڑھائی۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ امی نے کبھی سکول کا منہ نہ دیکھا تھا۔

ایک بڑی صفت آپ میں یہ تھی کہ آپ صادق القول تھے اور اپنے بچوں سے بھی سچائی کی امید رکھتے تھے اور اگر ہم بچے کھیل میں بھی جھوٹ بول کر ایک دوسرے کی غلط شکایت کر دیتے تو منہ سے مارے دکھ کے کچھ نہ بولتے۔ ہم بچوں کے لئے اتنی سزا کافی ہوتی آپ کے کسی حرکت یا عمل میں دھوکہ نظر نہ آتا تھا۔ جھوٹ سے آپ کو شدید نفرت تھی۔

تیمارداری میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا، گھر میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اتنی توجہ سے تیمارداری کرتے اور اتنا خیال رکھتے کہ گھر والے عاجز آ جاتے۔ آپ کی آنکھیں تکلیف سے سُرخ ہو جاتیں۔ غریبوں سے محبت رکھتے اور ان کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانے میں خوشی محسوس کرتے۔ گھر میں ماشکی، مالی یا دھوبی اگر کھانے کے وقت پر آ جاتے تو اباجی ان کو اپنی میز پر بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ بچپن میں آپ پر اور آپ کی بہن پر سختیاں کی گئیں۔ ان کو بہت زیادہ جسمانی اذیتیں دی گئیں اپنی بہن کی تکلیف دیکھ کر آپ بہت رویا کرتے مگر بعد میں جب شعور آیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مال و قوت عطا کی تو آپ ان رشتہ داروں کے لئے نہایت رحم دل اور نرم خُو وجود بن گئے اور کبھی ان کو اُف تک نہ کہا نہ جتلایا۔ ایک بات جو قابلِ ذکر ہے اباجی کہا کرتے تھے کہ بچپن میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے محبت سے اپنے احباب کی محفل میں مجھے گود میں اُٹھا کر دلاسا دیا تھا اور شفقت فرمائی تھی۔ یہ اس توجہ اور محبت کا اثر ہے کہ مَیں نے اپنی زندگی میں ہر مصیبت کا بہادری سے مقابلہ کرنے کی توفیق پائی۔ ایک نبی نے مجھے گود میں اٹھا کر تسلی دی تھی اس کی وجہ سے تمام عمر مجھ پر اتنا فضل ہوا اور ہر قسم کے ابتلاء سے مَیں اللہ تعالیٰ کے کرم سے عزت سے نکال لیا گیا۔

محترم نور احمد صاحب صوبیدار

ہمارے چچا محترم نور احمد صوبیدار دادی جان کی پانچویں اولاد تھے۔ بہت خوش شکل اور رعب والی شخصیت تھی۔ آپ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس حادثہ کا اتنا اثر ہوا کہ میٹرک بھی نہ کر سکے اور نویں جماعت میں سکول چھوڑ دیا۔

جوانی میں جنگ عظیم دوم کے وقت فوج میں بھرتی ہو گئے۔ محترم نور احمد صاحب self made انسان تھے۔ فوج میں جانے کے بعد ترقی جاری رکھی پھر اس کے بعد Indian Electrical And Mechanical Engineering کا کورس کیا۔ آپ نہایت ذہین انسان تھے اور اپنے پیشے میں ماہر تھے۔ مختلف چیزیں بنانا اور ایجادیں کرنا ان کا کام تھا۔ آپ تکنیکی صلاحتیوں کے مالک تھے۔ اپنے کام میں کمال حاصل تھا۔ نیز آپ کو فوٹو گرافی کا بہت شوق تھا اور اس پیشے میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے اور بھی کئی شوق پال رکھے تھے۔ دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شکاری کتے پالے ہوئے تھے۔ ڈھیروں پرندے شکار کر کے لاتے۔ وسائل کافی نہ ہونے کے باوجود انداز شاہانہ تھے۔

آپ کو کئی برس اپنی بوڑھی والدہ کی خدمت کی خوب توفیق ملی۔ ہماری دادی جان کی آخری عمر میں معذوری کی سی حالت تھی۔ ان کو سنبھالنا آسان کام نہ تھا مگر چچا نور صاحب نے یہ کام نہایت صبر اور خوشی سے انجام دیا۔ آپ نے اور آپ کی اہلیہ نے مل کر والدہ صاحبہ کی بہت خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

آپ کی شادی ماموں زاد محترمہ رشیدہ بیگم سے ہوئی۔ وہ نہایت وفا کرنے والی بیوی ثابت ہوئیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان پر اچانک دل کا حملہ ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ عین جوانی کے عالم میں چھ کمسن بچے چھوڑ کر مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہو گئیں اور چچا جان پر بہت بڑا امتحان آ پڑا۔

اس سانحہ کے بعد چچا جان دوسری شادی کے لئے مجبور ہو گئے چنانچہ انہوں نے خالہ زاد محترمہ ثریا بیگم سے شادی کی۔ابھی چار برس کا قلیل عرصہ گذرا تھا کہ یہ گھر پھر اُجڑ گیا اور چچا جان کی اچانک دل کے حملہ سے وفات ہوگئی۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

ان کی وفات ہمارے خاندان کے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔وفات سے کچھ عرصہ قبل آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی چند دعائیں اور مختلف ارشادات فریم کروا کر دیواروں پر آویزاں کر دیئے اور کثرت سے ان کو پڑھتے اور خدا تعالیٰ کو یاد کرتے تھے۔توبہ کی طرف طبیعت شدت سے مائل ہوئی۔آپ نے وصیت کی ہوئی تھی چنانچہ جنازہ راولپنڈی سے ربوہ لایا گیا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی رحمت کی چادر میں ڈھانپتے ہوئے بہشتی مقبرہ ربوہ قطعہ نمبر 3 میں جگہ عطا کی۔

آپ کی دوسری بیوی کا نام ثریا بیگم تھا۔بہت نیک طبع صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں اور باقاعدگی سے چندہ ادا کرنے والی خاتون تھیں۔اقرباء پروری کی صفت بہت نمایاں تھی۔اللہ تعالیٰ نے دو بچے دیئے۔سوتیلے بچوں کے ساتھ آپ نے بہت عمدہ سلوک کیا اور سچ تو یہ ہے کہ تمام اولاد نے بھی ان کی عزت وتکریم کی اوران سے محبت واپنائیت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔جب کبھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا یا ٹیلیفون پر بات ہوئی تو اس قدر اپنائیت کا اظہار کرتیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔وفات سے کچھ دیر قبل جگر کی تکلیف ہوئی جس کی ان کو سمجھ نہ آ سکی۔آخری چند دن فضلِ عمر ہسپتال ربوہ میں گذارے پھر وفات سے قبل بے ہوشی طاری ہوگئی اور اسی حالت میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ آپ موصیہ تھیں۔بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہیں۔

چچا نور کی 6 بیٹیاں اور 2 بیٹے ہیں۔بڑی بیٹی کی وفات ہوگئی ہے۔جس کا نام صبیحہ تھا۔بہت سمجھدار، معاملہ فہم، غصّے کو پی جانے والی، اور صبر کا بہت مادہ رکھنے والی تھیں۔سب بہن بھائیوں کو پالنے میں بہت کردار ادا کیا۔حالات انسان کو عقلمند اور باشعور بنا دیتے ہیں۔ان کو چھوٹی عمر میں ہی عقل وحکمت مل گئی۔سلیقہ و ہنر، دستکاری، اقرباء پروری، معاملہ فہمی، حُسنِ تدبر ان کے خواص میں

سے تھا۔ان کی سب سے بڑی صفت مہمان نوازی تھی۔ان کے گھر پر آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ہونٹوں پر مُسکراہٹ لئے ہر ایک کی خدمت میں مصروف رہتیں۔عزیز و اقارب میں جس کو بھی ضرورت پیش آتی خدمت سے انکار نہ کرتیں۔غرباء کی مالی مدد بڑھ چڑھ کر کرتیں۔کھانا کھانے کے بعد اچانک سانس اُکھڑ گئے اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کو اپنی رحمتوں کی چادر میں لپیٹ لے۔قبرستان عام ربوہ میں دفن ہیں۔

مکرم ظہور احمد صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ

مکرم ظہور احمد صاحب حضرت میاں مہر الدین ؓ صاحب صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔آپ نے مقامی مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔آپ بہت محنتی اور ذہین انسان تھے۔آپ نے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کی ڈگری لی مگر طبیعت میں بہت دیانتداری تھی۔کبھی ایک پیسہ رشوت نہ لی اور نہایت عاجزی اور انکساری سے زندگی بسر کی۔طبیعت میں بہت عاجزی تھی۔جائیداد بنانے یا مادیت پرستی کی طرف بالکل رجحان نہ تھا۔اسلامی تعلیم کا کتابچہ ان کے بریف کیس میں پڑا رہتا۔اکثر اس کا مطالعہ کرتے اور حضرت مسیح موعودؑ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کرتے۔مختلف جگہوں پر ان کی رہائش رہی اپنے نام کے آگے احمدی کا لفظ لکھا کرتے اور کبھی اپنے عقیدہ کے بارہ میں نہ ڈرتے۔خلوص دل سے محبت کرنے والے انسان تھے۔

جب مَیں نے اپنے خاندانی حالات لکھنے کا ارادہ کیا تو ان کو کئی سوالوں پر مشتمل ایک خط لکھا کیونکہ میرے دادا جان کی اولاد میں سے صرف یہی ایک بزرگ بقید حیات تھے۔ان کی طرف سے جو مجھے جواب موصول ہوا وہ مندرجہ ذیل ہے:

15-2-02 بسم اللہ الرحمن الرحیم

عـــزیزہ شاہدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

تمہارا 27-12-2001 کا تحریر کردہ خط 20-1-2002 کو ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ تم سب بہن بھائیوں میں سے پہلی دفعہ کسی نے خط لکھا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا کرے۔ میَں اپنے سب بہن بھائیوں میں سے اب آخری فرد دُنیا میں ہوں۔ ہماری نسل والد مرحوم سے ہی شروع ہوئی۔ مَیں یہی سمجھتا ہوں کیونکہ جماعت میں یہ ہی داخل ہوئے۔ ان کے دو بھائی بھی ساتھ ہی جماعت میں شامل ہوئے جو ان سے چھوٹے تھے لیکن ایک تو مخالفت برداشت نہ کر سکے اور پھر ویسے ہی ہو گئے۔ دوسرے جو سب سے چھوٹے بھائی تھے وہ لاولد فوت ہو گئے۔ میرے والد مرحوم کا نام میاں مہر دین تھا۔ ان سے چھوٹے نواب دین اور سب سے چھوٹے کا نام محمد دین تھا۔ میری دادی جان کا نام بی بی رانی تھا اور وہ محلہ اراضی یعقوب کی رہنے والی تھیں جہاں کی تمہاری امی مرحومہ تھیں۔ تمہاری امی مرحومہ کے گھر کے شمال میں جو گلی ہے وہاں ان کا میکہ تھا۔ ہماری ایک ہی پھوپھی تھیں۔ ہماری والدہ مرحومہ جن کا نام غلام فاطمہ تھا ان کے والد یعنی نانا جان مرحوم کا نام حاکم دین تھا۔ ان کو بچپن میں ان کی کسی بھابھی وغیرہ نے طعنہ دیا کہ یونہی کوئی کام نہ کاج آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ بہت حسّاس طبیعت تھی۔ یہ طعنہ سُن کر گھر چھوڑ دیا اور گھر بدری کے بعد پتہ نہیں کیسے تعلیم حاصل کی اور کوئٹہ صوبہ بلوچستان میں امیر مُنشی ہو گئے۔ مُنشی اس زمانے میں بہت تعلیم یافتہ افراد کو کہتے تھے۔ یہ کوئٹہ میں انگریز افسروں کو اردو پڑھاتے تھے۔ کسی افسر کے ذریعہ ٹھیکیداری کرنے لگے۔ سکھر صوبہ سندھ میں دریائے سندھ پر جو لینڈ ڈاون پُل ہے اُس کے ایک حصّہ کا ٹھیکہ ان کے پاس تھا۔ جب وہ کافی خوشحال ہو گئے تو سیالکوٹ سے مشرق کی طرف ایک گاؤں بسایا جس کا نام درگاہ والی رکھا اور وہیں رہنے لگے۔ آپ 1923 میں فوت ہوئے۔ اس زمانے میں جب انہوں نے یہ گاؤں بسایا صرف بڑے

شہروں اور ضلعی ہیڈ کوارٹرز میں سکول یا کالج ہوتے تھے۔اس گاؤں کی ساری زمین انہوں نے خرید لی تھی۔ان کی دو بیویاں تھیں۔بچّوں کے لئے استاد رکھے۔والدہ مرحومہ فارسی، اردو اور قرآن کریم کا ترجمہ جانتی تھیں۔میرے والد مرحوم کی بھی دو بیویاں تھیں۔پہلی نے والد مرحوم سے مذہب کے معاملے میں اختلاف کیا اس لئے اپنے میکے چلی گئی اور بعد میں ان کی علیحدگی ہو گئی۔پہلی بیوی کی ایک ہی لڑکی تھی جو وہ ساتھ ہی لے گئی اور وہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں فوت ہو گئی۔والد مرحوم 1876ء میں پیدا ہوئے اور 7 ستمبر 1935ء میں تقریباً 58-59 سال کی عمر میں فوت ہوئے۔1902ء میں جماعت میں داخل ہوئے یعنی تقریباً 25 یا 26 سال کی عمر میں۔

ہمارا گاؤں بُوبک متر سے کشمیر کی سرحد صرف 5 میل دور ہے۔رات کو جمّوں (جو کشمیر میں ہے) کی بجلی کی روشنیاں نظر آتی ہیں۔صُبح کے وقت پہاڑ کا نظّارہ بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ سُورج پہاڑ میں سے اُبھرتا ہوا نظر آتا ہے تو اس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔مَیں نے تعلیم پرائمری تک اپنے گاؤں کے نزدیک ایک دوسرے گاؤں میں حاصل کی جو ایک مِیل سے ذرا کم تھا۔وہ سکول میرے سکول میں داخل ہونے سے تین چار سال پہلے ہی بنا۔

پرائمری سکول تھا۔ساتھ ہی مسجد اور کُنواں تھا۔سکول میں پگڑی پہن کر جانا ہوتا تھا۔سکول میں ٹاٹ تک نہیں تھے۔ننگی زمین پر بیٹھتے تھے۔دو سکول ماسٹر تھے۔سینئر اُستاد بہت نیک آدمی تھے۔ ہم تختی پر لکھتے تھے۔کِلک کا قلم چاقو سے تراشا جاتا تھا۔ماسٹر صاحب، جن کا نام اصغر علی شاہ تھا، نے سب سے پہلے چاقو سے قلم کیسے بنایا جاتا ہے سکھایا۔سب سے پہلے پہلی جماعت کے لڑکوں کو پنسل سے تختی پر ا۔ب۔ج۔د۔ر۔س۔ص۔ع۔ف۔ق۔ل۔م۔ن۔و۔ہ۔ء۔ی۔ے الفاظ لکھ کر دیتے۔ان کے اُوپر ہم سیاہی سے لکھتے۔ایک دن مَیں نے چادر اوڑھ کر بالکل اپنے آپ کو اس میں چُھپا لیا اور لکھنے لگا۔اکیلا بیٹھا ہوا تھا کہ ایک دم محسوس ہوا۔جیسے الہام ہوتا ہے ’’مجھے لکھنا آ گیا ہے ‘‘اس کے بعد کلاس میں سب سے اچھا خط میرا تھا۔پرائمری کے بعد ظفروال ہائی سکول میں داخل ہوا۔وہاں سے کاپی پر لکھنا شروع کیا۔یہ سکول گورنمنٹ ہائی سکول تھا۔ہم پیدل سکول جاتے تھے۔

بڑا پُرامن زمانہ تھا۔کوئی ڈر نہیں لگتا تھا سانپ بھی راستے میں ملتے تھے۔دن میں چُھپے رہتے تھے گھر اور باہر حویلی میں بھی تھے۔ایک دفعہ مجھے یاد ہے ظفروال سے چُھٹی ہونے کے بعد مَیں گھر آ رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔مَیں نے تختی سَر پر رکھی ہوئی تھی اور کوئی ڈر نہیں تھا۔ گورنمنٹ ہائی سکول ظفروال میں بھی پانچویں جماعت میں انگلش خوش خط لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ یہاں بھی انگریزی سب سے خوش خط لکھنے والا مَیں ہی تھا۔سیالکوٹ مراکی دال جو ماڈل گاؤں بنایا گیا تھا، اس کا افتتاح کرنے کے لئے وائسرائے لارڈ لِن لِتھ گو(Lin linthgo) آیا تو وہاں نمائش میں میری انگلش خوش خطی کا نمونہ رکھا گیا اور برادرم نُور احمد مرحوم ڈرائنگ بہت عمدہ کرتے تھے اُن کی ڈرائنگ کا ایک نمونہ بھی نمائش میں تھا۔

والد مرحوم بھی اردو لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور بچوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا۔بہت دعا گو تھے۔مومن کی دعائیں سات نسلوں تک کام آتی ہیں۔اس کا نمونہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔

تم نے مجھ سے 21 سوال پوچھے ہیں اور ہر سوال میں کئی کئی اور سوال ہیں۔مَیں ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ جواب لکھوں تو میرے خط میں کوئی ترتیب نہ رہے گی۔خاندان کا احوال اوپر آ گیا ہے۔اس لئے باقی سوالوں کا جواب مَیں اپنے طریق کے مطابق لکھوں گا۔میرے لئے اپنی زندگی کا سب سے خوشگوار زمانہ وہی تھا جب تک والد مرحوم زندہ رہے۔تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی مہمان آجاتا تھا۔گھر سے باہر ہماری حویلی اور کنواں، جہاں کئی پھل دار درخت تھے، گاؤں میں سب سے بارونق جگہ تھی۔جب کوئی مہمان آتا والدہ مرحومہ بہت خوش ہوتیں اور ان کی خاطر تواضع کر کے بہت تسکین محسوس کرتیں۔مجھے باہر مہمانوں کے پاس بھیج دیتیں۔مَیں ان کی باتیں سُنتا رہتا۔باتیں تو مجھے یاد نہیں لیکن اُن کا لاشعوری اثر میری زندگی پر ہے۔مجھے یاد نہیں کہ مَیں نے کبھی والد مرحوم سے کبھی کوئی بات کی ہو۔اُن کا بہت رعب تھا۔مجھے یہ بھی یاد نہیں کبھی تمہارے اباجی مرحوم سے کوئی بات ازخود کی ہو۔ہاں انہوں نے کبھی کچھ پوچھا تو بتا دیا۔میری بہنیں تو والد مرحوم سے اکثر گھر میں چُھپی

رہتی تھیں۔ میرے والد صاحب جب وفات پا گئے تو میری بہن نُور زینب مرحومہ ان کے جسم پر ہاتھ پھیر پھیر کر باتیں کر رہی تھیں۔ میری چچی مرحومہ بھی جو پاس ہی کھڑی تھیں نے کہا ''تم نے ان سے ان کی زندگی میں تو کبھی بات نہیں کی اب کیا باتیں کر رہی ہو۔''

بڑی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلتی تھیں۔ ہاں خوشی کے موقع پر گول چکرّ میں کھڑی ہو کر ککلی ڈالتی تھیں۔ چکر میں چلتی بھی جاتیں اور جُھک کر تالی بھی بجاتی جاتیں۔ جب مَیں اور منیر (بیگم) شادی کے بعد پہلی دفعہ اپنے گاؤں گئے تو ہمارے سواگت میں لڑکیوں نے ککلی ڈالی۔ مَیں اور منیر ان کے پاس کھڑے تھے۔ مرد دن کے وقت گھروں میں نہیں آتے تھے۔ وہ باہر حویلیوں، کنوؤں یا اگر کام کر رہے ہوں تو کھیتوں میں ہوتے تھے۔ مَیں نے اپنی بہنوں کو کبھی ننگے سَر نہیں دیکھا۔

اب اپنے ابا جی کا حال سُنو۔ انہوں نے کچھ عرصہ سیالکوٹ میں بھی رہ کر پڑھا اس کے بعد آگرہ میں ملٹری میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں یہ ٹینس، جو سب سے مہنگا کھیل ہے، کھیلتے تھے۔ سال میں ایک دو دفعہ ملٹری ٹریننگ ہوتی تھی۔ غالباً 1925ء کے قریب یہ کورس پاس کیا اور ضلع میانوالی کے قصبہ دریا خان جو دریائے سندھ کے کنارے پر ہے ملازم ہو گئے۔ مزاج شاہانہ تھا۔ وہاں کے بڑے خان اور دوسرے بااثر آدمیوں سے دوستی ہو گئی۔ اور بھی جس جس جگہ ضلع میانوالی میں گئے اور سروس کی کثرت سے دوست بنا لئے۔ لوگوں کو بھی ڈاکٹر سے مطلب ہوتا ہے اس لئے وہاں کے بااثر لوگ ان کے دوست بن گئے۔

مَیں ایک دفعہ غالباً دسویں جماعت میں دریا خان گیا، وہاں ڈاکٹر بھائی جان کی دوسری دفعہ پوسٹنگ ہوئی تھی۔ تمہاری امی مرحومہ بھی ان دنوں وہاں بطور مہمان آئی ہوئی تھیں۔ مَیں نے دیکھا کہ ہسپتال میں ہی ان کو مکان ملا ہوا تھا اور ہر شام کوئی نہ کوئی دوست ان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ بہن عائشہ مرحومہ بڑے شوق سے ان کے لئے لذیذ کھانا بناتی تھیں۔ ایک دن میں نے

دیکھا کہ ٹرپ پر مجھے ایک کنوئیں پر لے گئے جو دریا کی طرف تھا۔ وہاں بکرے کی سالم رانیں اڑائی جا رہی تھیں اور کئی دوست تھے۔ دروازے پر خان کی طرف سے ایک دودھ دینے والی بھینس ہمیشہ بندھی رہتی تھی۔ مہینہ میں ایک دو دفعہ باہر کے خاص خاص دیہات میں دورہ ہوتا تھا اور وہاں مریض دیکھنے جاتے تھے۔ اس دورہ کے لئے گھوڑا ان کی طرف سے آجاتا تھا۔ ہسپتال میں ایک اردلی تو ان کو سرکار کی طرف سے ملا ہوتا تھا۔ باقی بھینس وغیرہ کو چارہ ڈالنے کے لئے ایک غالباً خان کی طرف سے بھی نوکر ملا ہوا تھا۔ جب سال میں ایک دو ماہ کی ملٹری ٹریننگ ہوتی تھی تو بہن عائشہ مرحومہ ہمارے گاؤں آجاتی تھیں۔ ڈاکٹر بھائی کو میانوالی ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت کے دوران 80 روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور اگر کسی کے گھر جانا ہوتا اور مریض کو دیکھنا ہوتا تو دو روپے فیس تھی۔

شکاری کتوں کے ساتھ خرگوش اور ہرن کا شکار کھیلتے تھے۔ سال دو سال کے بعد جب گھر میں آنا ہوتا تھا، کہتے تھے فلاں دن آؤں گا۔ مَیں شام کو ہی گھر کی منڈیر پر بیٹھ جاتا۔ جب موٹر گذر جاتی مایوس ہو کر گھر کی چھت سے اتر آتا۔ عام طور پر سردیوں کے دنوں میں گاؤں آتے۔ بہت سا خشک پھل لاتے۔ ٹینس کے استعمال شدہ گیند لاتے۔ گھر میں جتنے دن رہتے، صبح شام لمبی سیر کرتے۔ گاؤں میں ہر ایک کے گھر جاتے اور سب عورتوں اور مردوں سے ملتے۔ سوشل بہت تھے لیکن خودداری اور انا کچھ زیادہ رہتی تھی۔ اس لئے جتنی دیر ضلع میانوالی میں ملازمت کی ان کے اپنے سینئر ڈاکٹروں سے نہیں بنی اور کئی دفعہ وہاں ان کو مقدمات بھی لڑنے پڑے۔ غالباً 1942ء میں ان کو ملٹری کی طرف سے بلاوہ آ گیا۔ جنگ 39ء سے ہو رہی تھی۔ ان کو بتراسی کیمپ صوبہ سرحد اور صبیل پور جنوبی ہند میں جنگ کے لئے تربیت دی گئی۔ 1942ء میں آپ کو بلاوہ آ گیا۔ مگر پچھلی ملازمت پر lesion قائم رہا۔ اور بطور ڈاکٹر بھرتی ہو گئے۔ پنجاب رجمنٹ 4/14 میں تقرری ہوئی۔ دوسرے سال ترقی کر کے کیپٹن بن گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل شامل حال تھا۔ تیسرے سال یعنی تقریباً جنگ عظیم دوئم کے خاتمے سے صرف ایک سال قبل ان کو

Thai Land تک Far East Asian Command یعنی برما سے آگے جو جنگلات جاتے ہیں۔ وہاں محاذ پر بھیجا گیا۔جنگل کی لڑائی میں ایک دن کسی بڑے افسر کی نگاہ پڑ گئی۔ ویسے بھی بہت چُست تھے ہماری طرح ساری عمر کُرسی پر بیٹھ کر نہیں گذاری۔ اس طرح ملٹری کراس (M.C) مِل گیا۔ 1944ء کے شروع میں دوسری شادی کی۔ برات میں صرف مَیں شامل تھا۔واپسی پر امرتسر کی سیر کرتے ہوئے نئے گھر جہاں گاؤں چھوڑ کر ہم رہتے تھے دو پہر سے ذرا پہلے پہنچے۔تقریباً تین سال کی ملٹری سروس کے دوران 140 روپے گھر بھیجتے تھے۔ پہلے جیسا مَیں نے لکھا تھا صوبیدار کے طور پر بلایا، جس کی تنخواہ 130 روپیہ ماہوار تھی۔ایک سال میں ہی سیکنڈ لیفٹینٹ، لیفٹینٹ اور کیپٹن ہوئے۔آخری تنخواہ 656 روپے ماہوار تھی اس عرصہ میں یعنی 1939ء سے 1945ء تک قیمتیں پانچ گُنا بڑھ چُکی تھیں۔1945ء میں ڈاکٹر بھائی جان مرحوم نے پُرانی میانوالی ڈسٹرکٹ کی سروس join نہیں کی بلکہ وقفِ زندگی کے لئے نام پیش کیا اور کشمیر سرینگر وقفِ زندگی برائے خدمتِ انسانی کے لئے بھیجے گئے۔ مَیں اس وقت جالندھر میں تھا۔ان کا جو آخری خط سرینگر سے 1946ء میں آیا اس میں لکھا تھا کہ 60/50 روپیہ روزانہ کی آمد ہے۔اس کے بعد پاکستان بن گیا۔مَیں بھی کسی کی مہربانی سے 28 اگست 1947ء کو لاہور پہنچ گیا۔وہاں سے 29 اگست کو سیالکوٹ ہمشیرہ مکرمہ نُور زینب مرحومہ کے پاس پہنچ گیا۔اگلے دن بھائی نُور احمد سالَم تانگہ لے کر مع بندوق سیالکوٹ پہنچ گئے۔اور ہم خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ جالندھر ہندوستان سے اپنے گھر آ کر مَیں سیالکوٹ چلا گیا اور وہاں اپنے دفتر میں رپورٹ کی۔ وہاں سے وہ دفتر ہی اُٹھا کر ایبٹ آباد صوبہ سرحد لے گئے۔ بھائی نُور احمد مرحوم بھی کوئٹہ بلوچستان سے تبدیل ہو کر ایبٹ آباد آ گئے۔مَیں ایبٹ آباد 10 اکتوبر 1947ء کو پہنچا اور برادرم نُور احمد نومبر 1948ء میں یعنی صرف ایک سال کے بعد۔ برادرم نُور احمد مرحوم نے آپا رشیدہ مرحومہ، جو میرے سب سے بڑے سگے ماموں کی بیٹی تھیں، سے دسمبر 1948ء میں شادی کی اور میری منیر سے شادی 6 فروری 1949ء کو ہوئی۔یعنی صرف دو ماہ کے بعد شادی کے

بعد مَیں کاکول جو ایبٹ آباد سے 5 میل شمال میں ہے اُن کے کوارٹر میں اُن کے ساتھ رہنے لگا۔ ایبٹ آباد کاکول میں خبر پہنچی کہ سیلاب کی وجہ سے ہماری ڈیک کی دیوار گر گئی ہے اور والدہ مرحومہ کو ہمشیرہ نُور زینب کے گھر سیالکوٹ پہنچا دیا گیا ہے۔ مَیں وہاں گیا اور اُن کو برادرم نُور احمد مرحوم کے کوارٹر میں لے آیا۔ والدہ مرحومہ سخت بیمار تھیں۔ ان کو اپنے سیالکوٹ کے گاؤں کے ساتھ سخت پیار تھا۔ والد مرحوم کی وفات پر اُن کا ایک آنسو بھی نہیں گرا اور دوسرے دن بھائی نذیر احمد کی حادثاتی وفات کی خبر پہنچی تو اُن پر سکتہ ہی طاری رہا۔ اونچی رونے کی آواز صرف میری تھی۔ جب تار پہنچا تو یہ تار لانے والا ہمارا دشمن تھا۔ مَیں ظفروال کی سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔ پتہ نہیں کون مجھے گھر لایا۔ سارا گاؤں گھر کی چھتوں پر اور اندر باہر اکٹھا ہو گیا۔ تقریباً 30 یا 40 دن تعزیت کے لئے گھر آنے والے مہمانوں کا تانتا بندھا رہا۔ مجھے اب تک پتہ نہیں کہ ان کے کھانے پینے اور رہنے کا کیسے انتظام ہوا۔

اب تم نے جو متفرق باتیں پوچھی ہیں ان کے جواب یہ ہیں:

ہمارا گھر کچّا تھا۔ مٹی کے مکان گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم رہتے ہیں۔ گھر میں نلکا تھا اور شاید اب تک ہو۔ گھر بناتے وقت کوئی مزدوری نہیں دی جاتی تھی۔ جب کوئی کام کرتا تھا تو اُسے کھانا کھلایا جاتا تھا اور ربیع اور خریف کی فصلیں آنے پر اُن کے حصّے مقرر تھے جو ان کو دے دئے جاتے تھے۔ لکڑی مکانوں میں ایسی استعمال کی جاتی تھی جس کو دیمک نہ لگے۔ مکان میں پانچ کمرے، تین برآمدے، ایک صحن، ایک غسلخانہ اور ایک سیڑھی تھی۔ گھر میں دو بھینسیں، دو ان کے بچے اور دو بیل تھے۔ جب دونوں بھینسیں دودھ دیتی تھیں تو 12 سے 14 سیر دودھ ہوتا تھا۔ آدھا ظفروال بھیج دیا جاتا تھا۔ لڑکیاں کھیتوں میں کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ لیمپ اور لالٹین استعمال ہوتی تھی۔ اب تو نالہ ڈیک رُخ موڑ چُکا ہے۔ وہاں بہت زرخیز زمین ہے۔ بجلی بھی آ چکی ہے۔ گاؤں میں سکول بھی ہے ہمارا مکان ہمارے ایک چچا کے پوتے کے پاس ہے۔ جن دنوں کی مَیں باتیں کر رہا ہوں اُسے 70 سال ہو چکے ہیں۔ میری عمر اس وقت ماشاءاللہ 78 سال 2 ماہ ہے۔

اب مادی سہولتوں سے مذہب مادیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے۔ میرے والد مرحوم کتنی محنت کرتے تھے آپ اُس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتیں لیکن اتنے مطمئن تھے کہ بتا نہیں سکتا۔ ان کے کھیتوں کی فصل صاف پہچانی جاتی تھی۔

پیاری بیٹی، ہمیشہ خوش رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ میرا تُم سب کو پیار۔

یہ خط یونہی ایک دفعہ پڑھ کر رکھ نہ دینا۔ تُم اپنے اباجی پر ریسرچ پیپر لکھ رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری محبت کا رنگ اس میں بھر دے۔ اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے۔ سب کو سلام و پیار۔

فقط احقر

تمہارا چچا

ظہور احمد

چچا جان نے محترم ڈاکٹر جلال الدین صاحب کی بیٹی منیرہ بیگم صاحبہ سے شادی کی۔ بہت محبت کرنے والی، خدمت کرنے والی اور مہمان نواز خاتون ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تین بیٹے اور تین بیٹیوں سے نوازا۔

آپ کی زندگی میں بڑی بیٹی قدسیہ کینسر میں مبتلا رہ کر لمبا عرصہ بیمار رہی اور عین جوانی میں کمسن پانچ بچیاں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئی۔ یہ ہماری بہن بہت میٹھی طبیعت کی مالک تھی۔ بہت خدمت گزار، نہایت طریقے سلیقے والی، حد سے زیادہ عبادت گذار، باقاعدگی سے نوافل پڑھنے والی، اقرباء سے محبت کرنے والی اور بچوں کو بہت چاہنے والی ماں تھی۔ اللہ تعالیٰ اس کے بچوں کا حافظ و ناصر ہو اور اس کے درجات بلند کرے۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ سب سے بڑے بیٹے محترم خالد بھائی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور محنتی انسان تھے۔ سادہ اور شریف النفس مزاج رکھتے تھے۔ منہ کے کینسر کے باعث بیمار ہو گئے اور نہایت کرب سے آخری دن گذارے حتیٰ کہ موت کی گھڑی آ پہنچی۔ ان کی بے وقت وفات ان کی والدہ، بہن بھائیوں اور سب عزیزوں کے لئے بہت بڑا صدمہ ہے۔ تینوں فوت شدگان کراچی میں دفن ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے۔

بھائی چوہدری عبدالسلام صاحب درویش

بھائی چوہدری عبدالسلام صاحب درویش ابا جی کے سب سے بڑے داماد تھے۔ان کی طبیعت میں بہت سادگی اور درویشی تھی۔آپ نہایت جفاکش اور بہادر انسان تھے۔آپ نے سلسلہ کا ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور جماعت کے ساتھ ہمیشہ وفا کا تعلق رکھا۔ قادیان میں فضل عمر پریس لگائے جانے پر آپ پہلے مینیجر مقرر ہوئے۔نظام جماعت سے اور خلفاء سے محبت رکھنے والے تھے۔

آپ کی جائے پیدائش درگاہوالی ضلع سیالکوٹ ہے۔ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔تقریباً چار یا پانچ سال تک دہلی میں محکمہ ایم،ای،ایس میں ملازمت کی جہاں واٹر سپلائی فٹنگ کا کام کیا۔تقسیمِ ملک کے وقت جب مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لئے حضرت مصلح موعود نے تحریک فرمائی تو آپ کے تایا چوہدری اللہ دتا صاحب نے آپ کی بہادری اور بعض خوبیوں کے پیشِ نظر فرمایا کہ ہمارے خاندان میں یہ لڑکا ہے جو ان حالات میں کام آنے کے لائق ہے۔

آپ خود اس درویشی کی زندگی میں شامل ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خاکسار کو خدا نے محض اپنے فضل سے حضورؓ کی اس تحریک پر لبیک کہنے کی سعادت بخشی۔ 5 ستمبر 1947ء کو اللہ تعالیٰ مجھے اس مبارک بستی قادیان دارالمسیح میں لے آیا الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ اس وقت صرف 15 یوم کے لئے مع دیگر 15،16 نوجوانوں کے یہاں آیا تھا۔15 روز کے بعد باقی افراد واپس چلے گئے لیکن خاکسار نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔قادیان کی حفاظت کے لئے مختلف جگہوں پر ڈیوٹیاں لگتی رہیں اس دوران مقامی پولیس کی زیادتیوں کا شکار ہونا پڑا خاص طور پر موضع سٹھیالی میں پولیس نے جسمانی سزائیں دیں۔'' (بحوالہ مشکوٰۃ نومبر 2002ء)

پھر آگے چل کر بیان کرتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ نے قادیان آنے کی سعادت عطا فرمائی۔ پھر قریباً چار سال تک بطور کارِ

خاص دفتر امورِ عامہ میں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ اس دوران خاکسار اور محترم محمد یوسف صاحب گجراتی مرحوم کو پرنٹنگ پریس کا کام سکھلانے کے لئے مرکز کی طرف سے ربوہ پاکستان بھجوایا گیا۔ واپسی پر قریباً نو دس سال تک فضل عمر پریس میں کام کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس پریس میں کام کرتے ہوئے خاکسار کا بازو بھی کٹ گیا۔ پھر صیغہ تعمیرات میں خدمت بجالانے کی توفیق ملی۔ 1986ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد بطور خاص فضل عمر پریس میں مزید 6 سال خدمت کی توفیق پائی۔ 1948ء میں خاکسار کے پھوپھی زاد بھائی محترم ڈاکٹر بشیر احمد صاحب مرحوم قادیان آ گئے۔ چند سال کے عرصہ کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی زوجہ محترمہ مبارکہ بیگم صاحبہ کو مع بچوں کے قادیان بُلا لیا۔ ان کے ساتھ ہی میری بیوی کو بھی بلا لیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد ہماری شادی ہوگئی۔ محترمہ مبارکہ بیگم صاحبہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے تعلیم یافتہ تھیں۔ یہاں قادیان میں سلسلہ عالیہ کی بے لوث خدمت کی توفیق ملتی رہی۔ ایک لمبے عرصہ تک لجنہ اماء اللہ کی بطور صدر خدمت کی توفیق ملتی رہی۔ ان کے ساتھ خاکسار کی اہلیہ سلیمہ صاحبہ کو بھی سلسلہ کی خدمت کی توفیق ملتی رہی۔'' (بحوالہ مشکوٰۃ نومبر 2002ء)

بھائی عبدالسلام صاحب کی طبیعت میں بہت چُستی تھی۔ اس تقاضے کو وہ کھیل کر پورا کیا کرتے تھے۔ اپنے زمانے کے والی بال کے بہترین کھلاڑی تھے دوستوں نے ان کا نام ازراہِ تفنّن ''کلہاڑا'' رکھا ہوا تھا۔ والی بال کے علاوہ گولہ پھینکنے میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ باوجود ایک ہاتھ نہ ہونے کے ہرطرح کا کام خود کر لیتے اور کسی قسم کی مجبوری کا اظہار نہ کیا۔ حضرت میاں وسیم صاحب سے بہت عقیدت اور محبت تھی۔ ان کے بلانے پر کھانا پینا سب کام کاج چھوڑ کر چلے جاتے اور ہر کام پر ان کے حکم کو مقدم رکھتے۔ جوانی میں وصیت کرنے کی توفیق ملی۔ آپ بہشتی مقبرہ قادیان میں دفن ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے خطبہ جمعہ کے آخر میں آپ کے اوصاف حمیدہ کا ذکر فرمایا اور آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات عطا فرمائے۔ آمین۔

مکرم رفیق احمد فوزی صاحب

آپ راولپنڈی کے مشہور بزرگ قاضی بشیر احمد بھٹی مرحوم کے نواسے اور محترم محمد نصیب صاحب عارف کے سب سے بڑے فرزند تھے اور ڈاکٹر بشیر احمد صاحب مرحوم ربوہ کے داماد تھے۔آپ نے ابتدائی تعلیم راولپنڈی میں حاصل کی، بعدازاں آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم ایس سی کیا۔1967 سے 1982ء تک پہلے اطفال میں اور پھر خدام الاحمدیہ راولپنڈی میں مسلسل کسی نہ کسی شعبے میں خدمات انجام دیتے رہے۔تین دفعہ سائیکل سفر کے ذریعے راولپنڈی سے ربوہ اجتماع خدام الاحمدیہ مرکزیہ میں شمولیت اختیار کی۔1982ء میں راولپنڈی میں بطور قائد مجلس خدام الاحمدیہ خدمت سرانجام دی۔ جماعت کی نصرت جہاں سکیم کے تحت وقف کر کے بطور ٹیچر نائیجیریا چلے گئے اور وہاں دورافتادہ اور پسماندہ علاقوں میں خدمت کرتے رہے۔پھر وہاں تین سال کا وقف مکمل کر کے واپسی پر ناروے میں مقیم ہو گئے۔

(بحوالہ۔تاریخ احمدیت راولپنڈی)

آپ نے بہت کم عمری سے ہی جماعت کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔18 سال کی عمر میں وصیت کی۔اسی عمر میں ہی ناظم اطفال بنے۔پھر قائد شہر اور قائد ضلع بنائے گئے۔ 1982ء تک جبکہ آپ پاکستان میں تھے،کئی سال شوریٰ کے نمائندے منتخب ہوتے رہے۔ نائیجیریا میں وقف کے دوران ایسے معلمین کی ضرورت پڑتی جو دوردراز علاقوں میں جا کر نائیجیرین نومبائعین کی تربیتی کلاسیں وغیرہ لیتے۔نائیجیریا کے بعد ناروے آ گئے۔جنوبی ساحلی علاقے Kristiansand میں رہائش اختیار کی یہاں آپ صدر منتخب ہوئے اسی عرصہ کے دوران 89ء جوبلی کا سال بھی تھا۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خوب جوش وخروش سے فوزی صاحب نے اس کا انتظام کیا۔اللہ تعالیٰ نے ایک اور سعادت ان کو بخشی کہ 89ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ ڈنمارک سے (Kristian Sand) آئے یعنی جس شہر میں آپ

رہتے تھے یہ محض اتفاق تھا ورنہ یہ سب پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ پھر آپ اوسلوشفٹ ہو گئے اور جماعت کے سیکرٹری وصایا بنا دیئے گئے۔ بعد میں سیکرٹری تعلیم، سیکرٹری تربیت اور آخری وقت میں صدر حلقہ بنائے گئے۔

آپ جماعتی لٹریچر ہمیشہ ہر سفر میں اپنے ساتھ رکھتے جہاں موقع ملتا وہاں دعوت حق دیتے۔ ناروے کے شہر Kristian Sand میں دو سالوں میں نزدیک کے گاؤں اور ان علاقوں کے بازاروں میں پندرہ روزہ اسٹال لگاتے اور لٹریچر تقسیم کرتے۔ درامن شہر میں بھی ہر ماہ اپنا اسٹال لگاتے اور اپنے دونوں کم سن بیٹوں یاسر اور عامر کے ساتھ دعوتِ الی اللہ کرتے۔ یہاں اکثر گرجوں میں بھی جاتے اور تبادلہ خیالات کرتے۔ سروس کے دوران بارہا قرآن پاک خرید کر تحفوں میں دیئے۔

حتیٰ کہ بیماری کے دنوں میں بھی ہسپتال میں ڈاکٹروں کو قرآن پاک اور حضور کی کتاب Rationality تقسیم کیں۔ چودھری سر محمد ظفر اللہ خان صاحبؓ کی ''تحدیثِ نعمت'' آپ نے تقریباً دس دفعہ پڑھی۔ بچوں سے کہتے تھے ''تحدیثِ نعمت'' پڑھنے سے انسان کے اندر باکمال انسان بننے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

خلافت اور خلفاء سے گہرا تعلق تھا۔ آپ تقریباً 7 ماہ علیل رہے اور بالآخر 29 اکتوبر 99ء بروز جمعہ خدا کے حضور حاضر ہو گئے۔ آپ کو ناروے میں ہی دفن کیا گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے اپنے خط میں تعزیت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''عزیزم فوزی کی وفات کا بے حد دُکھ ہے۔ ان کے بارے میں ساری اطلاعات ملتی رہیں اور اس طرح دعا کا موقع ملتا رہا لیکن بہر حال خدا کی تقدیر غالب آئی۔''

آپ نے اپنے پسماندگان میں بیوی اور دو بیٹے چھوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے اور ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین''

عزیز بھائی محترم چوہدری رشید احمد صاحب

سیکرٹری پریس اینڈ پبلیکیشن انٹرنیشنل جماعت احمدیہ

بعض رشتے اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ باوجود کوشش کے بھی ان کے ذکرِ خیر کا حق ادا نہیں ہوسکتا نہ ہی ان کی محبت کا قرض چُکایا جاسکتا ہے۔ان کی یاد زندگی کی مصروفیتوں میں بھی ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ایسا ہی ایک بہت پیارا وجود ہمارے عزیز بہنوئی محترم چوہدری رشید احمد صاحب تھے جنہوں نے مجھ سے میرے میاں اور بچوں سے بہت محبت کی۔

بھائی رشید صاحب سے ہمارا تعلق بڑی بہن محترمہ ناصرہ رشید سے سال 1965ء کو رشتے کی بناء پر قائم ہوا۔ان کے والدین باجی کا رشتہ لینے آئے تو امی نے ایک ہلکا سا نظارہ خواب میں دیکھا کہ ایک پتنگ ہے جو آسمان پر اُڑ رہی ہے آخر کار اُڑتے اُڑتے ہمارے گھر کے صحن میں آ گری ہے۔ چنانچہ یہ رشتہ طے پا گیا پھر دسمبر 1965ء میں شادی ہوگئی۔

بھائی جان کا سادہ سا گھرانہ تھا۔سلطان پورہ لاہور میں رہائش تھی۔آپ پولیس میں ملازم تھے۔ہمارے ابا جی مکرم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب نے دنیاوی وجاہت اور مال و دولت کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ان کو بھائی جان کی سیرت اور صحت نے بہت متأثر کیا۔رشید بھائی لاہور جماعت کے فعال رُکن تھے۔لاہور کے ناظمِ عمومی تھے۔جماعتی کاموں میں حصہ لینا اور دین کے لئے اپنے دل میں بہت جوش رکھنا،ان کی یہی خصوصیات ابا جی کو پسند آ گئیں۔

خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ دینی و دنیوی علوم میں بہت آگے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ہمارے والدین کے ساتھ ان کا مزاج ملتا تھا۔ہمارے والدین بھی علم دوست تھے۔ان کے ساتھ جماعت کے بزرگوں کے قصے دہراتے شام گذر جاتی۔دین کا جوش اور غیرت ان کا شیوہ

تھا۔تمام عمر قلم حرکت میں رہا۔دینی، مذہبی، سائنسی، تاریخی اور مزاحیہ مضامین کے لکھاری تھے۔ نظم اور غزل میں بھی مہارت تھی۔ باجی کی شادی کے بعد جب بھی وہ میکے آتیں ہر خط میں ان کے نام غزل لکھ کر بھیجا کرتے۔

رشید بھائی نے بی ایس سی کے بعد بی ایڈ کیا، ایم اے اسلامیات کی ڈگری لی اور پھر حضرت مرزا بشیر احمدؓ کے کہنے پر ایل ایل بی کی ڈگری لی۔آپ ٹیوشن پڑھا کر اپنی فیس کی ادائیگی کے لئے رقم اکٹھی کر لیتے اور اس کے علاوہ امتحانوں کے پرچے چیک کرتے۔اس سلسلے میں ان کو بعض لوگ کئی طرح کے لالچ دیتے۔جن لوگوں کے بچے امتحان دے چکے ہوتے وہ کھوج لگا لیتے کہ پرچے کس کے پاس گئے ہیں۔اب کوئی پیشکش کرتا کہ ہماری دوکان سے آکر اپنی پسند کا کوٹ لے جایئے، کوئی کہتا کہ آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے، سوٹ کیلئے کون سا رنگ پسند کریں گے؟ بھائی جان کو اللہ تعالیٰ نے اتنی استقامت بخشی تھی انہوں نے کسی موقع پر ایمان کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ان کی تھوڑی سی اجرت میں اللہ تعالیٰ نے بہت برکت رکھی تھی اور یوں آپ آہستہ آہستہ ترقی کی منازل طے کرتے گئے اور علم کی پیاس بجھاتے چلے گئے۔

آپ 1968ء میں انگلستان چلے گئے۔آپ کے انگلستان جانے کی یہ تقریب پیدا ہوئی کہ ایک دن خوش قسمتی سے آپ نے انگلینڈ میں ٹیچر کی نوکری کا اشتہار دیکھا تو درخواست بھیج دی جو فوراً منظور کر لی گئی اور ووچر آ گیا۔چنانچہ آپ کام کی غرض سے لندن تشریف لے آئے۔لندن میں بالکل نئی زندگی کا آغاز تھا۔شروع کے دن نہایت مشکل تھے۔لندن میں مزید تعلیم حاصل کی اور استادی کی تربیت حاصل کی۔

مغرب میں ایک مشرقی باشندے کا استاد بننا آسان امر نہیں۔دوسرا وطن، غیر ملکیوں سے تعصب، دوسری زبان، لب ولہجہ کا نمایاں فرق، نسلی اور مذہبی تعصب، دو تہذیبوں کا ٹکراؤ، آزاد خیال بچے۔ان سب وجوہات نے آپ کے اعصاب پر بہت اثر ڈالا مگر شاگردوں پر آپ کا رعب بھی بہت تھا اور تہذیب کے اس ٹکراؤ کے باوجود ہر جگہ آپ کی عزّت کی جاتی تھی۔

آپ بچوں کے بہت پیارے دوست تھے۔بچوں کے بارے میں نہایت صابر باپ تھے۔ جماعت کا کام سارا سال باقاعدہ کیا کرتے تھے مگر جب خلیفہء وقت لندن تشریف لاتے تو بھائی جان گھر کی راہ بھول جاتے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ جب تشریف لاتے تو بھائی جان کی مصروفیت کی انتہا نہ رہتی۔ پھر کچھ عرصہ بعد مئی 1984ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے لندن ہجرت فرمائی اور مستقل قیام کیا تو چند ہفتوں کے بعد حضور نے از راہِ شفقت آپ کو پریس پبلیکیشنز کا کام سونپا۔اس فرض کو آپ نے ایسی عمدگی کے ساتھ نبھایا کہ بھائی جان کا اپنے بچوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی آمد سے جماعت کی مصروفیات کچھ ایسی بڑھیں اور آپ نے اپنے آپ کو ایسا وقف کیا کہ بچوں کو باپ کی شکل نظر نہ آتی تھی۔سیر اور پکنک کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

چونکہ ان کو گُردے کی تکلیف تھی اور وقفے وقفے سے پتھری نکالی جاتی تھی۔اس لئے چند دن مجبوراً ان کو بستر پر رہنا پڑتا تھا۔یہ لمحات بچوں کے لئے بہت سہانے ہوتے تھے کیونکہ بیماری کے سبب بچے باپ سے ملتے۔ان کو ادب سے دلچسپی تھی۔ جماعت کے مختلف اخبارات میں مذہبی، ادبی، تحقیقی اور ادبی مضامین بھجوایا کرتے۔ادب کے حوالے سے ان کا حلقہ احباب بھی وسیع تھا۔ان کی صحبت میں بہت لطف محسوس ہوتا۔علمی بحثیں، بزرگوں کے قصے نہایت خوبصورت انداز میں سُناتے۔ مولوی راجیکیؓ صاحب کے ساتھ ملاقاتوں کے دلچسپ قصے سناتے۔ان کو صحبتِ صالحین کی تڑپ رہتی۔

بھائی جان کو میرے ساتھ بہت اُنس تھا۔میرا جب بھی ان کے ہاں جانا ہوا وہ ایسے والہانہ انداز سے ملتے۔کتابیں چھوڑ کر میرا استقبال کرتے۔سر پر ہاتھ پھیرتے مجھے دیکھ کر کہتے ''اچھا تم آئی ہو، پھر چونک کر پوچھتے کیا واقعی تم آئی ہو۔''

1994ء کی بات ہے مجھے لندن میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ میسر آیا۔آپ کو میری آمد کی بہت خوشی ہوئی۔جتنی دیر میں ان کے ہاں ٹھہری، ان کا سلوک میرے ساتھ نہایت ہی مشفقانہ

رہا۔میری ڈیڑھ سالہ بیٹی رافعہ بھی ساتھ تھی جس کو میں nanny کے ہاں چھوڑتی تھی۔ایک دن وہ خاتون بیمار ہوگئی۔اب میں پریشان کہ بچی کو کون رکھے۔ بھائی جان نے اپنا کام چھوڑا۔اس دن سکول نہ گئے اور آپ نے میری بیٹی کو خوشی سے سارا دن سنبھالا۔اس کو کھلاتے رہے۔میں شام کے وقت لوٹی تو اس کے ساتھ نہایت خوش وخرم بیٹھے ہوئے تھے۔میرے تمام بہن بھائی آپ کے ہاں آتے جاتے کسی کو وہ اتنا خوش دلی سے نہ ملتے تھے جتنا مجھے دیکھ کر خوش ہوتے۔ایک مرتبہ لمبے عرصہ کے بعد میں آپ کے بیٹے کی شادی پر گئی۔آپکی طبیعت بہت خراب تھی۔بمشکل کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔آنکھیں بند تھیں۔میں اور میری بہن نبیلہ اکٹھے ان کے ہاں گئے۔نبیلہ نے سلام کیا۔کمزور آواز میں جواب دیا اور بس خاموش رہے۔اتنے میں میں نے سامنے ہو کر سلام کیا۔ان کو اچانک جیسے کرنٹ لگا ہو۔نہایت خوشی سے نعرے مارتے ہوئے اٹھے مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔اس پر نبیلہ نے کہا بھائی جان مجھے اور میرے بچوں کو بھی پیار کریں۔اس پر معمولی سا ہاتھ پھیر کر پرے ہٹ گئے۔یہی حال آپکا میرے میاں سجاد صاحب کے ساتھ تھا۔اقرباء پروری کی صفت بہت نمایاں تھی۔غریب پرور بھی تھے۔صدقات کثرت سے نکالتے۔

آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ مجھے ہر کتاب کا تحفہ دیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ ایک کتاب ''عمر'' میں نے آپ سے مانگی۔کہنے لگے میں نے تمہیں بھیج دی ہے۔میں نے اصرار کیا کہ مجھے نہیں پہنچی۔کہنے لگے میں تمہیں نہیں بھولتا۔وہ کتاب شاید کسی کے ہاتھ بھیجی تھی جو مجھ تک نہ پہنچی تھی۔پھر کتاب پر میرے تینوں بچوں کے نام مع دعائیہ الفاظ لکھ کر مجھے دی۔ان کے تحائف ہمارے پاس محفوظ ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔اللہ تعالیٰ ان کی محبتوں اور چاہتوں کے بدلے انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ان کے بیوی بچوں کا حافظ وناصر ہو۔ ان کے ادھورے کاموں اور اسلام کی اشاعت کی تمنا کو اگلی نسلوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ذیل میں دیا گیا مضمون ان کی اہلیہ صاحبہ کا ہے جو الفضل ربوہ میں چھپ چکا ہے:

میرے ہمسفر چوہدری رشید احمد صاحب

سیکرٹری پریس اینڈ پبلیکیشن انٹرنیشنل جماعت احمدیہ

(تحریر: ناصرہ اہلیہ چوہدری رشید احمد صاحب)

(بحوالہ روزنامہ الفضل ربوہ)

ایک زندہ انسان کے ساتھ کتنے کام لگے ہوتے ہیں اور ایک ایسے زندہ انسان کے لئے جس کا سفر جاری ہے ختم نہیں ہوا کتنے کام ہوں گے، اس بات کا اندازہ اس باعمل انسان کے قریب رہنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ جب مَیں اپنے میاں چوہدری رشید صاحب کی زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ ایک بھرپور زندگی جیئے اور تمام زندگی خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف رہے۔ کبھی اپنے آرام کی پرواہ کی، نہ کبھی کھانے پینے کا خیال رکھا بس کام اور کام۔ اپنی بیماری سے بھی مردانہ وار لڑے۔ آپ نے اپنا کیریئر پولیس اکیڈمی والٹن سے سپاہی (تھانیدار) کی وردی سے شروع کیا پھر اپنے سینہ پر خِدماتِ دینیہ کے بَیج لگاتے چلے گئے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔

الحمدللہ، واقفِ زندگی نہ تھے لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ وقف ہی سمجھتے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے بارہا اظہارِ خوشنودی کے طور پر فرمایا کہ:

”رشید صاحب واقفِ زندگی تو نہیں ہیں لیکن واقفِ زندگی سے بڑھ کر کام کرتے ہیں“

خلیفہء وقت کی اطاعت میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ جب حضرت صاحب کا ارشاد ہوتا تو پھر کام کرتے چلے جاتے۔ ساری رات بھی جاگنا پڑے، کام کو مطلوبہ ہدف ملنے تک کام کئے جاتے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ صبح اُٹھ کر ضروریاتِ زندگی کمانے کے لئے اپنی ملازمت پر بھی جانا ہوتا، بس اس اللہ کے بندے نے کوئی عذر نہیں سوچنا۔ بارہا ایسا ہوا کہ تمام رات کام میں

مصروف رہے اور صبح مطلوبہ کام مسجد میں دے کر اپنی نوکری پر گئے۔

محترم رشید صاحب کا آبائی گاؤں پھمبیاں ضلع ہوشیار پور رہے جو ہوشیار پور سے صرف 9 میل دور ہے۔آپ کے دادا کا نام مولا بخش تھا آپ تعلیم یافتہ شخص تھے۔گاؤں میں کوئی پرائمری سکول نہ تھا۔گاؤں کے بچوں کو بہت لمبا فاصلہ طے کر کے دوسرے شہر جانا پڑتا تھا۔آپ نے گاؤں میں پرائمری سکول کھولا پھر یہ ترقی کرتے کرتے مڈل یا شاید میٹرک تک جا پہنچا۔آپ کے والد مکرم بشیر احمد صاحب ریلوے کے محکمہ سے مُنسلک تھے۔چوہدری بشیر احمد صاحب عرصہ دراز تک سلطان پورہ کے صدر رہے۔معاش کے سلسلہ میں تمام عمر لاہور ہی میں رہے۔عرصہ دراز تک اپنے حلقہ سلطان پُورہ کے صدر بھی رہے۔آپ بہت نیک انسان تھے اور خاموش طبع تھے۔ان کی والدہ شریف بی بی صاحبہ بھی لجنہ میں محصّلہ مقرر تھیں۔وہ چندہ لینے کے لئے مختلف گھروں کا دورہ کیا کرتیں۔لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں مگر حافظہ غضب کا تھا۔ہر ایک کی رقم یاد رکھتیں پھر گھر آ کر اپنے میاں محترم بشیر احمد صاحب سے رسید کٹواتیں اور جب دوبارہ چندہ لینے جاتیں تو چندہ دہندگان کو رسید دے آتیں۔

رشید صاحب کا اپنا گھر سوامی نگر تیزاب احاطہ میں ہے۔آج بھی ان کا گھر ’’تھانیدار کے گھر‘‘ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

تعلیم

آپ نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے بی ایس پھر بی ایڈ کیا مگر معاشی تنگی کے باعث تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور تعلیم کو خیر باد کہہ کر پولیس اکیڈمی میں بھرتی ہو گئے لیکن علم حاصل کرنے کی پیاس ہمیشہ رہی۔ایک مرتبہ حضرت مرزا بشیر احمدؓ نے ایک ملاقات کے دوران فرمایا کہ آپ لاء کر لیں۔چنانچہ آپ نے ملازمت کے ساتھ ساتھ شام کی کلاسز میں داخلہ لے کر L.L.B کی ڈگری حاصل کر لی جو تمام زندگی ان کے کام آئی۔آپ اس پیشے میں بھی خوب ماہر تھے۔آخر وقت تک بچوں نے اگر کوئی

قانونی مشورہ لینا ہوتا تو اپنے ابو سے لیتے۔خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک واقعہ بھی ذہن میں نہیں آتا کہ رشید صاحب نے اپنے کسی کیس کے لئے قانونی خط لکھا ہو اوران کو ناکامی ہوئی ہو۔

پھر رشید صاحب نے پرائیویٹ طور پر ایم۔اے اسلامیات کی ڈگری حاصل کی۔اس کے لئے عربی کا علم ضروری تھا۔آپ عربی کا علم حاصل کرنے کے لئے اکیڈمی جانے سے پہلے صبح 6 بجے عربی پڑھنے جاتے۔چنانچہ نہایت محنت سے اچھے نمبروں میں امتحان پاس کیا۔پھر آپ نے سول سروسز کا امتحان بھی دیا۔آپ کا ارادہ تھا کہ امتحان کے بعد سول سروسز میں چلے جائیں گے لیکن ملک سے باہر جانے کا پروگرام بن گیا اور آپ نے پاکستان کو خیر باد کہہ کر مُستقل طور پر لندن میں رہائش اختیار کر لی اور پھر لندن میں Inner London Education) I.L.E.A Authority) کے تحت تدریسی میدان میں پھر کود پڑے اورمزید تعلیم جاری رکھتے ہوئے کئی کورسز کئے۔

رزقِ حلال کی تمنّا اور جستجو

محترم رشید احمد صاحب پولیس کے محکمہ سے مُنسلک تھے جہاں اوپر کی آمدنی کے مواقع بہت زیادہ ہوتے ہیں۔لیکن خدا تعالیٰ نے آپکو ہمیشہ رزقِ حلال کھانے کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ نے بتایا کہ:

''جن دنوں مَیں مکان بنا رہا تھا پولیس کی نوکری کے علاوہ دو تین اور جگہ بھی کام کیا کرتا تھا تا کہ مکان کی تعمیر کا خرچہ ساتھ ساتھ نکلتا رہے۔''

یوں اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت چھوٹی عمر میں ہی والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی خدمت کا موقعہ فراہم کیا۔شاید اس وقت کی نیکیاں ہی تھیں جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین و دنیا میں عزت عطا کی۔الحمدللہ۔

خدائی نصرت اور سفرِ انگلستان

اخبارات میں لندن میں کام کرنے کے لئے اشتہار نکلتے رہتے تھے چنانچہ آپ نے بھی درخواست دے دی۔ رشید صاحب کو لندن کا ویزا اور ووچر مل گیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور حضور کی دعاؤں سے سفر کے مراحل جلد از جلد طے ہونے لگے اور پھر اللہ تعالی کے فضل سے لندن ہجرت کر گئے۔ محترم رشید صاحب نے ابتداء میں کچھ عرصہ معاشی تنگی اور بیکاری میں گذار دیا۔ Teaching کے محکمہ میں نوکری ملتی نظر نہ آتی تھی۔ ہم نے لندن شہر سے باہر رہائش اختیار کر لی اور آپ نے مختلف فیکٹریوں میں کام کیا۔ اسی قلیل آمدنی میں کھانا پینا اور پھر کچھ بچت بھی کرنا پڑتی تا کہ گرم کپڑے خریدے جاسکیں۔ اتنی کم تنخواہ میں کرایہ مکان نکال کر صرف beans یا دالیں کھا کر ہی گذارہ ہوتا تھا۔ لیکن جملہ مشکلات کے باوجود ہم لجنہ اور خدّام کے اجلاسات کے لئے بس کا کرایہ ادا کر کے لندن آتے تھے۔ اسی دوران کئی مرتبہ گھر تبدیل کئے۔ عرصہ چھ ماہ کے بعد جُز وقتی نوکری ملنی شروع ہوئی۔ I.L.E.A کا قانون تھا کہ پہلے ایک سال عارضی کام ملتا تھا۔ تقریباً نو ماہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ آخر ایک سکول میں تین ماہ کے لئے نوکری مل گئی۔ بعد میں اسی سکول میں پورے وقت کی نوکری مل گئی۔ الحمدللہ۔

جب دوسری بچی کی آمد کا وقت تھا تو ہم مسجد کے قریب منتقل ہو گئے۔ اس وقت ایک بیڈروم والے فلیٹ کا کرایہ 7 پاؤنڈ ہفتہ ہوتا تھا۔ ہماری بیٹی عزیزہ نینا قدسیہ جب 3 ماہ کی ہوئی تو رشید صاحب کو Norwood سیکنڈری سکول میں جگہ ملی۔ ہمارے پاس کار وغیرہ نہ تھی بس میں جانا ہوتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ سکول کے نزدیک کوئی فلیٹ ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ مطلوبہ علاقہ میں 5 penge پر Attic میں بنایا گیا ایک چھوٹا سا فلیٹ ملا۔ جس کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ کچن اور دو کمرے Attic میں تھے۔ ایک منزل نیچے غسلخانہ واقع تھا جبکہ سب سے نچلی منزل پر ٹائیلٹ تھی اور اس تک پہنچتے ہوئے پرانے زمانے کی spiral یعنی گول سیڑھیاں اترنی اور چڑھنی پڑتی

تھیں۔اس مکان میں ہم 6 ماہ ٹھہرے۔اس دوران عزیزم مسرور احمد کی آمد متوقع تھی۔اب چارہ نہ تھا کہ ہم اس مکان میں مزید رہتے 124 Murtan road پر basement flat خالی ہو گیا تو ہم دوبارہ مسجد فضل کے پاس نقل مکانی کر گئے۔

خدا تعالیٰ کے فضلوں کے نظارے

اسی دوران ہم نے تین چار گھر تبدیل کیا۔اس وقت تک ملازمت کو اتنا وقت گذر گیا تھا کہ ہم نے 1970ء میں اپنا گھر خریدنے کی تلاش شروع کر دی۔ان دنوں اسٹیٹ ایجنٹ کو مکان پسند آنے پر بقیہ کارروائی سے پہلے 100 پاؤنڈ دینا ہوتے تھے مگر ابھی تک ہمارے پاس یہ رقم جمع نہ ہوئی تھی۔انہی دنوں رشید صاحب کے دو دوست لاہور سے جرمنی اپنی ملازمت کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے۔جرمنی سے لاہور واپس جاتے ہوئے انہوں نے لندن میں ہمارے گھر ایک ہفتہ قیام کیا اور اپنی بچت کی رقم جو غالباً 500 پاؤنڈ تھی، رشید صاحب کے پاس رکھوائی۔غالباً بعد میں وہ رقم پاکستان منتقل ہونا تھی۔دورانِ گفتگو مکان کا تذکرہ ہوا کہ اگر ہمارے پاس ایک سو پاؤنڈ ہوں تو ہم اسٹیٹ ایجنٹ کو دے سکیں اور وہ ہمارے لئے مکان خریدنے کی کارروائی کو جاری رکھے۔اس پر ان دوستوں نے کہا کہ ابھی کچھ عرصہ ہماری رقم آپ کے پاس رہے گی، آپ اس میں سے لے کر خرچ کر لیں اور بعد میں ادا کر دیں۔اس طرح گویا یہ ایک غیبی مدد تھی۔ہمیں ایک نہایت باموقع جگہ Ridgmont Road S.W.18 پر مکان مل گیا یعنی ورنڈ ورتھ ٹاؤن ہال کے بالکل قریب۔اس مکان پر 30 پاؤنڈ کی قسط ہمیں ادا کرنا ہوتی تھی۔اس گھر میں دو منزلیں تھیں ہم نے اوپر کی منزل کو کرایہ پر اُٹھا دیا اور نچلی منزل میں خود رہائش اختیار کر لی۔یوں ہماری قسط ادا ہونے لگی۔جوں جوں حالات بہتر ہوتے چلے گئے، اوپر والے کمرے بھی ہمارے استعمال میں آنے لگے۔ہمارے اس گھر میں بابرکت ہستیاں آئیں۔حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب، حضرت صاحبزاد مرزا مبارک احمد صاحب، حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد

صاحب، حضرت مرزا عبدالحق صاحب قابلِ ذکر ہیں۔

رشید صاحب کے ذمّہ اخبارِ احمدیہ، کتابوں کی ترسیل اور بُک سٹال کا کام تھا۔ ہمارا گھر ہمیشہ کتابوں اور اخباروں سے بھرا رہا۔ ہر جگہ کتابوں کے بنڈل پڑے ہوتے تھے Agony of Pakistan کی 5 ہزار جلدیں بھی ہمارے اسی گھر میں تھیں۔ پھر ہمارا بیٹا عزیزم مشہود احمد قمر اسی گھر میں پیدا ہوا۔

1978ء میں صلیبی کانفرنس کے لئے تمام نمائش کا کام رشید صاحب نے محترم غلام چغتائی صاحب کے ساتھ مل کر کام کیا۔ بڑے بڑے سنہری رنگ کے گتوں پر مختلف تراشے لگا کر نمائش تیار ہوئی۔ ان گنت راتیں اس کام پر خرچ ہوئیں۔ اس وقت تک رشید صاحب کی والدہ بھی ہمارے گھر آ چکی تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی عزیزم ناصر احمد (افسر جلسہ سالانہ) بھی ہمارے ہاں رہائش پذیر تھے اور تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بچے بھی بڑے ہو رہے تھے، ہمارا مکان تنگ ہو رہا تھا۔ 1978ء میں میرے ابّا جان محترم کیپٹن ڈاکٹر بشیر احمد صاحب گول بازار ربوہ صلیبی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن آئے۔ مَیں نے دعا کے لئے عرض کیا۔ حضور اقدس حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی خدمت میں بھی دعا کی درخواست کی۔ ان تمام بزرگوں کی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ ضروریاتِ زندگی بڑھ جانے کے بعد بڑا گھر خریدنے کی سُوجھی تو خدا تعالیٰ نے غیبی مدد فرمائی اور Santos road 18 پر گھر کا سودا ہو گیا۔ الحمدللہ، اس گھر میں چار بڑے بڑے تہہ خانے تھے۔ فروری 1979ء میں ہم اس نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔ جب ہم اس نئے گھر کا سودا کر رہے تھے تو مَیں اس کے بڑے بڑے کمرے اور کشادہ سٹنگ روم دیکھ کر نیز قریب ہی مسجد اور سکول دیکھ کر خوش ہو رہی تھی جبکہ رشید صاحب تہہ خانے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کیونکہ اس وقت جماعت کو جگہ کی بہت ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ گھر خرید لیا گیا اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کو اس بارے میں لکھ دیا گیا۔ حضور بھی بہت خوش ہوئے اور آپؒ کی طرف سے ایک خط موصول ہوا کہ تمام تہہ خانوں کی لمبائی چوڑائی بتائیں۔ اس گھر میں دو دروازے تھے اس لئے

تہہ خانوں میں کتابیں رکھنے کے لئے پردہ کی بھی کافی آسانی تھی۔

ان دنوں رشید صاحب سیکرٹری تعلیم و تربیت، مینجر اخبارِ احمدیہ، سیکرٹری ساؤتھ فیلڈ ٹرسٹ (جو کہ سر ظفر اللہ خان صاحب کا قائم کردہ تھا) تھے نیز ان کے پاس کُتب سلسلہ کا کام بھی تھا۔ رشید صاحب اکثر اوقات مسجد میں گذارتے۔ محمود ہال میں سیڑھیوں کے نیچے جو سٹور روم تھا اس میں بھی کُتب سلسلہ رکھی گئی تھیں یہاں سے تمام دنیا میں کتابوں کی ترسیل کا کام ہوتا تھا۔ روزانہ رضا کاروں کی مدد سے بنڈل بنتے پھر Twilley street کے پوسٹ آفس میں پوسٹ ہونے کے لئے جاتے۔ عاجزہ کو اللہ تعالیٰ نے چار سال بطور صدر لجنہ لندن اور پھر آٹھ سال ریجنل صدر کے عہدے پر کام کرنے کا موقعہ دیا۔ 1979ء سے لے کر 1987ء تک جماعت کی کتب ہمارے گھر میں رہیں۔ اب بچّے بڑے ہو رہے تھے۔ انکی یونیورسٹی کے اخراجات بہت زیادہ ہو رہے تھے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ ہم basement flat بنا کر کرایہ پر اُٹھا دیں تا کہ بچّوں کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ سب سے بڑا مسئلہ کتابوں کا تھا۔ ہمارا گارڈن کافی بڑا تھا جس میں ہم نے بہت بڑا پُختہ اینٹوں کا شیڈ بنوایا اور اس میں کافی کتابیں منتقل کر دیں۔ جو بچ رہیں وہ جماعت نے ایک سٹور حاصل کر کے وہاں رکھوا دیں۔

اس عرصہ میں ہماری فیملی میں مزید دو بیٹیوں عزیزہ طیبہ عنبر اور عزیزہ طاہرہ ثمین کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ مکان مسجد سے قریب تھا مگر رشید صاحب کے کام سے بہت دور تھا اور کافی وقت لگتا تھا۔ اگر ہم اس علاقے میں جہاں ان کا کام تھا، گھر خریدتے تو ہمیں بہت فائدہ ہوتا کیونکہ وہاں مکانوں کی اتنی زیادہ قیمت نہ تھی اور قرض لینے میں I.L.E.A مدد کرتی تھی۔ لیکن ہم نے سوچا کہ نوکری پر جانا ضروری ہوتا ہے، انسان اپنی روٹین بنا لیتا ہے لیکن اگر ہم دور رہنے کے لئے چلے گئے تو مسجد کی دوری کی وجہ سے بچے نہ آ سکیں گے۔ ہم نے وقت کے ضیاع، تھکاوٹ اور ہر روز کے کثیر خرچ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسجد کے نزدیک گھر لینے کو ترجیح دی۔ الحمد للہ ہمارا فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے رزق میں بہت برکت پڑی۔

جماعتی وادبی خدمات

رشید صاحب کو جماعتی کام کرنے کا جنون تھا۔ یہ لگن آپ کے اندر بچپن سے ہی تھی۔ رشید صاحب نے اپنے محلہ سلطان پورہ میں اطفال الاحمدیہ کی تنظیم کے تحت مختلف عہدوں پر کام کیا اور بعدازاں مرکزیہ خدام الاحمدیہ لاہور میں بھرپور جماعتی خدمت کی توفیق ملی۔ ان کے ذمّہ حفاظت کا کام تھا۔ مختلف مواقع پر لاہور کے احباب کے ساتھ ربوہ جا کر بھی یہ فرض سرانجام دیا۔ 1953ء میں جب جماعت پر کڑا وقت تھا، آپ کو یہ فرض ادا کرنے کی خوب توفیق ملی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ، حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ، حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں خدمتِ دین کے مواقع میسر آئے۔ الحمدللہ۔

لاہور جماعت میں ان کی خدام کے اجتماعات اور جلسہ سالانہ کی ڈیوٹیوں اور ان کی ناظمِ عمومی کے عہدہ کی ذمہ داریاں بھی بہت تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ شادی کے بعد کوئی دن ایسا گذرا ہو کہ رشید صاحب کسی نہ کسی جماعتی کام کے سلسلہ میں باہر نہ گئے ہوں۔ زیادہ تر خطوط حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ (صدر خدام الاحمدیہ) کے ہوتے تھے۔ کبھی کسی کا کام ہوتا، کبھی کسی کا۔ کئی دفعہ مختلف لوگوں کے کاموں کے سلسلہ میں اور مختلف امور کے لئے جھنگ بھی گئے۔

12 دسمبر 1965ء کو ہماری شادی ہوئی تو خدّام الاحمدیہ لاہور کا رسالہ ''الفاروق'' اشاعت کے آخری مراحل میں تھا۔ رشید صاحب بھی بورڈ کے ممبر تھے۔ اتوار کو ہماری شادی ہوئی۔ ہم نے بُدھ کے دن گھر واپس ربوہ جانا تھا۔ رشید صاحب رسالے کے کام کے لئے مزید تین دن ٹھہر گئے۔ اُس زمانہ میں ہر گھر میں ٹیلیفون کی سہولت موجود نہ تھی۔ میَں اپنے والدین کو اطلاع نہ کر پائی۔ میرے والدین کے ہاں انتظار پریشانی میں تبدیل ہو گیا۔ جس دن ہم ریل کار میں صبح ربوہ پہنچے تو میرے ابا جان لاہور جانے کے لئے گاڑی پکڑنے والے تھے۔

جب رشید صاحب نے لندن میں رہائش اختیار کی تو سب سے پہلے آپ کو تربیت کا کام

ملا اوراس کے ساتھ ساتھ بُک سٹال پر بھی اپنی ذمہّ داریاں نبھاتے نظر آئے۔عید ہو یا جلسہ آپ کو بہت جلد گھر سے نکلنا ہوتا تھا۔

انگلستان میں خدام الاحمدیہ کے تحت جنرل سیکرٹری، ناظم اطفال اور سیکرٹری تعلیم و تربیت رہے۔ جماعت انگلستان میں بھی نائب جنرل سیکرٹری اور سیکرٹری تعلیم و تربیت کا کام بہت لمبے عرصہ تک کیا۔ دس سال تک اخبار احمدیہ کے مینجر رہے۔ پریس سیکرٹری کا کام ملنے کے بعد عرصہ دراز تک سیکرٹری تعلیم یو.کے کا عہدہ بھی نبھایا۔رشید صاحب کے مضامین لاہور رسالہ میں اکثر چھپتے رہتے تھے۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے خلافت کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی آپ کوتحریک کی تھی اور فرمایا تھا کہ آپ ادبی آدمی ہیں اور لندن میں محکمۂ تعلیم سے مُنسلک ہیں،آپ بچوں کے لئے کُتب لکھیں۔ یوں رشید صاحب نے کتب لکھنے کا کام شروع کیا اور پہلی کتاب Golden Deeds of Muslims کے نام سے شائع ہوئی جو بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ بعدازاں جب آپ کو Chairman Books Committee کا عہدہ دیا گیا تو یہ کتاب پھر دہرائی گئی اور حضوراقدسؒ نے اس کتاب میں کئی اصلاحات فرمائیں۔اس کتاب کا نام تبدیل کرکے Stories of Early Islam رکھا گیا۔Book of Religious Knowledge بہت زیادہ مقبول ہے ناصرات اور اطفال الاحمدیہ کے نصاب میں شامل ہے۔اس کا دوسرا ایڈیشن بہت ضخیم ہے یہ تیاری کے آخری مراحل میں تھا جب خدا تعالیٰ کے حضور بُلاوہ آ گیا۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

آپ رسالہ لاہور میں مستقل لکھنے والے تھے۔ رسالہ لاہور میں زیادہ تر مضامین تربیت کے موضوع پر لکھے۔نظمیں بھی لکھتے تھے مگر طبیعت میں جھجک بہت زیادہ تھی اس لئے سٹیج پر زیادہ نہ پڑھا۔تحریر نہایت خوشخط اور صاف تھی۔ پہلے ہمیشہ رف لکھنے کے عادی تھے بعدازاں اس کو خوشخط لکھتے۔ رشید صاحب کی طبیعت میں بہت قناعت تھی۔اپنے پورے تعلیمی کیریئر میں سکول کے بعد extra circulum کرنا پڑتا تھا جس سے ترقی کے مواقع میسر آسکتے تھے۔مگر آپ نے اس موقعہ سے کبھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ہمیشہ کہا کرتے:

''مَیں سکول ٹائم کے بعد کبھی نہیں ٹھہروں گا کیونکہ مَیں نے جماعت کا کام کرنا ہوتا ہے اور میرا حرج ہوتا ہے''

رشید صاحب نے لاتعداد مضامین لکھے لیکن کبھی بھی کسی خلیفۃ المسیح یا اپنے کسی دیرینہ دوست کی وفات پر ان کے بارے میں نہ لکھ پائے۔ نہ جانے رقیق القلب زیادہ تھے یا شاید اپنا بھی ذکر آتا ہوگا شاید یہی وجہ تھی۔ مَیں نے محترم ثاقب زیروی صاحب مرحوم ایڈیٹر رسالہ لاہور کی وفات پر بہت اصرار کیا کہ آپ ان کے بارے میں کچھ لکھیں، مگر آپ خاموش رہے۔ برطانیہ میں رسالہ لاہور کی ترسیل کی ذمہ داری رشید صاحب نے تادمِ مرگ ادا کی۔ ہر ہفتہ رسالہ لاہور کا بنڈل ہمارے ہاں آتا، پھر آپ برطانیہ کے تمام خریداروں کو خود بذریعہ ڈاک بھجواتے۔ بینک میں رسالہ کا حساب کتاب اور لین دین بھی انہی کی معرفت تھا۔ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود آپ نے محترم ثاقب زیروی صاحب کے ساتھ جو عہد کیا تھا اس کو خوب نبھایا۔ آپ کی وفات کے بعد مَیں نے چند ماہ رسائل پوسٹ کئے۔ پھر محترم ایڈیٹر صاحب نے یہ کام کسی اور کے ذمہ لگا دیا۔ رشید صاحب کی وفات کے بعد مَیں نے محترم ایڈیٹر صاحب لاہور کی خدمت میں لکھا کہ آپ مجھے رشید صاحب کے بقایا کے بارے میں آگاہ کریں تا ادا کیا جائے۔ اس پر یہ جواب مجھے موصول ہوا'' کہ رشید صاحب کے ساتھ حساب کتاب محض یادیں تھیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں'' بہر حال آپکی ڈائری میں جو بقایا لکھا ہوا تھا مَیں نے ان کو بھجوا دیا۔

رشید صاحب کی خوراک بہت سادہ تھی۔ گوشت کے شوقین نہ تھے۔ طبیعت میں سادگی بہت زیادہ تھی۔ خرید وفروخت میں ماہر نہ تھے۔ لطائف سنانے میں کمال حاصل تھا، اکثر لطائف سُنا کر محفل کو گُل وگلزار بنا دیتے۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے خُوب تھے۔ ان کو اپنے ساتھ مانوس کرنے اور ان کو خوش رکھنے کا ملکہ بہت تھا۔ شروع میں یہ معمول رہا کہ آپ سکول سے آئے کھانا کھایا پھر مسجد چلے گئے اور پھر رات کو وہاں سے دیر سے لوٹے۔ لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے لندن تشریف لانے کے بعد یہ معمول بدل گیا۔ سکول سے سیدھا مسجد چلے جاتے حالانکہ گھر راستہ میں

پڑتا تھا۔ وہاں سے دیر کے بعد گھر آتے اور پھر کھانا بھی دیر سے کھاتے۔ کھانے کے دوران اکثر خبروں کا وقت ہو جاتا یا فٹ بال کا میچ ہوتا جو آپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہی لمحات آپکی سارے دن کے بعد تفریح کے ہوتے تھے۔ مَیں یوں بھی تھکی ہوتی تھی۔ تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد اوپر جا کر سو جاتی۔ بچوں سے اکثر ہفتہ کے روز ہی ملاقات ہوتی۔

رشید صاحب کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی لندن آمد پر حضورؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کے ساتھ خدمت کی سعادت نصیب ہوتی۔ آپ روزانہ خطوط لاتے، ان کے خلاصہ جات وغیرہ تیار کرتے اور صبح اپنے سکول جانے سے پہلے دفتر میں دے کر جاتے اور اکثر حضور سے صبح صبح ملاقات ہو جاتی۔ حضور اقدس کے ساتھ جماعت کے افراد کی محفلیں بھی لگتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسی ہی ایک محفل کے دوران حضور اقدس نے رشید صاحب کو سُنہری رنگ کا پارکر کا پین دیا اور فرمایا کہ آپ لکھنے کا کام کرتے ہیں یہ پین آپ کے لئے ہے اور ساتھ ہی قرآن کریم کا ایک مخملیں ڈبہّ دیا اور فرمایا ''اس کو زیور سے بھر کر ناصرہ کو دینا''

خدمتِ دین کے بار بار مواقع اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی شفقت

1982ء میں جب سپین کی مسجد کا افتتاح ہوا تو رشید صاحب نے جماعت یُوکے میں قائم مقام امیر ہونے کی سعادت پائی۔

1984ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ لندن تشریف لائے۔ پھر 12 مئی کا دن آ گیا جس کے لئے رشید صاحب بے چین تھے۔ حضور اقدس نے دفتر میں بُلا کر رشید صاحب کو پریس سیکرٹری کا کام دیا اور ساتھ ہی ایک خوبصورت رائیٹنگ فولڈر پیڈ دیا۔ اس کے ایک کونے پر خود حضور نے رشید صاحب کا نام لکھ کر دستخط کئے فولڈر پر کاغذ لگا کر ''پریس ڈیسک'' لکھا ہوا تھا یوں پہلا پریس سیکرٹری ہونے کا اعزاز اپنے خدّام کو دیا۔ اس کے بعد رشید صاحب کا نام پریس سیکرٹری کی حیثیت سے جانا گیا نیز اولاد کے لئے بھی یہی نام بطور تعارف کے ہے۔ آپ کی

وفات کے بعد مَیں نے اس فولڈر کو محفوظ کر لیا کیونکہ میرے لئے یہ بہت بڑا سرمایہ ہے۔

1986ء کے جلسہ سالانہ پر حضور اقدس نے محترم رشید صاحب کو انٹرنیشنل پریس سیکرٹری کا عہدہ تفویض کیا۔ جب حضور اقدس تشریف لائے تو رشید صاحب محترم چوہدری ہدایت اللہ بنگوی صاحب کے ساتھ نائب جنرل سیکرٹری اور بطور سیکرٹری تعلیم و تربیت کام کر رہے تھے۔

1994ء کو M.T.A ٹیلیویژن کا اجراء کیا جانا تھا۔ اس کی تیاری بہت پہلے سے شروع ہو گئی۔ چنانچہ 1993ء میں محمود ہال میں ایم ٹی اے کی تیاری کے لئے دفاتر بننے شروع ہوئے تو سٹیج والا دفتر ٹرانسمیشن کے لئے لے لیا گیا اور پریس ڈیسک محمود ہال کے بائیں طرف منتقل ہو گیا۔ جماعتی ریکارڈ سیڑھیوں کے نیچے والے دفاتر اور سٹیل کی الماریوں میں محفوظ تھا جو محمود ہال میں رکھی گئی تھیں۔ جب ایم ٹی اے کے لئے سٹوڈیوز کی مزید ضرورت پڑی تو انہی دنوں Hardwick میں جماعت نے نئے دفاتر خرید لئے۔ پریس کا دفتر اور تمام ریکارڈ وہاں پر منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں جماعت نے Harwick کی بلڈنگ بیچ کر Dear Park Rd پر ایک بڑی عمارت خرید لی اور پریس ڈیسک وہاں منتقل ہو گیا۔ اس میں ایک بہت بڑا اسٹور فائلوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس سٹور میں جا کر پتہ چلتا ہے کہ اتنی بے شمار فائلیں بنانے کے لئے کس طرح دن رات کام ہوا۔ پریس میں کام کے دوران سالانہ سینکڑوں خطوط اور پریس ریلیز لکھی جاتیں۔ اہم خبریں جن کا جماعت سے تعلق ہوتا ان کے تراشے محفوظ کئے جاتے۔ آپکے ساتھ ایک مستقل ٹیم تھی۔ آپکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ آپ باقاعدہ انہیں ساتھ لے کر چلتے اور کام سکھاتے۔ جو خطوط دوسروں سے لکھواتے ان کو ہدایت تھی کہ لکھنے کے بعد فون پر سُنا دئے جائیں یا فیکس کر دی جائے تاکہ تصحیح ہو جائے۔ اس بات میں بہت محتاط تھے مبادا کوئی غلط بات جماعت کے متعلق نہ لکھی جائے اور جماعت پر حرف آئے۔

عراق کی جنگ میں حضور اقدس نے انہیں ایک اور ذمہ داری سونپی اور فرمایا کہ روزانہ حضور سے ہدایت لیں اور مختلف ٹیمیں بنا کر ان سے خطوط لکھوائیں۔ چنانچہ اس ضمن میں عاجزہ نے بھی

لجنہ کی چنیدہ عورتوں سے جو پہلے بھی خطوط لکھتی تھیں رابطہ کیا۔ رشید صاحب نے انہیں خاص ہدایات دیں اوران کی ٹیمیں بنائیں۔ان دنوں میں کچھ ایسا معمول تھا کہ سکول سے واپس آتے تو وہ وقت حضوراقدس سے ملاقات کا ہوتا۔حضوراقدس سے ہدایات لینے کے بعد فوراً مجھے ساتھ لے کر کسی نہ کسی نزدیکی لجنہ سے،جس سے پہلے وقت مقرّر کیا ہوتا تھا ملنے جاتے اور ہدایات دے کر واپس آتے ۔حضوراقدس نے بارہا فرمایا:

''رشید صاحب یہ لوگ جو کچھ کررہے ہیں کرنے دیں۔اصل کام تو آپ کررہے ہیں آپ دیکھیں گے کہ وقت آنے پر کیا نتائج ہوں گے،انشاءاللہ۔''

رشید صاحب ایک نہایت خاموش،محنتی اور بےنفس انسان تھے۔آپ کی زندگی کا مقصد خلیفۂ وقت کی اطاعت،کام،کام اور بس کام تھا۔

سیکرٹری تربیت یوکے ہونے کی وجہ سے اطفال کی پندرہ روزہ کلاس کے انچارج بھی ہوتے تھے۔سالہا سال تک یہ کلاسیں نہایت کامیابی سے چلیں۔اطفال اور خدام نے بہت فائدہ اٹھایا۔اس کے ساتھ آپ احمدیہ بک ڈپو کے انچارج بھی تھے۔آپ کے ساتھ خدا کے فضل سے ایک نہایت وفادار ٹیم بھی تھی۔جس میں محترم غلام محمد چغتائی صاحب مرحوم،محترم صادق صاحب اور محترم مرزا منان صاحب مرحوم کے نام سرِفہرست ہیں۔

مختلف مشنوں کے آرڈر پورے کرنے کے لئے تمام کتب کی ترسیل،تمام بل بنانے،وقت پر رقوم کا اندراج کرنا اور روزانہ بنڈل بنا کر پوسٹ کے لئے دینا ایک نہایت محنت طلب کام تھا جو باقی فرائض کے ساتھ آپ احسن طور پر نبھارہے تھے۔محترم رشید صاحب ''اخبار احمدیہ یوکے'' جو کہ ماہانہ پرچہ تھا،کے دس سال تک مینیجر رہے۔اپنی ٹیم کے ساتھ تو کام کرتے ہی تھے۔لیکن جب اخبار پوسٹ کرنے کا وقت آتا تو اکثر اوقات کام زیادہ ہونے کی وجہ سے اپنے گھر کی بیٹھک میں بھی بنڈل لے آتے اور بچوں کو بھی ساتھ ملا کر کام مکمل کرنے کی کوشش کرتے۔مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہیں جب بھورے رنگ کے کاغذ میں اخبار لپیٹ کر ہاتھ

سے پتے لکھے جاتے تھے۔ بعدازاں اخبار پولیتھین کے لفافوں میں بند کیا جانے لگا۔

7 جنوری 1994ء کو تاریخ احمدیت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ صبح الفضل انٹرنیشنل کا پہلا پرچہ ہاتھ میں آیا تو حضرت مسیح موعود کا الہام ''دیکھو میرے دوستو اخبار جاری ہو گیا'' اس دن پورا ہوا الحمد للہ۔ محترم رشید صاحب کو پہلا ایڈیٹر بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ **ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُعْطِيهِ مَنْ يَّشَاءُ۔**

اسی دن 7 جنوری 1994ء کو M.T.A. کا اجراء عمل میں آیا۔ یہ دو عظیم الشان کام ایک ہی دن میں عمل میں آئے جن کا فیض رہتی دنیا تک جاری رہے گا انشاء اللہ۔

رشید صاحب نے مولویوں کے سوالات کے جوابات، پاکستان میں احمدیوں پر مظالم پر کتب، سینکڑوں خطوط اور مضامین جماعت کے موقف پر لکھے۔ لیکن خود زیادہ سامنے نہ آئے کیونکہ حضور کا ارشاد تھا کہ کوشش کریں کہ آپ کا نام زیادہ سامنے نہ آئے۔ اس کے ساتھ بچوں کی کتابوں کی میٹنگز حضور کے ساتھ ہوتی رہیں۔ کتب چھپنے کا سلسلہ جاری تھا۔

محترم رشید صاحب نے باوجود اپنی انتہائی مصروفیت کے لجنہ کے ساتھ ہمیشہ تعاون کیا۔ شروع ہی سے محترمہ بیگم ڈاکٹر عبدالسلام آپ سے رہنمائی اور مشورہ لیا کرتی تھیں۔ اکثر دورہ جات کے لئے بھی لجنہ کو اپنی کار میں لے جایا کرتے تھے۔ عاجزہ کے پاس جنرل سیکٹری کا عہدہ تھا۔ مرکز ربوہ میں سالانہ رپورٹس شائع ہوا کرتی تھیں۔ انگلش میں ٹائپ شدہ رپورٹس بھجوانی پڑتی تھیں۔ وہ کام بھی رشید صاحب ہی کیا کرتے تھے۔ رشید صاحب نے لجنہ اور ناصرات کی تربیتی کلاسوں میں ہمیشہ بھرپور تعاون کیا اور ہماری کلاسوں کو کامیاب بنایا۔ 1985ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے اسلام آباد ٹلفورڈ میں لجنہ کی تین ہفتوں کی کلاس منعقد کرنے کا ارشاد فرمایا۔ اس کلاس میں یورپ کے دوسرے ملکوں سے بھی بچیاں آئیں۔ حضور اقدس نے محترم رشید صاحب کو سیکٹری تعلیم وتربیت ہونے کے ناطہ سے اس کلاس کا انچارج بنایا۔ ماہ اگست میں یہ کلاس منعقد ہوئی۔ رشید صاحب روزانہ اسلام آباد آتے کلاس کی رپورٹ لیتے اور لکھ کر آقا کی خدمت میں پیش کرتے۔

تازہ ہدایات لیتے اور لجنہ کو پہنچاتے۔ خدا کے فضل اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی رہنمائی سے یہ کلاس بہت کامیاب رہی۔ الحمدللہ۔

سفرِ کعبہ وروضۂ نبوی ﷺ اور سفر انڈیا و پاکستان

2002ء کا سال ہمارے لئے بہت مبارک تھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے عمرہ کی توفیق بخشی۔ 2004ء میں انڈیا اور پاکستان کا سفر کیا۔ قادیان کے جلسہ میں شرکت کی، دلّی آگرہ اور جودھ پور کی لمبی سیر کی۔ ہم نے قادیان سے بڑی گاڑی کرایہ پر لے لی تھی۔ اور تمام سفر گاڑی میں ہی طے کیا۔ ہمارے دو بچے عزیزہ عنبر اور ثمین اس سفر میں ہمراہ تھے۔ 29 دسمبر 2004ء کو ہم ٹیکسی پر ہوشیار پور روانہ ہوئے۔ یہاں سے سدھو صاحب کی گاڑی میں ہم 9 میل دور پھمبیاں گاؤں پہنچے جہاں آپ کا عظیم الشان استقبال ہوا۔ نمبردار صاحب گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ پھولوں کے ہار لئے ہوئے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے رشید صاحب کو پھولوں سے لاد دیا اور ایک گرم چادر تحفہ میں دی۔ وہ خوش تھے کہ گاؤں کا ایک مسلمان باشندہ تقسیم کے بعد پہلی دفعہ ملنے کے لئے آیا ہے۔ رشید صاحب گاؤں کی گلیوں میں پھرے اور ایک جگہ اپنے گھر کی نشان دہی کی۔ رشید صاحب کے دادا حضرت مولا بخشؓ صاحب بھی استاد تھے۔ انہوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ لڑکیوں کو پڑھنا چاہئیے گاؤں میں لڑکیوں کا سکول جاری کیا۔ بعد ازاں لڑکے بھی پرائمری تک اس میں پڑھتے رہے۔ لڑکیوں کا مڈل سکول شائد میٹرک تک پہنچا۔ دو بوڑھی عورتیں جن کو اپنے استاد کا نام یاد تھا، موجود تھیں۔ ان کے ساتھ فوٹو بھی اتروایا۔ ان میں سے ایک عورت کا بیٹا جالندھر میں ایڈووکیٹ ہے۔ اس نے نمبردار سے آپ کا نمبر لے کر آپ سے بعد میں بھی رابطہ رکھا۔ اس گاؤں کے لوگوں میں انتہا کی شرافت ہے۔ گاؤں کی مسجد جو رشید صاحب کے دادا نے ہی بنوائی تھی، اللہ کے فضل سے بالکل صحیح حالت میں ہے۔ اسی طرح اذان کے لئے لاؤڈ سپیکر لگا ہوا ہے۔ گاؤں والوں نے مسجد میں نماز پڑھنے کی جگہ اسی حالت میں رہنے دی

ہے۔ مسجد کے صحن میں ایک چھوٹا سا مندر بنا دیا ہے اور ساتھ ہی چھوٹا سا گوردوارہ۔ گویا ہر مذہب کے لوگ ایک ہی جگہ اپنی اپنی عبادت کر سکتے ہیں۔ رشید صاحب کے دادا جولائی 1947ء میں فوت ہوئے لیکن حالات کی وجہ سے جنازہ قادیان نہ لایا جا سکا۔ ان کا یادگار کتبہ بہشتی مقبرہ قادیان میں لگا ہوا ہے۔ رشید صاحب نے کہا کہ وہ مسجد میں سفیدی کروانے کے لئے پیسے دے دیتے ہیں لیکن نمبردار صاحب نے کہا کہ وہ خود کروالیں گے۔ بعدازاں انہوں نے فون پر رشید صاحب کو بتایا کہ سفیدی ہو گئی ہے۔ گاؤں میں پھرنے کے بعد سدھو صاحب کے گھر واپس پہنچے۔ انہوں نے پرتکلف کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ 4 اور صحافی بھی مدعو تھے۔ انہوں نے رشید صاحب کا انٹرویو لیا اور اگلے دن کی اخباروں میں تصویروں کے ساتھ بہت اچھی خبریں شائع ہوئیں۔ پھر ہم اس مکان میں بھی گئے جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے چلہ کاٹا تھا۔ وہاں نوافل پڑھنے کی توفیق ملی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ اس سفر میں میرا درویش بھانجا بھی ساتھ تھا۔ رشید صاحب بہت خوش تھے۔ میرے اور بچوں کے لئے بھی یہ ایک یادگار سفر تھا۔

بیماری

گردے میں پتھری ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے والد محترم چوہدری بشیر احمد صاحب بھی گردہ میں پتھری کی تکلیف سے ہی فوت ہوئے تھے۔ شادی کے چند ماہ بعد مجھے ان کی گردے کی تکلیف کا علم ہوا۔ لندن میں آکر فقط چند سال روزے رکھ سکے۔ گرمیوں کے لمبے دن تھے۔ روزے کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی ہو جاتی اور گردے میں درد شروع ہو جاتی۔ ایک دفعہ لیزر سے پتھری نکلوائی اس کے بعد ہومیو پیتھی سے آشنائی ہوگئی اور پھر حسبِ ضرورت دوائیاں دینے سے پتھری کی تکلیف نہیں ہوئی۔ 1985ء میں آپ کی آنکھ کا آپریشن ہوا۔ آپ کی نظر بہت اچھی تھی لیکن بلڈ پریشر کی دوائیاں کھانے سے نظر پر برا اثر پڑا۔ 1988ء میں بواسیر کا آپریشن ہوا۔ ان کی ڈائری سے پتہ چلتا ہے کے یہ تکلیف بھی ان کو ایلوپیتھی دوائیوں کے ردّعمل کے نتیجے میں ہوئی۔ دِل کے حملہ

کے وقت بھی یہی کچھ سننے کو ملا ورنہ رشید صاحب کا کولیسٹرول وغیرہ بالکل نارمل تھا۔

جس دن حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی وفات ہوئی اسی دن آپ پر گاؤٹ کا حملہ پاؤں کے انگوٹھے پر ہوا۔ چنانچہ حضورؒ کا چہرہ مبارک دیکھنے کے لئے بیساکھیوں کے سہارے گئے اور جنازے میں شامل ہوئے۔ یہ حملہ بھی پیشاب آور دوائی کی وجہ سے ہوا۔ آپ کو دل کے آپریشن کے بعد جو دوائیاں دی جاتی تھیں ان کے ساتھ پوٹاشیم کی کمی پوری کرنے کے لئے ایک کیلا ضرور کھانا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ جبکہ آپ بیمار تھے ہم ڈاکٹر کے پاس گئے۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں استفسار کرنے پر ڈاکٹر کے مونہہ سے ایسے الفاظ نکلے کہ ہمیں فوراً آپریشن کروانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر کے الفاظ یہ تھے: ''اس کے چھ بچے ہیں اور یہ اب ایک بوڑھا گھوڑا ہے۔ اب تم اس سے اور کیا امید لگائے بیٹھی ہو'' بات کا لب لباب یہ تھا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں تم اب اور کیا چاہتی ہو۔ ہم دونوں بہت پریشان گھر آئے۔ حضورِ اقدس کو رشید صاحب کی ڈاکٹر سے ملاقات کا علم تھا۔ محترم پرائیویٹ سیکرٹری نصیر قمر صاحب کا فون آیا کہ حضورِ اقدس ڈاکٹری رپورٹ کے بارے میں استفسار کر رہے ہیں۔ میں تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر کا جملہ دہرا دیا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ اگلے دن آقا نے غلام کو یاد کر لیا اور ساتھ ہی ڈاکٹر شبیر بھٹی صاحب کو بھی بلا لیا اور فرمایا کہ ہم نے رشید صاحب سے بہت کام لینے ہیں۔ وقت ضائع نہیں کرنا اور یہ کہ پرائیویٹ طور پر دِل کا آپریشن کروانے کے لئے وقت لے دیں۔ ڈاکٹر شبیر صاحب نے دوڑ دھوپ کر کے دس دن کے اندر اندر ہی آپریشن کے لئے وقت لے دیا۔ سرجن ایک عراقی نژاد تھے۔

26 نومبر 1992ء کو حضورؒ کا میرے دعائیہ خط کے جواب میں ارشاد آیا کہ:

''میں رشید صاحب کیلئے بہت دُعا کرتا ہوں۔ صرف آپ کے خاندان کو ہی ان کی ضرورت نہیں، جماعت کو بھی ان کی بہت ضرورت ہے۔''

اس کے بعد میں نے تو یہی سمجھا کہ ہمارے لئے انکی زندگی بس اتنی ہی تھی (اس وقت وہ ۵۶ سال کے تھے)۔ بعد کی زندگی حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے جماعتی کاموں کے لئے مانگی ہے۔اس کے بعد میرے دل میں رشید صاحب کا عجیب طرح کا احترام پیدا ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ یہ شخص جماعت کا سرمایا ہے اور اسی کے لئے ہر آن زندہ رہنا ہے۔ پرائیویٹ آپریشن ہونا تھا جس کے لئے خطیر رقم درکار تھی۔ میں دعا کے لئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی تو انہوں نے فرمایا:

''ناصرہ پیسوں کی فکر نہ کرنا ضرورت ہو تو مجھے بتانا''

حضورؒ کو چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں نے عرض کی حضور انتظام ہو جائے گا انشاءاللہ۔آپریشن کے بعد گھر تشریف لائے ہسپتال سے واپس آئے تو کار چلاتے ہوئے مجھے یہ احساس تھا کہ میں اپنے خاوند کو ہی واپس لے کر نہیں جا رہی بلکہ جماعت کا ایک نہایت قیمتی سرمایا بھی ساتھ لے کر جا رہی ہوں جس کو با حفاظت پہنچانا میرا فرض ہے۔

گھر پہنچتے ہی میں نے حضورِ اقدس سے پرائیویٹ سیکرٹری کے توسط سے بات کی۔حضور کو خوش خبری دی کہ الحمدللہ گھر واپس آ گئے ہیں۔حضور نے رشید صاحب سے خود بات کی اور فرمانے لگے آپ کی بیٹی (ثمین) کا کیا حال ہے۔اسے مجھ سے ملوانا۔اس کے چہرے پر جو پریشانی تھی وہ مجھے نہیں بھولتی۔(ان کے ہسپتال کے قیام کے دوران ایک دن چار بجے کے قریب جب میں حضور سے ملنے گئی تو یہ بچی ساتھ تھی) آپریشن کے بعد طبیعت سنبھلتے سنبھلتے کافی دیر لگ گئی۔ ماہ مئی میں اپنا کام کرنے کے قابل ہوئے۔

مجھے ان کے پہلے ہارٹ اٹیک کی صحیح تاریخ یاد نہیں۔اگر وقت نکال کر ڈائریاں دیکھوں تو شائد پتہ لگ جائے۔لیکن اتنا یاد ہے کہ جلسہ یو کے سے چند ہفتے پہلے اپنے دفتر میں طبیعت خراب ہوئی۔تھوڑی دیر وہاں فرش پر ہی لیٹ گئے۔اتفاقاً دفتر میں اس وقت اور کوئی بھی نہیں تھا۔تھوڑا وقت گزرنے کے بعد کار چلا کر خود ہی گھر آ گئے۔لیکن طبیعت میں بے چینی بہت تھی۔ بہت مشکل سے ایمبولینس بلوانے دی۔کوئین میری ہسپتال لے کر گئے۔وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہلکا سا دل

کا حملہ ہے۔ان کو کبھی بھی دل کے حملے کے دوران درد محسوس نہیں ہوئی اس لئے اس موذی مرض کا پتہ ہی نہ چل سکا۔انہوں نے صرف دو ہفتہ آرام کیا اور پھر جلسہ سالانہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔لیکن طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی۔ان دنوں حضور اقدسؒ نے الفضل انٹرنیشنل کے اجرا کی تیاری کی لئے کہہ دیا تھا اور اس سلسلہ میں حضور سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔حضور اقدسؒ کی دوائیں اور دعائیں شاملِ حال تھیں۔

آخری علالت

رشید صاحب کا ہر چھ ماہ کے بعد میڈیکل چیک اپ ہوتا تھا۔ستمبر میں روٹین چیک اپ کے لئے گئے تو ڈاکٹر نے کہا کہ آپ ہسپتال میں داخل ہو جائیں تا کہ دوائیاں وغیرہ دوبارہ چیک ہو جائیں۔کافی متردّد بھی ہوئے۔لیکن ڈاکٹر کے کہنے پر داخل ہو گئے کتاب "Religions Knowledge" آخری مراحل میں تھی۔حضرت عائشہؓ پر بھی کتاب لکھنے کا کام جاری تھا۔حضورِ اقدس کے دورۂ قادیان سے چند دن پہلے حضور سے ملاقات کی اور کسی نئے پلان پر بات بھی کی۔

۲۶ دسمبر کی صبح اٹھ کر نہائے ناشتہ کیا اور جلسہ کی کاروائی MTA پر سنی۔حضورِ اقدس کی تقریر کے نوٹس بھی لئے۔ ۲۷ دسمبر کو ڈاکٹر صاحب پھر خود ہی دیکھنے آ گئے۔چیک اپ کے بعد کہنے لگے کہ طبیعت آگے سے کافی بہتر لگ رہی ہے۔اس دن اپنی لائبریری میں بیٹھ کر پریس ریلیز بنائی۔اور گھر سے تمام اخباروں کو فیکس کی۔۲۸ دسمبر کو صبح نچلی منزل پر آئے۔۲۹ دسمبر کی صبح اخباریں منگوائیں۔ان کی پریس ریلیز چھپ چکی تھی۔پھر طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔چند منٹوں میں خود ہی کہا کہ ایمبولینس بلا لو۔فوراً ایمبولینس بلوالی۔خود ہی سلیپر پہن کر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔عزیزم مسرور ساتھ تھا۔ایمبولینس میں بیٹھتے ہی مسرور نے محسوس کیا کہ ابو کا ہاتھ نیچے لٹک گیا ہے۔فوراً ٹریٹمنٹ (Treatment) دی اور آکسیجن وغیرہ دے کر ہسپتال کے لئے روانہ

ہو گئے۔ جب ہسپتال پہنچی تو معلوم ہوا کہ گردوں میں پوٹاشیئم کی سطح 9 تک پہنچی ہوئی ہے۔ ابھی 15 منٹ ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ ٹیکہ کے اثر سے دل چلا تھا لیکن اب کوئی رسپانس نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ تقریباً رات آٹھ بجے 29 دسمبر 2005ء کو اپنے پیارے مولا کے حضور حاضر ہو گئے۔

5 جنوری 2006 کو دوپہر کے وقت جنازہ مسجد فضل لندن میں ہوا۔ اسی روز بروک وڈ قبرستان میں قطعہ موصیان میں تدفین عمل میں آئی۔ بعد ازاں حضورِ اقدس نے بھی نماز جنازہ غائب پڑھائی اور اس طرح ایک ایسا انسان جس نے اپنا کیرئر ایک سپاہی کی حیثیت سے شروع کیا تھا، ساری عمر قلم کا جہاد کرتے ہوئے اپنے مولا کے حضور حاضر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہزار رحمتیں نازل فرمائے جانے والے پر آپکے درجات بلند کرے۔ اور آپکی اولاد کو نیکی کے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

رشید صاحب کی وفات کے بعد قلم اٹھانے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ بار بار مجھے کہا جاتا کہ کچھ لکھوں۔ لیکن دماغی کیفیت ساتھ نہ دیتی تھی۔ اب تو میں اپنے آپ کو ان کا مجرم سمجھتی ہوں کہ خلافت کے سو سالہ جشن کا سال گزر گیا اور وہ شخص کہ جو خلافت کا عاشق تھا اور جسے محض خدا کے فضل سے چار خلفاء کے ساتھ کام کرنے کی توفیق حاصل ہوئی اور جب بھی پکارا گیا یہ ادنیٰ غلام کمرِ ہمت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ہمت اور سعادت خوش نصیبوں کو ملتی ہے، ان کو بھلانا نہیں چاہئے۔

بھائی جان رشید ادبی ذوق کے مالک تھے۔ ان کی تحریر کردہ مندرجہ ذیل غزل کے اشعار مَیں سمجھتی ہوں کہ ان کی ذات پر ہی پُورے اترتے ہیں:

کیا بات کر رہے ہو اس رجلِ رشید کی
لو آج یارو وہ بھی جہاں سے چلا گیا
اُف بھی نہ کی کسی نے نہ ہی آہ تک بھری
یاروں نے دوستی کا ہے یوں بھی صلہ دیا

آیا نہ کوئی فرق زمانے کی چال میں
کہنے کو آج لعلِ بد خشاں چلا گیا
یوں جا رہے ہیں لوگ میرے دَور کے سبھی
ایسے لگا کہ جیسے کوئی قافلہ گیا
تنہائیوں میں یاد جب آئی تیری رشید
چُپکے سے رو دیئے جو نہ ہم سے رہا گیا

(رشید احمد چودھری لندن)

منیر الحق رامہ (المعروف نعیم بھائی)

آپ ہماری بہن نادرہ یاسمین کے پہلے خاوند تھے اور ہماری پھوپھی کی پلوٹھی اولاد تھے۔ 24/اکتوبر 1944ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آپ کے والد محترم عبدالحق رامہ صاحب ملٹری میں اکاؤنٹس کے محکمہ میں کنٹرولر آف نیول اکاؤنٹ پر فائز تھے۔ کراچی میں آپ نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی آپ کی عمر دس برس کی تھی تو والد صاحب کی عمر ریٹائرمنٹ تک آ پہنچی۔ چنانچہ 1954ء میں آپ ریٹائر ہوئے اور پھر والد صاحب زندگی وقف کر کے بمع اہل و عیال ربوہ آ گئے۔

محترم منیر الحق نعیم بھائی کی خاموش، سادہ، اور حسّاس طبیعت تھی۔ لوگوں سے کم ہی ملتے تھے۔ دراز قد، اچھی صحت اور سُلجھا ہوا مزاج تھا۔ فضول ہنسی مذاق کو پسند نہ کرتے تھے۔

محترمہ نادرہ یاسمین اہلیہ منیر الحق رامہ صاحب بیان کرتی ہیں:

''میری شادی مارچ 1976ء میں اپنی چھوٹی پھوپھی کے بڑے بیٹے منیر الحق رامہ کے ساتھ ہوئی۔ شادی کے ٹھیک دس سال کے بعد پونے دو ماہ بیمار رہنے کے بعد اس دارِ فانی کو چھوڑ کر اس مالک حقیقی سے جا ملے۔ دس سال کی شادی شدہ زندگی تو بہت ہی مختصر ہوتی ہے۔

ہمارا بڑا بیٹا پونے دو سال کی عمر میں ایک حادثہ میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد تین بچے ہوئے جو باپ کی وفات کے وقت بہت چھوٹے تھے۔ آپ کے والد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ کے حکم پر ربوہ آ گئے اور صدر انجمن احمدیہ میں بطور ناظر بیت المال کے طور پر خدمت انجام دینے لگے۔ نعیم اس وقت پانچویں میں پڑھتے تھے۔ کہاں کراچی جیسا شہر اور کہاں آباد ہوتا ہوا ربوہ، ابھی بجلی بھی نہیں آئی تھی۔ پھر کلاس میں ٹاٹ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنا سب کچھ بہت عجیب لگتا تھا۔ لکھائی اور ڈرائنگ میں کمال رکھتے تھے۔ نصرت گرلز سکول کے لئے چارٹ بنا کر دیا کرتے تھے۔ ایک سال میں بی ایس سی کر لی اور پھر باٹنی (Botany) میں ایم ایس سی کی۔ پڑھائی کے دوران پبلک سروس کمیشن (P.C.S) کا امتحان بھی پاس کیا لیکن کیریئر کا آغاز بالکل ہی اور طریق سے ہوا۔

آپ کو پیکو میں کام ملا اور بہت جلد جلد پروموشن ہونے لگی۔ مختلف ملکوں میں اس کمپنی کی طرف سے نمائشوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ بدقسمتی سے آپ کا مینیجنگ ڈائریکٹر بدل کر ایک اسلامی جماعت کا شخص مقرر ہو گیا۔ چنانچہ آپ کی پرموشن چھ سال تک نہ ہو سکی۔ پھر ایک نئی امریکن کمپنی میں آپ کو برانچ مینیجر کی حیثیت سے مقرر کیا جسے لگن اور محنت سے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ ان کی اس محنت کا ان کی کمپنی کو اس قدر احساس تھا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے جنرل مینیجر نے آپ کے چھوٹے بھائی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی وفات سے آپ کی فیملی کو تو نقصان پہنچا ہی ہے لیکن ہماری کمپنی کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔

انتہائی محنتی، ایماندار اور خلوص سے کام کرنے والے تھے۔ بالکل نئی جگہ تھی۔ انتہائی محنت سے صحت پر بھی بُرا اثر پڑا۔ شائد اسی کام کے دباؤ سے ایسی تکلیف ہو گئی۔ ورنہ Pancrias کی تکلیف عام طور پر صحت مند آدمیوں کو نہیں ہوتی۔

خاوند ہونے کے لحاظ سے لکھوں تو انتہائی تعاون کرنے والے تھے۔ آپ کے کھانے، پینے، سونے اور اٹھنے کی اپنی عادت تھی جس کو آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ طبیعت میں ترتیب بہت تھی۔

ذراسی بے ترتیبی برداشت نہیں کرتے تھے۔ کپڑوں پر کوئی سلوٹ نہ ہو۔ بہت نفیس ذوق تھا۔ مجھے کسی تقریب میں جانا ہوتا تو خود میرے کپڑوں کا انتخاب کر کے اور استری کر کے رکھ دیتے۔

گھر کے کاموں میں بہت تعاون کرتے تھے۔ اگست 1984ء میں آپ کے بھائی حمید سویڈن چلے گئے اور پھر مئی 1985ء میں آپ کی بہن باجی رفیعہ بھی امریکہ چلی گئیں۔ چنانچہ پھوپھی جان اپنے ربوہ والے گھر میں اکیلی تھیں۔ نعیم نے کوشش کی کہ وہ ہمارے پاس لاہور آجائیں۔ لیکن آپ کا دل اپنے گھر کو چھوڑنے کے لئے نہیں مانتا تھا بار بار اصرار کے بعد نعیم نے کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن پھر ہر ویک اینڈ پر ربوہ چکر لگا آیا کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد پھوپھی جی نے امی سے بہت دکھ کے ساتھ اظہار کیا کہ مجھے کیا پتہ تھا کہ میرے بچے نے اتنی جلدی دنیا سے چلے جانا ہے، کیوں نہ میں اس کے پاس رہنے کے لئے چلی گئی!

اچانک بیماری کا آغاز ہوا۔ Pancrias کی تکلیف تشخیص ہوئی تھی۔ پھر آپریشن ہوا۔ ایک لمبا عرصہ نہایت تکلیف دہ عمل سے گذرتے ہوئے ایک دن صبح سوا پانچ بجے آخری سانس کے ساتھ روح جسم کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ خدا آپ کی مغفرت کرے اور آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔

آپ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد میری چھوٹی بہن امۃ الاخر نے خواب دیکھا کہ نعیم مجھے کہہ رہے ہیں کہ تمہارے پاس بہت پیسہ ہے، لاؤ مجھے تین ہزار روپے دے دو۔ یہ خواب سن کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ شائد ان کا چندے کا کچھ بقایا ہے۔ جب معلوم کیا تو ان کا 2800 روپے بقایا تھا۔ میں نے چھوٹی آپا حضرت مریم صدیقہ سے اس خواب کا اور بقایا چندے کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ اب چندہ نہ دو بلکہ اتنی رقم کسی ضرورت مند کو صدقہ دے دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ خدا تعالیٰ نہیں چاہتا تھا کہ ان پر کوئی قرض رہے اور اللہ کے فضل سے میرا بھی ایسا انتظام ہو گیا کہ مجھے پھر کبھی پیسوں کی کمی نہ آئی۔

نعیم صاحب کی وفات کے بعد میری بہن نادرہ کی شادی ان کے چھوٹے بھائی عبدالحمید

صاحب رامہ سے ہوگئی۔ آپ کے بارے میں ان کے برادر اصغر محترم عبد الحمید رامہ صاحب جرمنی بیان کرتے ہیں:

''جب آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے باٹنی میں ایم ایس سی کیا تو پھر ایک دن حضرت میاں طاہر احمد صاحب (خلیفۃ المسیح الرابعؒ) نے محترم بھائی جان کو کہا کہ اب کچھ وقت جماعت کو دیں۔ آپ نے فوراً لبیک کہا۔ چنانچہ میاں صاحب نے آپ سے کہا کہ آپ غلام مصطفےٰ کھر صاحب (سابق گورنر پنجاب) کے پاس چلے جائیں اور ان کے ساتھ بطور پرائیویٹ سیکرٹری کام کریں۔ لیکن آپ کو تنخواہ نہیں ملے گی۔ آپ کو رضا کارانہ طور پر ان کے ساتھ کام کرنا ہے۔ چنانچہ بھائی جان تقریباً اڑھائی سال تک کھر صاحب کے ساتھ کام کرتے رہے۔ لیکن ایک بات جو آپ کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے کہ آپ نے اس دوران میں اپنی حیثیت کا ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ میں نے اپنے آپ کو جماعت کے لئے وقف کیا ہے اگر میں یہاں سے ذاتی فائدہ اٹھاؤں گا تو پھر اس میں میری ذات شامل ہوجائے گی اور وقف کی روح ختم ہوجائے گی۔ ۱۹۷۴ء میں میاں صاحب کے کہنے پر کھر صاحب کا ساتھ چھوڑا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت جلد لاہور میں ہی پیکو انڈسٹری (سہراب سائیکل ورکس) میں ایکسپورٹ ڈویلپمنٹ آفیسر کے طور پر جاب مل گئی۔ اس ملازمت کے دوران مختلف ملکوں میں جانے کا موقع ملا۔ اس میں ایران، اٹلی، ترکی اور دوبئی وغیرہ مجھے یاد ہیں۔ تقریباً تین سال اس فرم میں کام کیا اور پھر کاکس اینڈ کنگز جس کا ہیڈ آفس کراچی میں تھا، اس کی لاہور کی برانچ کا چارج سنبھال لیا اور پھر تادمِ پسیں تک وہیں کام کرتے رہے۔

بھائی جان کی شخصیت میں جو سب سے نمایاں چیز تھی وہ ان کا مخلص ہونا تھا۔ ماں باپ بہن بھائیوں رشتہ داروں اور دوستوں سے انتہائی مخلص تھے۔ کبھی کسی کو دانستہ تکلیف نہیں پہنچائی۔ ابا جان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ کبھی میں نے یہ نہیں دیکھا کہ ابا جان نے کوئی بات کہی ہو اور انہوں نے وہ نہ مانی ہو۔

انتہائی فراخ دل تھے۔ساری عمر یہ معمول رہا کہ ہر ماہ ایک مخصوص رقم والدین کی خدمت میں لازمی پیش کی۔اپنی خواہشوں کو ہمیشہ دوسروں کے لئے قربان کیا۔مجھے یاد نہیں کہ اگر ضرورت پڑنے پر میں نے کبھی ان سے کچھ مانگا ہو تو انہوں نے انکار کیا ہو یا اس کے بدلہ میں کبھی کوئی صلہ مانگا ہو یا کبھی جتایا ہو۔لیکن اگر میں نے کبھی کوئی خدمت کی تو ہمیشہ بڑی فراخدلی سے تعریف کی۔ ایک دفعہ مجھے لاہور سے ربوہ ان کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ان کی فیملی بھی ساتھ تھی۔میں نے سب کے لئے بس کی ٹکٹیں لے لیں۔جب ان کو معلوم ہوا تو بار بار میری تعریف کرتے جاتے۔گھر جا کر امی سے بھی ذکر کیا اور میں اپنی جگہ شرمندہ کہ ہمیشہ مجھ پر احسان کرتے رہے۔آپ کی بعض خدمات کا علم مجھے آپ کی وفات کے بعد آپ کے خط سے ہوا۔ہمیشہ دل میں حسرت رہی کہ خدا مجھے اس قابل کر دے کہ آپ کی کوئی خدمت کر سکوں۔لیکن شاید خدا کو یہ منظور نہ تھا۔جب پہلی بار میں اس قابل ہوا کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں تو میری بھیجی ہوئی رقم کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے اصلی مالک کے حضور حاضر ہو گئے۔بس یہی دکھ تڑپاتا ہے کہ آپ کی کچھ بھی خدمت نہ کر سکا۔

انتہائی علمی مذاق رکھتے تھے۔مطالعہ بہت وسیع تھا۔انگلش زبان پر بہت عبور حاصل تھا۔ انگریزی لٹریچر پر گہری نظر تھی۔اپنا فارغ وقت ہمیشہ معیاری کتابوں کے مطالعہ میں گزارتے تھے۔فضول بیٹھ کر گپیں ہانکنا بالکل پسند نہ تھا۔زیادہ بولنے کی عادت نہ تھی لیکن جب بھی گفتگو کرتے تو ہمیشہ اچھے موضوعات پر بات کرتے۔آپ سے بات کر کے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے اندر کتنا علم بھرا ہوا ہے۔

انتہائی صابر تھے۔آپ کا بڑا بیٹا جو کہ اس وقت اکلوتا تھا، حادثہ میں فوت ہو گیا۔انتہائی صبر سے اس صدمے کو برداشت کیا۔رات کو اس کی لاش لے کر گھر پہنچے۔انتہائی حوصلہ سے امی اور ابا جان کو تسلی دیتے رہے۔اپنے غم سے زیادہ یہ فکر تھی کہ والدین کو سنبھالوں۔انتہائی حوصلہ سے جگر کے ٹکڑے کو اپنے ہاتھوں سے آخری مقام تک پہنچایا۔اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رحمتوں کی چادر میں لپیٹ لے اور آپ کی اولاد کا خود حامی و ناصر ہو آمین۔

حضرت مرزا عبدالحق صاحبؓ صوبائی امیر سرگودھا

حضرت مرزا عبدالحقؓ صاحب سے ہمارا خاندانی تعلق اس وقت ہوا جب آپ نے اپنے بیٹے کا رشتہ ہماری بہن باجی فاخرہ کے لئے مانگا۔اس تعلق پر ہم جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔دنیا میں ایسے وجود کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔مَیں جب بھی آپ سے ملی آپ کو اخلاق کے اعلیٰ درجہ پر فائز پایا۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جب بھی ہم آپ کے ہاں گئے آپ اپنے کمرے سے نکل کر آتے اور یوں خوش آمدید کہتے جیسے وہ پہلی مرتبہ کسی پیارے عزیز کو مل رہے ہیں۔اس وقت ہم کم عمر تھے لیکن وہ ہم بچوں کے ساتھ بالکل بچگانہ مزاج کی باتیں کیا کرتے تھے۔ہم آپ کو ہمیشہ اباجان کہہ کر پُکارتے تھے اور وہ ہمیں بیٹی بیٹی کا پیارا لقب دیا کرتے تھے اور نہایت بے تکلف ماحول میں گفتگو کرتے۔آپ کے ساتھ ہمارا اتنا پیار تھا کہ اپنے بہنوئی کے متعلق بھی جا کر ان کو شکایت کرآتے تھے۔وہ نہ صرف سُنتے بلکہ ہماری شکایت کا ازالہ بھی کرتے تھے۔

ہمارے والدین کی ایک نمایاں صفت بزرگوں کا احترام اور محبت تھی۔اُنہوں نے حضرت مرزا عبدالحق صاحب کی اتنی عزت وتکریم کی کہ باجی سے شادی کے کچھ عرصہ کے بعد وہ جب بھی ربوہ آتے ہمارے ہاں ٹھہرتے۔ایک دفعہ انہوں نے بتایا کہ جماعت ہر سال ہر موقعہ پر میرے قیام کے لئے ربوہ میں بہترین کمرہ مختص رکھتی ہے لیکن مَیں ڈاکٹر صاحب کی محبت کو نہیں بُھلا سکتا۔قربت داری کا حق انہوں نے تا دمِ آخر نبھایا۔حقیقت یہ ہے جس سے انکار بے انصافی ہوگی کہ ہم دونوں گھروں کے تعلقات کے بارے میں تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی رہی۔محبت کی زنجیر کا ایک سِرا حضرت اباجان کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا سرا ہمارے والدین تھامے ہوئے تھے۔کڑیاں ملتی رہیں اور اس تعلق میں پائیداری اور استحکام آتا رہا۔ہم بچے تھے جب آپ سے تعلق قائم ہوا، پھر ہم سب بہنیں رخصت ہو کر باہر چلی گئیں۔ہر مشکل کے وقت اپنے والدین کے علاوہ خلیفہ وقت اور حضرت مرزا صاحب کو دعا کے لئے درخواست کی جاتی۔ہم آپ کو کہہ کر یوں

لا پرواہ ہو جاتے جیسے یہ قرض انہی کو ہی چکانا ہے۔ وہ نام لے لے کر ہمارے لئے دعائیں کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعائیں ہمارے حق میں قبول فرمائے۔

لندن میں کئی سال متواتر آتے رہے اور ہماری بڑی بہن اہلیہ محترم چوہدری رشید احمد صاحب کے ہاں قیام کیا۔ حالانکہ جماعت کی طرف سے یہاں بھی بطور مہمانِ خصوصی پذیرائی ہوتی مگر انہوں نے عزۃ داری کو کبھی نہ بھلایا۔ 1999ء میں آپ میرے ہاں اور میری بہن نبیلہ کے ہاں تشریف لائے۔ حضور سے اجازت لینے کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے جماعت کی مہمان نوازی کی پیش کش کی، مگر آپ نے فرمایا کہ مَیں اپنے عزیزوں کے ہاں ٹھہروں گا۔ پھر کئی دن تک آپ ہمارے ہاں ٹھہر کر ہمیں اپنی پاکیزہ صحبت کا لطف پہنچاتے رہے۔ جتنے دن ان کا قیام تھا ان کی امامت میں نماز با جماعت ہوتی رہی۔ درس و تدریس، نصائح، علمی گفتگو اور فقہی مسائل پر بحثیں ہوتی رہیں۔

جب حضرت مرزا عبدالحق صاحب ہمارے پاس سویڈن آئے ہوئے تھے، ان کو ناروے جانے کے لئے ویزہ کی ضرورت تھی۔ ویزہ کے فارم پر آمدن لکھنا مقصود تھی۔ آپ نے میرے میاں سجاد صاحب سے فرمایا کہ 800 ڈالر ماہوار لکھو۔ اس پر ویزہ آفس کی سیکرٹری بھی بہت حیران ہوئی۔ کبھی وہ فارم پر دیکھے اور کبھی اس دیسی وضع کے بوڑھے کو دیکھے، جس نے پنجابی شلوار، قمیص اور سر پر کُلّے والی دستار پہن رکھی تھی۔

سال 1998ء کی بات ہے کہ آپ کا پوتا عزیزم نوید احمد میرے ہاں سویڈن میں سیاسی پناہ کے لئے آیا۔ ایک مرتبہ وہ بہت گھبرایا تو آپ نے اس کو پیار بھرا خط لکھا۔ ان کا مکتوب درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرے پیارے بیٹے نوید احمد سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت بھرا خط ملا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے آپ کی تکلیف اور پریشانی دور فرمائے اور آپ کے لئے دین اور دنیاوی ترقیات کے راستے کھولے اور اپنے فیوض و برکات سے بھر دے۔

گھبرانے کی بجائے آپ نمازوں میں دعاؤں کی طرف توجہ رکھیں۔ ہمارا خدا بڑا رحیم وکریم اور قادر ہے۔ وہ سب مشکلات کو لمحوں میں دور کر سکتا ہے۔ تہجد کی نماز بھی اگر باقاعدگی سے پڑھیں تو بہت اچھا ہو۔ اس میں بڑی برکتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو۔

والسلام آپ کا دادا

عبد الحق

میرا حضرت مرزا عبد الحق صاحبؓ کے ساتھ فون پر رابطہ رہتا۔ مَیں ان کو دعا کے لئے عرض کیا کرتی۔ آواز سُنتے ہی پہچان لیتے۔ آخر عمر میں جب آپ بہت کمزور ہو چکے تھے مَیں نے ان کا حال پوچھنے کے لئے فون کیا۔ آپ نے فون اٹھایا۔ مَیں نے اپنا تعارف کروانا چاہا مگر آپ فوراً بولے کہ مَیں نے پہچان لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آخری دنوں میں بھی ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ ہمارے ہاں جب بھی کوئی پریشانی ہوتی دعا کے لئے فوراً ان کو درخواست کی جاتی اور دل کا یہ حال تھا کہ ان کو کہنے کے بعد یوں محسوس ہوتا جیسے طبیعت سے بوجھ اتر گیا ہو۔ ایک مرتبہ مجھے خیال آیا کہ مَیں ان سے یہ پوچھوں کہ آپ نماز تہجد کس طرح ادا کرتے ہیں تا کہ میرے بچوں کے لئے ان کا خط بطور سند رہے۔ انہوں نے مجھے جو جواب دیا وہ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

عزیزہ محترمہ شاہدہ صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط ملا۔ مجھے بھی آپ سب خوب یاد آتے ہیں لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ زیادہ سفر اختیار نہیں کر سکتا۔ برطانیہ تو حضور ایدہ اللہ تعالیٰ اور جلسہ کی وجہ سے جانا پڑتا ہے لیکن اور کسی جگہ جانا مشکل نظر آتا ہے۔ یہی انسان کی حد بندیاں ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو بے شک ہر قدرت حاصل ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

آپ نے دعا کے متعلق دریافت کیا ہے۔ نماز ایک اعلیٰ درجہ کی دعا ہے بشرطیکہ سمجھ کر اور آہستہ آہستہ پڑھی جائے۔ مثلاً سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ کہے تو اللہ تعالیٰ کا ہر عیب سے پاک ہونا اور ہر تعریف کا مالک ہونا اس کی آنکھوں کے سامنے آئے۔ اس کی آسمان وزمین کی پیدائش اپنے اندر کسی قسم کا نقص نہیں رکھتی اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بے انتہا اور کامل صفات کا مالک ہے۔ اسے انسان بار بار دہرائے۔ پھر اگلی آیت پر آئے تو اس کے صحیح معنی دماغ میں لائے اور اسے بار بار دہرائے۔ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ میں اس کی صفات میں سب برکتیں ہیں۔ انسان کو سب کچھ وہیں سے ملتا ہے وغیرہ۔ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ کے بعد وَتَعَالٰى جَدُّكَ یعنی اس کی بزرگی اور شان بہت بلند ہے۔ اس نے کیا کچھ پیدا کر دیا اور کس آسانی سے کیا۔ آسمان وزمین کے پیدا کرنے کے لئے صرف اس نے اتنا کہا کہ ہو جا اور وہ اس کی تجویز کے مطابق ہونا شروع ہو گیا۔ اس شان کی انسان کو قطعاً سمجھ نہیں آسکتی۔ صرف انسان کی پیدائش کو ہی دیکھیں۔ ایک نہایت باریک ذرہ سے جو خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتا اس کی ابتداء ہوئی اور ماں کے پیٹ میں ہی اس کو کس طرح بڑھایا اور اسے ایک بچے کی شکل دے دی اور پھر اس میں روح ڈال دی۔ اس سب صناعی کو دیکھ کر انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ پھر یہ دعا آگے چلتی ہے۔ اس کی اور صفات بیان کرتی ہے جو ہر ایک بڑی تشریح چاہتی ہے۔ پھر اِيَّاكَ نَعْبُدُ

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ آجاتا ہے۔ ایسا خدا ہی عبادت کے لائق ہے اور اس کی ہم عبادت کرتے ہیں لیکن اس سے عبادت کے لئے مدد چاہتے ہیں۔ عبادت میں اطاعت اور محبت دونوں شامل ہیں۔ اطاعت ایسی کہ ذرہ بھر اس کی نافرمانی نہ ہو اور پھر محبت ایسی کہ اس میں فنا کر دے۔ اس کی تشریح بہت لمبی ہے۔ اس کے بعد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے۔ اس میں انبیاء جیسا صدق وصفا اور محبت ووفا مانگتا ہے۔ اس دعا کے ہر حصّہ کو ہر بار پڑھتا اور آنسو بہاتا ہے اور خوب سجدہ ریز ہوتا ہے۔ اچھی طرح سے پڑھنے والا اور دو رکعتوں میں ایک گھنٹہ بلکہ بعض دفعہ اس سے بھی بہت زیادہ لگا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتا ہے کہ وہ اس کے گناہوں کو بخشے اور اس میں حقیقی پاکیزگی پیدا کرے۔

تہجد میں یہ طریق اختیار کیا جاتا ہے۔ فرض نمازیں تو انسان زیادہ لمبی نہیں پڑھ سکتا۔ دعا کے ساتھ انسانی روح پگھل کر خدا تعالیٰ کے حضور بہہ جاتی ہے اور یہی دعا کا مقصد ہے۔ یہ مختصر سا لکھا جا سکا ہے ورنہ حقیقت میں اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح نمازیں پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کے میاں کو اور بچوں کو محبت بھرا اسلام

والسلام　　خاکسار

عبدالحق

حضرت مرزا عبدالحق صاحبؓ ہماری دعوت پر میرے بھائی خالد منیر کے ساتھ سویڈن تشریف لائے۔ لندن سے روانہ ہونے سے پہلے آپ نے حضور سے اجازت لی تو حضور نے آپ سے پوچھا کہ آیا وہ جماعت کو کہیں کہ آپ کی رہائش کا انتظام کرے مگر حضرت مرزا عبدالحق صاحب نے حضور سے عرض کیا کہ مَیں اپنے عزیزوں کے ہاں جا رہا ہوں، مَیں وہیں ٹھہروں گا۔ ان کی یہ بات میرے دل کو بہت گرماتی ہے کہ انہوں نے ہمیں اپنا عزیز سمجھا اور سارا وقت ہمارے غریب خانے پر رہنے کو ترجیح دی۔

جب آپ سویڈن میں تھے تو مَیں ان کی دعائیں لینے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔عزیزہ رافعہ کی آمین کی دعا کرائی اور عزیزم باسط رحمان کی بسم اللہ کی دعا کروائی۔اس موقعہ پر آپ نے قرآن پاک پڑھنے اور اس کی فضیلت پر بہت پُراثر خطاب فرمایا۔اُٹھتے بیٹھتے ہم ان سے مذہبی مسائل پوچھتے رہتے۔ہم ان کے ساتھ دوستوں کی طرح مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتے۔

حضرت مرزا عبدالحق صاحب ؓ علم کے رسیا تھے۔دین کا علم اُنہوں نے بچپن سے سیکھنا شروع کیا مگر دنیا کے علوم میں بھی خوب دلچسپی تھی۔ایک مرتبہ آپ سے مَیں نے ایک مضمون کے بارے میں رہنمائی لی تو آپ نے مجھے بتایا کہ:''مَیں نے 40 سال کی عمر میں حضرت مسیح موعودؑ کی کئی کتب کا انڈیکس تیار کر دیا تھا۔''

اباجی کی وفات کے بعد ہمارے بھائی خالد منیر کی شادی تھی۔تشریف لائے اور فرمایا مجھے بتاؤ کیا کرنا ہے کونسی رسم ادا کرنی ہے مَیں اس میں شامل ہوں گا۔حالانکہ آپ رسومات کے قائل نہ تھے مگر آپ کو اباجی کی عدم موجودگی کا احساس تھا۔وہ ہمارے گھر میں باپ کی حیثیت رکھتے تھے اور آپ کو ہمارے جذبات اور اپنے مرتبے کی خوب پہچان تھی۔

آپ ہماری جماعت کا ایک حسین اور سنہری باب ہیں جس کی طوالت 105 برس ہے۔یہ عرصہ آپ کی دینی، علمی اور عملی سرگرمیوں سے بھرا رہا۔آپ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔شاید کتنے اور قلم آپ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر لکھنے کے لئے حرکت میں آئیں گے لیکن مَیں تو آپ کی اس محبت کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتی ہوں جو آپ کو ہم سے تھی۔ہماری ہر خوشی میں شامل ہوتے اور ہر غم کو بھی خاندان کے بڑے بزرگ کی طرح بانٹتے۔صرف ہم بہن بھائیوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہمارے خاوندوں اور پھر بچوں کے ساتھ بھی شفقت کا سلسلہ چلتا رہا۔

ان کے ساتھ گذرے ہوئے جلسہ سالانہ کے دن خاص طور پر یاد آتے ہیں۔جلسہ کے بعد ہم اکٹھے بیٹھ کر تقاریر پر تبصرہ کرتے۔علمی محفل کے ساتھ خوب گپ شپ بھی رہتی۔دینی و دنیوی امور پر بحثیں ہوتی رہتیں۔

1999ء میں سویڈن آئے تو ہمارے ساتھ سویڈن کے بہت سے تفریحی مقامات کی سیر کی۔ عجب محبت اور خاکساری کا مجسمہ تھے۔ سجاد صاحب بھی ان کو اباجی کہہ کر بلاتے تھے اور وہ ان سے بہت خوش تھے۔ گھر ہو یا باہر، کسی جگہ نماز کو نہیں بھولے۔ بعد نماز ہلکی پھلکی معرفت بھری باتیں کرتے جو دل میں اتر جاتیں۔

ایک بات جو میرے لئے بہت اہم تھی کہ وہ ہر خط کا جواب دیا کرتے تھے اور جواب میں دیری بالکل نہ ہوتی تھی۔ کبھی چند دن گذر جاتے تو مجھے گھبراہٹ ہوتی کہ شاید آپ بیمار ہو گئے ہیں مگر پھر خط میں لکھتے کہ مَیں سرگودھا سے باہر گیا ہوا تھا اس لئے دیر ہو گئی۔ کہا کرتے تھے کہ میری عادت ہے کہ مَیں ہر خط کا جواب ضرور دیتا ہوں۔ خبروں کے بہت شوقین، حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔ 1974ء میں خبریں سننے کے لئے ٹیلیویژن خریدا، ورنہ اس ایجاد کا کوئی شوق نہ تھا۔ آپ نے الفضل کا ہر پرچہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ نہ صرف مذہبی بلکہ ادبی اور تاریخی کتابیں بھی آپ کی لائبریری میں موجود تھیں۔ میری بہن کو ایک مرتبہ تاریخ کی کتب کی ضرورت پڑی تو حضرت مرزا صاحب نے بخوشی عنایت فرمائیں۔ ان کو دیتے وقت لکھ لیا اور پھر خادم بھیج کر وقتِ مقررہ پر واپس بھی منگوا لیں۔ آپ کی محفلیں بزرگوں کی مدح، درویشوں کے ذکر، صحابہ کی یادوں، جماعت کے ساتھ محبت بھرے سلوک، قیمتی نصائح، تاریخی و سیاسی شخصیات اور ایمان افروز واقعات سے سجی رہتیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس بزرگ پر خاص رحمتوں کی بارش برساتے ہوئے اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

میری بہن نبیلہ رفیق ناروے نے مرزا صاحب کے بارے میں ایک مضمون الفضل میں لکھا۔ وہ لکھتی ہیں:

اب کون سی بات لکھوں اور کون سی چھوڑوں، ان کی قیمتی گفتگو، گاہے بگاہے کی جانے والی خوبصورت نصائح، ان کے اعلیٰ اخلاق کے نمونے اور اپنے پرائے کے ساتھ حسنِ سلوک کا ایک

انبار ہے، جس کو لکھا تو نہیں لیکن محسوس کر کے ان خوبصورت تصورات سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میرے میاں نے حضرت ظفر اللہ خان صاحب کی ان کے ساتھ بار بار بات کی، ہر دفعہ انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت بات بتائی کہ ہم بھی ان سے تمام پرانے لوگوں، خلفائے حضرت مسیح موعودؑ، صحابہؓ حضرت مسیح موعود، قادیان میں بسنے والے درویش اور دوسرے بہت سے مخلصین اور تحریکِ پاکستان کے بڑے بڑے کارکنان کے متعلق پوچھتے رہتے۔ ان کے ساتھ گزرے ہوئے قیمتی واقعات اور یادیں بارہا ہمیں، حضرت مرزا صاحب سے سننے کو ملیں۔ بہت کم دفعہ ایسا ہوتا کہ آپ فرماتے کہ فلاں بات مجھے یاد نہیں، ورنہ عموماً آپ کے ذہن میں گزرے ہوئے زمانے کی زیادہ تر یادداشتیں محفوظ تھیں۔ کون سی بات لکھوں کون سی چھوڑ دوں، اُن کی دُعاؤں کا احسان بھی ہم اُتارنا چاہیں تو نہیں اتار سکتے۔ مگر یہ ہم پر فرض ضرور ہے کہ ہم ان کے لئے بہت دُعائے مغفرت کریں کہ وہ وجود جو سینکڑوں لوگوں کے لئے دُعائیں کیا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ اُس کے لئے جنت کے دروازے کھول دے اور ان کو بے حساب فردوسِ بریں میں لے جائے۔ آمین۔

❁ ❁ ❁

حرفِ آخر

آخر میں مَیں اللہ تبارک تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں جس کے فضل ورحمت سے مجھے یہ مضمون لکھنے کی توفیق ہوئی۔ تاریخِ احمدیت، رجسٹر روایات، رسالہ تحریکِ جدید، رسالہ الفرقان، مشکٰوۃ، مصباح، روزنامہ الفضل، مرکزِ احمدیت، دورِ درویشی اور درویشان، ماہنامہ درویش، تاریخ لجنہ اماء اللہ حصّہ اوّل و دوئم، تقاریر، انٹرویوز اور اپنی یادداشتوں کا سہارا لیتے ہوئے اس مضمون کو لکھنے کی کوشش کی ہے نیز حوالہ جات بھی دیئے ہیں۔

بہت کچھ لکھنا رہ گیا۔ تشنگی ہی رہی۔ بہت دفعہ اس مضمون کو ادھورا چھوڑ دیا۔ کئی کئی ہفتے کی خاموشی کے بعد پھر دوبارہ شروع کیا۔ جو کچھ بن پڑا پیش کیا۔

قارئین سے اچھی امید اور مفید مشوروں کی طلب گار ہوں۔ تمنا ہے کہ آپ قارئین تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے اصلاح فرمائیں گے۔

مَیں اپنی نسلوں اور خاندان کے تمام بچوں سے درخواست کروں گی کہ اپنے بزرگوں کے حالات پڑھیں اور ان کی بلندیٔ درجات کے لئے دعا کریں۔

ہمیشہ آپ سب کی دعاؤں کی محتاج

شاہدہ متین سجاد

Nattviols Gatan 3

41720 Gothenburg

Sweden

(نوٹ:-اس مضمون کا تعلق اس کتاب کے ساتھ نہیں بنتا صرف اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرا یہ سفر نامہ پڑھ کر میرے بچوں کے دل میں مکہ اور روضۂ نبویؐ کی محبت بیٹھے اور بار بار وہاں جا کر دعائیں کرنے کی توفیق ملے)

انوکھا سفر

(چند ساعتیں خانہ کعبہ اور روضہ مبارک پر)

شاہدہ متین سجاد، سویڈن

خواہشات کے سمندر کا کوئی کنارہ نہیں ہوا کرتا۔تمناؤں کے گھروندوں میں دروازے نہیں ہوتے۔مٹی کے پتلے تصّورات کی بگھی میں بیٹھ کر ارمانوں کی لہروں کے سہارے سفر کرتے ہیں۔انسان کے خواب بہت حسین بہت اونچے اور لامحدود ہوا کرتے ہیں۔وہ امیدوں کے تانے بانے بُنتا خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔توہمات منڈرہیولے بھوت پریت کے مکروہ سائے ڈراؤنے خواب جھٹک کر آگے گزر جاتا ہے،سہانے سپنوں کا متلاشی،کوئی اس خول میں کنڈلی مارے لحد میں اتر گیا،کوئی دو چار ہاتھ لبِ بام رہ گیا،کسی کا ارمان پورا ہوا،کوئی منزل پا گیا اور اچانک ہی کا یا پلٹ گئی۔

کچھ ایسی ہی کہانی صفحہ قرطاس پر بکھیرنا چاہتی ہوں اگر استطاعت پا جاؤں وہ پا لیا جس کا شاید کبھی تصور بھی نہ تھا۔ایک ابھرتی سسکتی ہوئی تمنا دعا بن گئی۔محرومیوں نے میری ہچکیوں سے دوستی کا ہاتھ بڑھا لیا۔میری آہوں سے آنسوؤں نے سمجھوتہ کر لیا۔مایوسیوں نے ہتھیار ڈال دیئے بے چارگی سرنگوں ہوئی اچانک ہی خوشیوں نے انگڑائی لی۔

ہوا یوں کہ میری چھوٹی اور بڑی بہن نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ چلو سوئے حرم چلیں

اور مجھے اصرار سے کہا کہ آپ بھی چلیں یہ موقعہ ہے۔ حالات اور خواہشات کی جنگ شروع ہوگئی میرے گھر میں تین چھوٹے بچے ہیں۔ ظاہر ہے ہم ماؤں کا حوصلہ بچوں کو چھوڑنے کے معاملے میں بلند نہیں ہوتا، ابھی تک دونوں بچے میرے سینے پر چڑھ کر سوتے ہیں ہم مائیں بچوں کو کچھ زیادہ ہی ساتھ چمٹائے رکھتی ہیں کہ اتارنا مشکل ہو جاتا ہے، میں کسی طرح بھی حامی بھرنے کو تیار نہ تھی۔ میرے میاں سجاد صاحب نے میری کم ہمتی دیکھی تو بہت اصرار سے جانے پر مجبور کیا۔ ان کی طرف سے تسلّی پا کر میرا عزم جوان ہوا اور اس بابرکت سفر کا ارادہ باندھ لیا۔ خدا تعالیٰ سجاد صاحب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور صحت و تندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

دل کا عجب حال تھا توہمات کے کیڑے کاٹنے کو دوڑتے تھے ایک کو مارا دوسرے نے بندوق تان لی ہر وقت ایک ہی وہم تھا شاید پہنچ نہ پاؤں خوف اور امنگوں کے ہراول دستے بھڑتے رہے توکل کے سپاہی صلح کرواتے رہے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آ پہنچا دعاؤں کے سائبان تلے سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے ہمارا چھ افراد کا قافلہ منزل کی طرف چلا ہم تین بہنیں۔ نسبتی بھائی اور دو بچے بھی ہمراہ تھے۔ انیس اکتوبر صبح دس بجے ہمارا جہاز اڑنا تھا۔ چھوٹا سا جہاز تھا پرواز نیچی تھی زمین پر بسنے والوں کا پورا نظارہ ہمسفر رہا کھیت کھلیان جنگل سبزہ زار مرغزار باغات سمندر ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی بادبانی کشتیاں جانوروں کے ریوڑ سڑکوں کا جال ان پر رینگتی ہوئی کھلونا نما گاڑیاں مکانوں کی قطاریں شہر پر شہر گزرتے رہے اور ہم لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ ہوائی بس ہزاروں میل کی تاریخ پیچھے چھوڑ گئی اور سوئٹزرلینڈ کے ہوائی اڈہ پر اترنے کے لئے نیچی ہوگئی۔ پہیے زمین کو چھوئے اور طیارے کے مسافر باہر آنے کی تیاری کرنے لگے۔

سوئٹزرلینڈ کے ہوائی اڈہ پر ہمارا قیام چار گھنٹے تھا۔ یہ طویل عرصہ نہایت بے آرام کرسیوں پر لٹکتے، گرتے پڑتے، ایک دوسرے کو بے مقصد گھورتے ایئرپورٹ کا جائزہ لیتے اور اونگھتے گزرا۔ مطالعہ اور دعائیں ہمارے سفر کا اصل جزو تھا۔ عمرہ اور حج کے سبھی مسائل پڑھ ڈالے۔ فقہ، جنتری، کتاب الدعا، کتاب الحج، حاجی گائیڈ الغرض جو ملا کھنگال ڈالا۔

اب ہمیں جدّہ کیلئے جہاز لینا تھا۔مقررہ وقت سے بہت پہلے ہم لاؤنج میں جا پہنچے اس جہاز کی منزل جدّہ تھی۔ ہر طرف عمرہ کرنے والے مسافر تھے۔عورتیں،مرد، بچے،نوجوان، بوڑھے احرام میں ملبوس نظر آئے۔آج بہت سے لوگ گروہ کی صورت میں عازمِ سفر تھے۔اپنے اپنے عقائد کے مطابق اپنی پسندیدہ دعاؤں میں مصروف تھے۔شام چار بجکر پینتیس منٹ پر جہاز کو اڑنا تھا۔ وقت قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ہم بار بار گھڑی کو دیکھ رہے تھے اور لمحات گن رہے تھے۔اچانک سکرین پر لکھا ہوا آیا کہ جہاز پانچ بجکر پینتیس منٹ پر اڑے گا۔تھکا دینے والی ساعتوں میں اضافہ ہو گیا۔ایک گھنٹہ اور گزرا۔آخر خدا خدا کر کے جہاز میں داخل ہوئے تو لمبے وقفے کے بعد کپتان نے اعلان کیا کہ فرانس سے آنے والی پرواز تاخیر سے پہنچ رہی ہے۔اس پرواز میں ہمارے بارہ مسافر ہیں جو ہمیں اپنے ساتھ جدّہ لے جانے ہوں گے اس لئے مزید دیری کے لئے معذرت ہے۔اب مزید کتنا قیام ہے؟ کون جانے؟

ڈبی نما تنگ نشستوں پر ہم براجمان تھے۔ایک بے چاری خاتون ٹائیلٹ جانے کے لئے اٹھی اس کو معلوم نہ تھا کہ کھڑے جہاز میں رفع حاجت سے روک دیا جاتا ہے۔یکے بعد دیگرے عملہ کی دو کارکنات نے اس خاتون کو روکا۔بے چاری پاکستانی نے سنی ان سنی کر دی اور ٹائیلٹ میں گھس گئی۔ جہاز کی دونوں کارکنات ایک دوسرے کو دیکھ کر طنزاً مسکرائیں جہاز کے عملہ کی عقل پر میں حیران تھی،ابھی غیر معینہ مدت کا قیام باقی تھا پھر مسافروں کو کیوں جہاز میں لا بٹھایا اوپر سے اپنے قوانین کی پابندیاں۔تقریباً مزید ایک گھنٹے کی تاخیر کے بعد وہ بارہ فرانسیسی نژاد جہاز میں داخل ہوئے جن میں زیادہ تر سیاہ فام تھے۔فرانس کی کالونی کی یادگاریں جو اس کے ملک میں بس گئی تھیں۔کپتان کی آواز ایک دفعہ پھر سنائی دی وہ مسافروں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا جو وہ پہلے کہنا بھول گیا تھا۔شاید ان بارہ مسافروں کی عدم موجودگی میں کہنا غلط تھا یا پھر دو دفعہ کہتے ہوئے پیسے لگتے ہوں گے، وجہ کچھ بھی ہو ہم مادی دنیا میں بسنے والے ہر روایت، رسم و رواج کو دولت کے ترازو میں تولتے ہیں۔ پھر جہاز آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑنے لگا اور ہم نے

اطمینان کا سانس لیا۔ ہر نشست کے سامنے کمپیوٹر لگا ہوا تھا۔ بچے مختلف کھیلوں ،خبروں اور انٹرنیٹ سے خوب محظوظ ہوتے رہے۔ ہمیں ربِّ کریم نے دعا کی خوب توفیق دی۔ تھکن اور بھوک سے طبیعت نڈھال تھی۔ میں نے دو دفعہ بٹن دبایا مگر ائیر ہوسٹس نہ آئی۔ دو گھنٹے کے بعد کھانے کی ٹرالیاں آتی دکھائی دیں تو جان میں جان آئی۔ مگر یہ کیا؟ چھوٹے چھوٹے نمکین بسکٹ کی ایک تھیلی اور ایک گلاس سیب کا شربت پیش کیا گیا۔ میں نہ رہ سکی اور کھانے کی درخواست کی۔ ائیر ہوسٹس نے جواب دیا ۲۰ منٹ کے بعد رات کا کھانا پیش کیا جائے گا۔ میری انتڑیوں پر کیا گزری؟ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ بہر حال کھانا آیا یا ڈنر ٹرخایا، جو بھی تھا ہم نے کھایا، لطف اٹھایا ،اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا۔ جسم میں جان پیدا ہوئی، آنکھیں کھلیں اب یہ طویل سفر ختم ہونے کو تھا۔ ہم سعودی عرب میں داخل ہو چکے تھے۔ اُترنے سے کچھ پہلے چھوٹے چھوٹے تولیے نما رومال گرم پانی میں بھیگے ہوئے پیش کئے گئے۔ ان سے بھاپ اٹھ رہی تھی میرے لئے یہ ایک نئی چیز تھی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے۔ ائیر ہوسٹس مسکرائی اور کہنے لگی گرم تولئے سے منہ ہاتھ صاف کر کے تازہ دم ہو جائیں۔ اس کی اس بات پر سر ظفر اللہ خان صاحب کی دعوت کا ایک واقعہ یاد آیا جو آپ نے تحدیث نعمت میں تحریر کیا ہے کہ ایک موقعہ پر کھانے کے بعد سب مردوں کو گیلے گرم تولئے پیش کئے گئے مگر عورتوں کو کچھ نہ دیا گیا ڈر تھا کہ عورتوں کا غازہ اتر جائے گا۔ لیکن یہاں عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہ رکھا گیا۔ ان کو معلوم ہے کہ عمرہ پر جانے والی خواتین بناؤ سنگھار سے پاک ہیں۔ جہاز بلندی سے نیچے اترا تو ہم نے جدّہ شہر کو روشنیوں میں نہاتے دیکھا۔ بجلی کے قمقے ان گنت ستاروں کی طرح روشنیوں کا آنچل اوڑھے کھڑے تھے۔ ہاں یہ وہی سرزمین ہے جہاں مفلس صحرائی بدوؤں کے گھروں میں چراغ بمشکل جلتا تھا۔ چاند تاروں سے وقت کا تعین کیا جاتا تھا۔ اب اللہ کے گھر کی برکت ہے خدائے قدّوس کی رحمت ہے۔ آج اس ملک میں دولت کی فراوانی ہے۔ لوگ جوق در جوق ہر روز یہاں آتے ہیں اور اللہ کی رحمتوں سے جھولیاں بھرتے ہیں۔

اترنے سے کچھ دیر پہلے ہمیں کاغذ دیئے گئے جو ہم نے بھر کر ساتھ لے جانا تھے۔ ان کاغذوں کے بغیر آپ کو جدّہ ائیر پورٹ سے باہر نہیں آنے دیا جائے گا۔ جہاز سے باہر نکلتے ہی ایک سعودی کارکن نے ہم عورتوں اور مردوں کو الگ کر دیا۔ میں گھبرا کر بولی ہمارے بچے کہاں گئے۔ وہ کہنے لگا 'ھٰذا سیارۃ' یہ بس ہے جس کو ہم ائیر پورٹ جانے والی سرنگ سمجھے تھے۔ شدّتِ جذبات سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں اپنی خوش نصیبی پر ارحم الراحمین خدا کا جتنا شکر کرتے کم تھا، جتنا اِتراتے کم تھا۔ ہماری بس چل پڑی۔ چاروں طرف گھور گھور کر دیکھا کوئی کھڑکی یا شیشہ نظر نہ آیا تاکہ ہم باہر کا نظارہ کر پاتے۔ شاید یہ قیدیوں کو لے جانے والی بس تھی جس میں ہمیں بھی بٹھا دیا گیا تھا۔ بس رُکی اس کو دروازے کے ساتھ اس طرح جوڑا گیا تھا کہ ہم سیدھے ہال میں داخل ہوئے۔ رات گیارہ کا عمل تھا سویڈش وقت سے صرف ایک گھنٹہ آگے۔

پاسپورٹ کی چیکنگ شروع ہوئی۔ قطار میں مجھ سے آگے میری بہن اور اس کے بچے کھڑے تھے یاسر میاں نے اپنی امّی کے پاسپورٹ میں اپنا کارڈ رکھ دیا اور اپنے پاسپورٹ میں غلطی سے امّی کا کارڈ رکھ دیا۔ پاسپورٹ کی پڑتال کرنے والا نوجوان افسر نہایت گرم خون کا مالک تھا۔ اس نے اس غلطی پر ایسی برہمی کا اظہار کیا کہ ہم حیران ہو گئے۔ وہ اٹھا اٹھا کر پاسپورٹ پٹخنے۔ ہم مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔ یورپ میں رہ کر انسان نرم طبائع کا عادی ہو جاتا ہے۔ انسان سخت گیری اور بدسلوکی کا عادی نہیں رہتا۔ کسی غلطی پر ڈانٹ پھٹکار نہیں پڑتی۔ یہ عجیب وغریب تجربہ تھا۔ الغرض پاسپورٹ کی طویل تحریری کاروائی سے فراغت پا کر ہم نے اپنا سامان لیا تو سامان کی پڑتال کی باری تھی۔ ہماری باجی کا ایک بیگ مشکوک نکلا۔ نہ جانے وہ کیا ساتھ لائیں تھیں آج تک گتھی نہیں سُلجھ سکی۔ پڑتال کرنے والے افسر نے ہمیں ایک اور سعودی افسر کے پاس بھیج دیا۔ اس بیگ پر باجی نے نئے زمانے کا چھوٹا سا تالہ لگا رکھا تھا۔ باجی کے پاس جتنی بھی چابیاں تھیں سب آزما ڈالیں۔ چابی ہوتی تو ملتی۔ بی بی چابی گھر پڑی سو رہی تھی۔ تالے میاں ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔ ایسی ڈھونڈیا پڑی کہ باقی چابیاں بھی تنگ آ گئیں۔ ہماری بوکھلاہٹ کو

دیکھ کر اس مہربان اللہ کے بندے نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے بآواز بلند کہا یا اخیِ المُکرم شکراً جزیلاً۔ افسر کا سر جھک گیا اور بیگ اپنے آپ سرک کر ٹرالی میں جا گرا۔ پیچھے دیکھے بغیر ہم آگے کو دوڑ لئے کہیں پھر نہ دھر لئے جائیں۔

باہر دروازے پر مطلوبہ ہوٹل کا نمائندہ ہمارا منتظر تھا۔ تپاک سے ملا۔ ہمارے پاسپورٹ کی نقول لے کر پاسپورٹ تو واپس کر دیئے مگر ہماری واپسی کی ٹکٹیں اپنے پاس رکھ لیں۔ سعودی حکومت نے یہ نیا نظام جاری کیا ہے کہ ہوٹل کی بکنگ کے بغیر آپ کی ٹکٹ بک نہیں ہوسکتی۔ وہاں قیام کا سب انتظام ایجنٹ ہی کرتا ہے۔ ہم نے اپنے سفر کے لئے جس پیکج کا انتخاب کیا تھا اس میں جدّہ تک کا ہوائی ٹکٹ، مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام نیز جدّہ کے ائیر پورٹ سے مکّہ مکرمہ کے ہوٹل تک ٹیکسی کی سہولت بھی شامل تھی۔ قیمت صرف ۵۶۰ پاؤنڈ فی کس تھی۔

ایک ہندوستانی مزدور نے ہماری سامان کی ٹرالی پکڑ لی۔ جتنی دیر کاغذی کاروائی ہوتی رہی ہم اس سے سوال کرتے رہے۔ دُبلے پتلے جسم والا یہ لڑکا عرصہ 5 سال سے یہاں کام کر رہا تھا۔ 50 ہزار روپئے اس نے ایجنٹ کو دیئے تھے جو اس کو سعودی عرب تک لایا تھا۔ وہ اپنے قرض اُتار چکا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ ہر سال اقامہ یعنی ویزہ لگوانے کے لیے اسے ایک خطیر رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ مختصر یہ کہ اچھا گزارہ ہوجاتا ہے خاص طور پر حج کے دنوں میں۔ سعودی کارکن نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہمیں ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔ ہم ائیر پورٹ کی عمارت سے باہر آ گئے۔ پہلی دفعہ سعودی عرب کے آسمان کو دیکھا۔ رحیم و کریم کا شکر ادا کیا۔ گرمی، حبس، اندھیرا تو تھا ہی، مگر موسم کی کس کو پرواہ تھی۔ ہمارے دل جذبہ و جوش سے اُبل رہے تھے۔ ہندوستانی مزدور نے 50 میٹر دور تک ٹرالی گھسیٹی۔ بھائی جان نے ۳۰ ریال ادا کئے جو اس نے نہایت بددلی سے قبول کئے۔ یہ مزدور لوگ یورپ سے آنے والوں سے پاؤنڈ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ یہاں مزدور کی اُجرت ۱۰ ریال مقرر ہے۔ ہم ۹ نشستوں والی بڑی ویگن میں بیٹھے۔ ڈرائیور پاکستانی تھا اور اس کا لہجہ حیدر آبادی تھا۔ گاڑی میں

بیٹھتے ہی ہم نے ایئر کنڈیشن چلانے کی درخواست کی۔ گاڑی کے مالک نے شاید ہمیں بہلانے کے لئے بٹن دبایا۔ بٹن خوب دبا۔ ہم ان گنت ساعتیں منتظر رہے۔ دل کو سمجھایا، اور کھڑ کھڑ کرتی کھڑکیاں چپکے سے کھول لیں، جس پر ڈرائیور نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ہماری ویگن خالی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ راستہ میں شاید ہی کوئی گاڑی نظر آئی ہو۔ سڑک کے کنارے بتیاں نہ تھیں۔ رات کی تاریکی میں ہم کچھ زیادہ مشاہدہ نہ کر پائے۔ کہیں کہیں سوئی ہوئی بستیاں نظر آئیں۔ بند دوکانوں کی مدھم روشنیوں میں ہم اردو اور عربی زبان میں لکھے ہوئے بورڈ پڑھتے رہے۔ پہاڑ، صحرا، ریگستان اور سنگلاخ زمین دکھائی دی۔ ہم سب خاموش دعاؤں میں مصروف تھے۔ تلبیہ، قرآنی دعائیں، پیارے نبی کی دعائیں اور اپنی زبان میں جتنی توفیق تھی مانگتے رہے۔ دعا کی توفیق بھی خدا ہی دیتا ہے۔ مجھ پر رحمن خدا کا خاص ہی فضل رہا۔

مکّہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں احرام باندھنا تھے۔ راستہ میں ایک حمام اور ملحقہ چھوٹی سی مسجد پڑتی تھی۔ وہاں رُکنا چاہا تو ڈرائیور صاحب مشتعل ہو گئے۔ صاحب رُکنا نہ چاہتے تھے۔ ہمیں جلد از جلد ہوٹل میں چھوڑ کر اپنی جان چھڑانا چاہتے تھے۔ اس کا عندیہ یہ تھا کہ اس مسجد میں نہانے کا انتظام اچھا نہیں کیونکہ یہ بدوؤں نے بنائی ہوئی ہے۔ آپ اس وقت سیدھے مکّہ مکرمہ کے ہوٹل میں جائیں۔ اپنے آنے کی اطلاع دیں اور پھر دوبارہ ٹیکسی لیں اور مکہ سے باہر تعیم یعنی مسجد عائشہ جایئے۔ وہاں صاف ستھرا انتظام ہے۔ اس وقت تقریباً رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہمارے دلوں میں جوش کے چشمے ابل رہے تھے۔ ہم جلد از جلد کعبہ کا دیدار کرنا چاہتے تھے۔ کون اتنا صبر کرے۔ بہت مشکل سے اسے چند منٹ رکنے کے لئے قائل کیا۔ اسی جگہ پر ایک پاکستانی دوکان تھی۔ جو رات کے وقت کھلی تھی۔ وہاں سے ہم نے احرام خریدے حمام کے باہر پلچھی کی چٹائیاں پڑی ہوئی تھیں جہاں ہم نے دو نفل ادا کئے اور اپنے پیارے رب کا شکر ادا کیا۔ اس دوران ڈرائیور قریبی چائے خانہ میں قہوہ پیتا رہا۔ گاڑی ایک دفعہ پھر فراٹے بھرنے لگی۔ اب ہماری منزل قریب آتی جا رہی تھی دل کا جو حال تھا وہ بیان نہ کر پاؤں گی۔ شدّتِ

جذبات سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ہر کوئی تلبیہ کا وِرد کرنے اور دعاؤں میں مشغول تھا۔ باہر ہُو کا عالم تھا۔ صاف شفاف سڑک کے کنارے بڑی سی تختی پر آویزاں مکّہ مکرمہ کا نام پڑھا تو آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ دل میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ ہم مکّہ میں آ پہنچے تھے۔ یہ وہی وادی ہے جسے قرآن کریم نے بکّہ مبارکہ کا لقب دیا۔ جس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہیں 4 ہزار سال پہلے حضرت ابوالانبیاء حکمِ خداوندی سے ننھے اسماعیل کو اور بی بی حاجرہ کو اکیلا بیابان میں چھوڑ گئے تھے۔ مکّہ انبیاء کی وادی ہے۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔

چاروں طرف خوبصورت بلند و بانگ عمارتیں تھیں۔ سب گلیاں اور سڑکیں پکی تھیں کہیں مٹی کا نام ونشان نہ تھا۔ ہمارا ہوٹل پہاڑی پر واقع تھا۔ ڈرائیور نے ڈھلوان پر گاڑی کھڑی کی۔ ہوٹل کے ملازم کو بتائے بغیر سامان زمین پر پھینکنا شروع کر دیا۔ ملازم صبر، صبر کی صدا دیتا ہوا بھاگا آیا اور ٹرالی میں سامان بھر کر ہمیں دفتر شعبہ آمد میں لے گیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں اس ۲۰ منزلہ ہوٹل کی گیارھویں منزل میں پہنچا دیا گیا۔ کشادہ کمرے، بہترین صاف ستھرے بستر، فرج، ٹی وی، گرم وٹھنڈا پانی الماری غرض اللہ تعالی کی ساری نعمتیں تھیں۔ ہم نے تیزی سے اپنے کمروں کو قفل لگایا اور سُوئے کعبہ چلے۔ ریسیپشن پر کسی کو بھی انگریزی نہیں آتی تھی۔ ان کے پاس کسی قسم کا کوئی معلوماتی کتابچہ، نقشہ یا راستہ سمجھانے والی راہنما کتاب موجود نہ تھی۔ مجھے اور چھوٹی بہن کو تھوڑی بہت عربی آتی تھی جو اس سفر میں ہمارے کام آئی۔ میں نے پوچھا این الکعبہ؟ این المسجد الحرام؟ اس نے صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ ہم نیچے اترے تو دیکھا کہ رات کے اندھیرے میں ہوٹل کی ویگن ہمیں مسجد الحرام لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ جس کے بارے میں ہم بالکل لاعلم تھے۔ یہ مفت سروس ہم پر خدا تعالی کا عظیم احسان تھا۔ اگرچہ ہمارا ہوٹل صرف ۱۰ منٹ کے فاصلہ پر تھا مگر چڑھائی زیادہ تھی۔ مکّہ کی ساری وادی پہاڑی علاقہ ہے۔ جو کبھی نوکیلے سنگلاخ ٹیلوں پر مشتمل تھی جسے کاٹ کاٹ کر ہموار کیا گیا ہے۔ ویگن ڈھلوان پر سیدھی نیچے کو 50 میٹر تک پھسلتی چلی گئی پھر بائیں طرف مڑی اور تقریباً

۱۰۰ میٹر کے فاصلہ پر مسجد الحرام اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ کھڑی تھی۔سرخ اور سفید سنگِ مرمر سے بنائی گئی یہ مسجد کسی عجوبہ سے کم نہیں۔اس کے صحن کے کناروں پر بلند ستون بنا کر نہایت بڑی طاقت والے قمقموں سے روشنی مسجد پر ڈالی گئی ہے۔رات 2 بجے کا وقت تھا۔فضا بالکل خاموش تھی۔ یوں محسوس ہؤا جیسے کوئی دلہن نور کا آنچل لئے کھڑی ہو۔باہر کا صحن بھی سفید سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔سفید چاندنی کی طرح چمکتا ہؤا ایسا سحر طاری ہوا۔دل بے اختیار اللہ تعالیٰ کی حمد کے ترانے گانے لگا۔

اسی صحن کے کنارے پر بس سٹاپ بنایا گیا ہے۔قریب ہی ایک دفتر تھا جہاں سے پہیوں والی کُرسی ملتی ہے۔کُرسی تو مفت ملتی ہے مگر اپنا پاسپورٹ بطور ضمانت رکھوانا پڑتا ہے۔مسجد الحرام کے کئی دروازے ہیں۔ ہم نے اپنی سہولت کیلئے آنے جانے کا راستہ باب العزیز کو چُنا۔ دروازے پر پہریداروں نے تلاشی لی اور اندر جانے دیا۔ چند قدم چلنے کے بعد خانہ کعبہ کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا۔میرے دل کی اس وقت کیا حالت ہوئی؟ مت پوچھئے۔میں جانتی تھی کہ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے وقت دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ساری عمر اللہ کے گھر کو دیکھنے کی تمنا کی اور اس لمحے کے خواب دیکھے۔تصورات میں ڈھیروں دعائیں کر ڈالیں۔آج جبکہ یہ مقدس مقام سامنے ہے۔میری زبان کیوں گنگ ہوگئی؟ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت جبکہ میں لکھ رہی ہوں مجھ پہ کپکپی طاری ہے۔اس لمحے چاہتے ہوئے بھی الفاظ نے زبان کا ساتھ نہ دیا۔اس خانہ خدا کی اتنی عظمت اور شان وشوکت کا ایسا رعب ہے کہ جس نے مجھے بے بس کر دیا۔میں نے خوشی وغم کے احساسات کی چادر اوڑھ لی۔آہستہ آہستہ بھاری قدموں کے ساتھ تھوڑا سا آگے بڑھی۔اب پورا خانہ کعبہ میرے سامنے تھا۔نہایت بلند مستطیل عمارت، کالے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا خدا کا گھر جس پر سونے کی تاروں سے مختلف دعائیں اور قرآنی حروف کندہ ہیں۔یہ میرے ربِ کریم کا گھر ہے۔اس کے اردگرد تمام صحن سفید سنگِ مرمر سے بنایا گیا ہے۔اپنی کم علمی پر بہت شرمندہ ہوں۔ کاش میرے پاس الفاظ ہوتے میں اس عتیق گھر کا نقشہ کھینچ سکتی۔اپنی کم مائیگی پر حزیں ہوں مجھے

توفیق نہیں کہ اس کے حسن کو کاغذ پر بکھیر سکوں۔ اس وقت میرا دل خدا کے حضور رو پڑا۔ اے اللہ مجھ میں اتنی کمزوریاں ہیں کہ کراہت آتی ہے۔ مجھ گناہگار پر تو نے اتنا بڑا افضل کیا۔ اے اللہ آج تو میزبان ہے ہم تیرے مہمان ہیں۔ خوشی سے میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ میں نے کونسی نیکی کی ہے کہ تو مجھے اپنے گھر لے آیا۔ سوچا تو ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ ہمارے پیچھے والدین اور دوسرے بزرگوں کی دعائیں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معبد کو دیکھ کر میں سوچ رہی تھی یہ وہی خانہ کعبہ ہے۔ جس کو پہلی مرتبہ فرشتوں نے بنایا۔ جس کو اللہ نے انسانوں کے لئے سب سے پہلا گھر قرار دیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسکی بنیادیں اٹھائیں۔ اسی میں محبوب ِ خدا نے امّتِ مسلمہ کے لئے سجدے کئے۔ اور یہ عبادت کا گھر ہمیشہ کیلئے دنیائے عالم کیلئے مرکزِ توجہ بنا دیا گیا۔ کعبہ کے ارد گرد مطاف پر یمن سے لایا گیا خاص قسم کا سُفید سنگِ مرمر فرش کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جس پر سورج کی حدت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہم جُھلستی ہوئی دوپہر میں بھی ٹھنڈے فرش پر طواف کرتے رہے۔ چمکتے ہوئے سفید فرش پر کالا لبادہ اوڑھے خانہ کعبہ ایسا سحر انگیز منظر پیش کر رہا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ جس کے گرد متوالے جھوم جھوم کر دعائیں پڑھتے ہوئے چکر لگا رہے ہیں۔

عربی، عجمی، افریقی، یمنی، جاپانی، چینی، ہندوستانی، روسی انڈونیشی، پاکستانی، ایرانی، سویڈش، انگریز، نارویجین، مصری، الغرض دنیا کے کناروں سے آئے ہوئے مسلمان باشندے موجود ہیں۔ کوئی اکیلا ہے تو کوئی گروہ کی صورت میں معلّم کے ساتھ بلند آواز میں دعائیں پڑھتا ہوا گزر رہا ہے۔ خاتون معلمہ بھی دوسری خواتین کے ساتھ عبادت میں مصروف ہے۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ عورتیں، بچے، عمر رسیدہ، اپاہج، لوُلے، زمین پر گھسٹتے ہوئے، اندھے ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے۔ کوئی احرام باندھے ہوئے ہے تو کوئی قومی لباس میں ہے۔ مقصد ایک ہی ہے۔ طلبِ رحمت وبخشش۔ زیادہ تر لوگوں نے سفید احرام باندھ رکھے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہ

تھی۔ عجب طلسماتی ماحول تھا۔ میں انہی خیالات میں گُم تھی۔ میری بہن نے مجھے کہا آؤ اب طواف شروع کریں۔ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہوئے طواف شروع کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جنت کا پتھر ہے۔ جو کعبہ کے ایک کونے پر لگایا گیا ہے اس کے ۱۲ ٹکڑے ہیں۔ یہ غار نما گہرائی میں نصب ہے۔ اسکو بوسہ دینے کے لئے سر اندر تک لے جانا پڑتا ہے۔ اس کے سامنے زمین پر سرخ سنگِ مرمر کی پٹی بنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نشان دہی کے لئے حجرِ اسود کے بالمقابل مسجد کی دیوار پر سبز رنگ کی ٹیوب لائٹ لگائی گئی ہے۔ ہم نے طواف شروع کیا۔ دوسرے ہی چکر میں ہم نے سوچا کہ حجر اسود کا بوسہ لیا جائے۔ میں نے اور چھوٹی بہن نے سرکنا شروع کیا۔ بھیڑ میں جگہ بناتے بناتے ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے حجرِ اسود پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ تین دفعہ چوما، ماتھا رگڑا۔ اتنے میں ایک بوڑھا زور سے چلایا۔ استغفر اللہ۔ میں نے دل کو سمجھایا خود غرضی اچھی نہیں اور اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے دوسروں کے لئے جگہ بنا دی۔ بھیڑ میں گھسنا آسان تھا۔ مگر باہر نکلتے ہوئے اپنا ملیدہ بن گیا۔ پھر اللہ تعالی کے کرم سے ہمشیرہ نے اور دونوں بچوں نے بھی بوسہ لے لیا۔ اس وقت رات کے تقریباً 3 بجے تھے۔ لوگ کم تھے۔ ہماری باری آ گئی ہم اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہے تھے۔ یہ لمحات ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتے۔ اپنی خوش قسمتی پر فرحاں و نازاں تھے۔ الحمدُ للہ۔ اس کے بعد ہر دفعہ طواف کرتے ہوئے حجر اسود کو استیلام کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ یعنی تین مرتبہ اللہ اکبر پڑھا۔ خانہ کعبہ کے جنوب مغربی کونے کا رخ یمن کی طرف ہے اس جگہ غلاف کو کاٹ کر تھوڑا حصہ ننگا رکھا گیا ہے۔ اس کونے کا نام رُکن یمانی ہے۔ ہم کچھ زیادہ ہی لالچی تھے۔ بھیڑ کم دیکھ کر بار بار ہاتھ لگانے اور چومنے کا موقعہ ملا بلکہ اس در کے ہر طرف سے برکتیں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کعبہ کی برکتیں جتنی سمیٹ سکتے ہوں سمیٹیں۔ خانہ کعبہ کے دروازے کی دہلیز کے ساتھ لوگ چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے یوں جیسے سریش لگا کر چپکا دیئے گئے ہوں۔ مرادیں مانگ رہے تھے۔ تو ربُ الرحیم سے خطاؤں کی معافی کی تمنا ہے۔ دروازے کی اونچائی تقریباً 5 فٹ ہوگی۔ دروازہ سونے کا ہے اور اس کے آگے

غلاف پر سورۃ الفاتحہ اور دیگر قرآنی آیات کنندہ ہیں۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر دہلیز کو پکڑ لیا۔ وہیں کہیں ایک پاکستانی صاحب کھڑے تھے۔ اپنی اصلیت نہ چھپا سکے۔ یوں گویا ہوئے، جی آپ کو یہ پکڑنے کی اجازت نہیں۔ خانہ کعبہ کے غلاف کو پکڑ کر بار بار دعا کرنے کا موقعہ ملا۔ جتنی دفعہ سر رگڑا قریب کھڑا ہوا پہریدار زور زور سے غلاف پر ہاتھ مار مار کر ہٹانے لگا۔ اس سے عورتیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ وہ سعودی محافظ شور مچا مچا کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کرتا رہا۔ عورت کو ہاتھ لگانے یا دھکا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی کس کو پرواہ تھی۔ ہم اپنے آپ میں مست تھے۔ ایک صفت جو میں نے سعودی مردوں میں دیکھی کہ وہ عورت کا احترام کرتے ہیں۔ اس سارے سفر میں مختلف سعودی مردوں، پہریداروں، دوکانداروں، پولیس، ڈرائیوروں اور راہ گیروں سے واسطہ پڑا۔ ایک صفت جو قابلِ ذکر ہے وہ انکا غضِّ بصر ہے۔ عورت کے ساتھ نظر ملا کر بات کرنیکا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گھورنا، تاڑنا، اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا صرف حرام ہی نہیں سمجھتے بلکہ شرم سے سر جھکا لیتے ہیں۔ سات مرتبہ طواف کرنے کے بعد ہم نے حطیم میں نوافل ادا کئے۔ چھوٹی سی جگہ اور ایمان والوں کا ہجوم۔ بڑی مشکل سے نماز کے لئے جگہ ملی۔ عورت اور مرد پہریدار نمازیوں کو اٹھا اٹھا کر باہر بھیجنے کی سرتوڑ کوشش میں مگر ہم ضدی سجدوں میں کون سنتا ہے؟ حطیم دراصل کعبہ کا ہی حصہ ہے۔ کعبہ کے متولی قبیلہ قریش نے دوبارہ تعمیر کے وقت لکڑی کم ہونے کے باعث یہ حصہ خالی چھوڑ دیا تھا۔ طواف کرتے وقت اس حصے کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اسی میں طلائی میزابِ رحمت (پرنالہ) گرتا ہے۔ آسمان پر نظریں جمائے رکھیں کاش بارش ہو۔ کعبہ کی چھت کا بابرکت پانی ہم پر بھی پڑے۔ یہ وہی حطیم ہے جہاں ہجرت سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سو رہے تھے۔ حضرت جبرائیل آئے اور آپکو مسجد اقصیٰ لے گئے یہ واقعہ اسراء کہلایا۔ اتنے میں فجر کی اذان ہوگئی۔ نہایت خوش الحان آواز سنائی دی۔ میری سوچ کہیں دور بھٹک گئی۔ خانہ کعبہ میں سربسجود ہونے کے لئے محبوبِ خدا کتنی دیر تر سے۔ کعبہ کے دامن میں عبدالمطلب متولئ کعبہ فرش لگا کر بیٹھتے تھے تو ننھا محمدؐ جوشِ محبت میں آ کر آپکے

ساتھ بیٹھتا تھا۔ اسی خانہ کعبہ کے سایہ کو محمدِ عربی ﷺ نے دنیا کا بہترین سایہ کہا۔ یہیں آپ پروان چڑھے۔ مگر جب اسلام کا ظہور ہوا تو کایہ پلٹ گئی۔ انہی فضاؤں میں اذان دینا تو درکنار مسلمان چھپ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ کعبہ کے در و دیوار خونی داستانوں کے گواہ ہیں۔ ایک خدا پر ایمان لانے والوں پر انسانیت سوز ظلم و ستم روا رکھا گیا۔ چلچلاتی دھوپ میں تپتی ریت پر لٹایا جاتا۔ انہی پہاڑیوں کے بھاری پتھر ان کے سینوں پر رکھے جاتے۔ بلِال حبشی کی اَحد اَحد کی آوازیں کعبہ سے ٹکراتی رہیں۔ اسی سرزمین پر اسلام کی پہلی شہیدہ سمیعہ نے دم توڑا۔ کعبہ کے عین سامنے بی بی خدیجہ کے لختِ جگر کو شہید کیا یہیں سے فخر العالمین کو در بدر کیا گیا۔ اسی آسمان تلے رہبرِ انسانیت کو مجنوں کہا جاتا۔ پتھر کوڑا کرکٹ اور اونٹ کی اوجھڑی پھینکی جاتی۔ اسی جگہ آپ ﷺ نے اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا ایک حصہ گزارا۔ کعبہ کے سامنے آپ ﷺ سربسجود تھے تو عقبہ نے نماز کے دوران آپ کے گلے میں کپڑا ڈال کر اس زور سے کھینچا کہ آپ کا دم رکنے لگا۔ حضرت ابوبکر کو معلوم ہوا تو دوڑے آئے اور چھڑایا۔ آج کا امن و سلامتی بھی میرے پیارے نبی ﷺ کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ محمدِ عربی ﷺ کی تعلیم کا فیضان ہے۔

نماز ادا کرنے کے بعد ہم نے الصفا کا رخ کیا۔ الصفا پہاڑی سے المروہ تک سات چکر لگائے۔ صفا پہاڑی چھوٹے سے ٹیلے کی صورت میں رہ گئی ہے۔ صفا سے کعبہ نظر آتا ہے۔ کچھ عورتیں اور مرد وہاں قرآن پڑھ رہے تھے۔ لوگ قبلہ رُخ ہو کر عاجزی سے گڑگڑا رہے تھے۔ سعی کرتے وقت اس ماں کا خیال آیا جس کا بچہ جانکنی کے عالم میں تھا اور وہ پانی کی تلاش میں کبھی ایک طرف دوڑتی کبھی دوسری طرف۔ جہاں سے اس بی بی کو اپنا دم توڑتا ہوا بچہ نظر نہ آتا۔ وہ جگہ وہ دوڑتے ہوئے طے کرتی۔ اس حصے کو سبز رنگ سے واضح کیا گیا ہے۔ کتنی مشکل سعی تھی۔ شعائر اللہ کے گرد سات چکر اس خاتون کی بے قراریاں و التجائیں ربّ العزت کو پسند آئیں۔ اس سعی کو حج و عمرہ ادا کرنے والوں کیلئے فرض بنا دیا گیا۔ ہم ائیر کنڈیشنڈ برآمدوں کے تلے چل رہے تھے۔ مگر اس عورت کا کیا حال تھا جو سنگلاخ زمین پر مجنونانہ دوڑتی رہی تھی؟ صفا

پہاڑی پر چڑھ کر یاد آیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانِ حق کیلئے اس پہاڑ پر چڑھ کر اسلام کی دعوت دی تھی۔ صفا کے دامن میں دارِ ارقم میں پہلا تبلیغی مرکز قائم کیا گیا تھا۔ اب اس کے کھنڈرات سنگِ مرمر کے فرش تلے دبے ہوئے ہیں۔ مروہ کے محض نشان باقی ہیں۔ ابھرے ہوئے سرمئی پتھر۔ مروہ کے سامنے بابِ مراد ہے اس کا رُخ بھی قبلہ کی طرف ہے۔ دور دراز سے آئے ہوئے اہلِ ایمان اس دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس موقعہ پر مجھے اپنی جماعت کا حال معصوم بچے جیسا دکھائی دیا۔ جو بے بس ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت پر فضل ورحم فرمائے۔

صفا پہاڑی کے دامن میں نوجوان عربی اور عجمی وہیل چیئرز کے ساتھ موجود تھے۔ 40 ریال کے عوض دوڑ دوڑ کر ضرورت مندوں کو سعی کروا رہے تھے۔ طواف ختم کر کے ہم نے قبلہ رُخ ہو کر آبِ زمزم پیا اور سنت پوری کی۔ مختلف راہداریوں میں آبِ زمزم سے بھرے ہوئے حمام پڑے ہیں جن پر سُقیا زمزم کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک ہم تھک چکے تھے۔ طلسماتی فضاؤں سے گزرتے ہوئے باب العزیز کی طرف آئے۔ مساجد کی تعمیر مسلمانوں کی عظمت وشان کی غمازی کرتی ہے۔ دنیائے عالم میں جہاں جہاں اسلام کے جیالے گئے وہاں عظمتوں کے مینارے تعمیر کر گئے۔

مسجد الحرام گول شکل میں کعبہ کے اردگرد بنائی گئی ہے۔ محراب دار وسیع وعریض برآمدے خوبصورت سنگِ مرمر کے ستونوں کے سہارے کھڑے ہیں۔ چھتوں پر نہایت خوبصورت، وزنی، بیش قیمت قدیم فانوس لٹک رہے ہیں۔ ساری مسجد میں سرخ رنگ کے دبیز قالین پڑے ہوئے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قرآن پاک اور جوتیاں رکھنے کیلئے الگ الگ چھوٹے چھوٹے شیلف رکھے گئے ہیں۔ لوگ قرآن پڑھ کر واپس رکھ دیتے ہیں۔ مسجد سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں۔ ہم برِ صغیر پاک وہند کے لوگ قرآن کریم کو چومتے اور طاقچوں میں رکھتے پھرتے ہیں۔ یہاں عجب چیز دیکھی۔ ایک عربی خاتون نے بیٹھے بیٹھے قرآن پڑھا۔ فارغ ہونے کے بعد

زمین پر رکھ کر لا پرواہ ہوگئی اور اپنے بچے سے کھیلنے لگی۔عرب کے خطے میں قرآن کا نزول ہوا۔عربوں نے اسکو درختوں کی چھال اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھا ہوا پایا۔یا پھر سینہ بہ سینہ حفظ ہوتا رہا۔عرب لوگ شاید اتنے حساس نہیں جتنے ہم بنیاد پرست ہیں۔

تھکن سے ہمارا برا حال تھا۔باجی بھائی اور بچے ہوٹل کی بس میں واپس چلے گئے۔ہم دونوں بہنیں ناشتہ لینے کے لیے چلی گئیں۔صبح ۶ بجے ہوں گے۔چھوٹا سا عربی مطعم نظر آیا۔مالک نے بنگالی نوکر رکھا ہوا تھا جو صاف اردو بول رہا تھا۔مسور کی دال، اور مرغ کا شوربہ تھا۔لذیذ پراٹھے تھے۔منہ سے رال ٹپکنے لگی۔پراٹھے اور دال لی۔دوسری دوکان سے بند، پیسٹری وغیرہ لیں۔عرب کی بیکری قطعاً پسند نہ آئی۔پراٹھے کھاتے ہی نیند نے غلبہ پالیا۔چند گھنٹے سو کر تازہ دم ہوئے۔اب دوپہر کا وقت تھا، سوچا باہر ریستوران میں جا کر کھانا کھائیں گے۔بھائی اور بچوں نے بال کٹوانا تھے پاکستانی حجام سامنے ہی تھا وہاں ۲ عدد مکھیاں تنگ کر رہی تھیں۔حرم میں بسنے والی مکھیوں کو کون مارے؟ فارغ ہونے کے بعد اسی عربی مطعم میں پھر واپس آ گئے۔عام طور پر ایک کھانا سات ریال میں ملتا ہے۔گوشت، مرغی، سبزی، دال کے ساتھ دو تازہ تنور کی روٹیاں اور سلاد، ہری مرچیں وغیرہ۔کڑاہی مرغی دس ریال میں، ایک ثابت مچھلی دس ریال میں اور روسٹ مرغی بیس ریال میں ملتی ہے۔ٹھنڈا پانی، کوک، سیون اپ، چائے وغیرہ کی قیمت ایک ریال ہے۔بنگالی نے ہمارے آگے کھانا رکھا۔نہایت باریک پلاسٹک کے برتن تھے۔ڈر تھا کہیں پنکھے کی ہوا سے نہ اڑ جائیں۔5 منٹ کے بعد سلاد کے طور پر پیاز کے موٹے موٹے دو تین ڈکرے ملے۔تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر گیا اور چٹنی نما کوئی چیز لے آیا۔آدھا کھانا کھا چکے تو اس نے مٹھی بھر ہری مرچیں ہماری طرف پھینکیں۔ساتھ ہی مالک کی آواز آئی، صلوٰۃُ الظہر۔وہ دوکان بند کر کے نماز کے لئے جانا چاہتا تھا۔ہمیں بہت شرمندگی ہوئی۔ابھی ہمیں مکہ میں آئے ہوئے چند ساعتیں ہی تو گزری تھیں۔نمازوں کے اوقات معلوم نہ تھے۔باقی کھانا ہم نے لفافوں میں ڈالا اور دُم دبا کر بھاگ گئے۔سعودی عرب میں ہر نماز کے وقت

کاروبار بند کر دیا جاتا ہے۔سعودی نماز کے وقت قانون کا احترام کرتے ہیں۔یہ صفت ان میں بہت نمایاں ہے۔نماز کے بعد بازار دوبارہ کھل گئے۔مختلف چھوٹی موٹی سوغاتوں سے لے کر مہنگے سے مہنگا تحفہ اٹھایئے۔آپکو اپنی من پسند قیمت میں سبھی کچھ ملے گا۔مسجد حرام کے گردونواح میں تاحدّ نظر دوکانیں ہی دوکانیں ہیں۔ان چھوٹے دوکان داروں میں اکثریت بنگالی، پاکستانی، ہندوستانی، یمنی اور انڈونیشیا کے باشندے ہیں۔کسی چیز کو ہاتھ لگا دیا تو فوراً مالک لفافہ پکڑ کر بولا کتنا دانہ ڈالوں؟ ہم نے ایئر پورٹ سے تھوڑی سی کرنسی تڑوائی تھی۔اب پھر ہم ایک بنگالی کپڑے والے کی دوکان میں کھڑے تھے۔میں نے بینک کا راستہ پوچھا تو اس بنگالی نے اپنا چھوٹا بھائی ساتھ کر دیا۔یہ بچہ مجھے چھتے ہوئے بازار میں مدھم روشنیوں والی تنگ گلیوں میں لے گیا۔مجھے یوں محسوس ہوا کہ مغلیہ دور کے شاہ عالم بازار لاہور میں لوٹ آئی ہوں۔عجب پُراسرار ماحول، اچانک وہ بچہ ایک کھوکھا نما، قدیم سی میلی کچیلی دوکان کے سامنے رک گیا۔اندر دو بوسیدہ شوکیس رکھے تھے جن میں چاندی کا تھوڑا سا پرانا کالا زیور بہت بے ڈھنگے طریقے سے پڑا ہوا تھا۔ایک طرف لوہے کا وزنی لاکر تھا جس کے دروازے پر مختلف ممالک کی کرنسیوں کے نوٹ بطور اشتہار چپکائے گئے تھے۔میری نظروں میں سوال تھا کہ بینک کہاں ہے؟ ابھی اس سوال نے الفاظ کا پہناوہ نہیں پہنا تھا۔کہ پاس کھڑے ہوئے ایک پاکستانی مجھے دیکھتے ہی بول اٹھے۔جب بھی پیسے لینے ہوں ان کے پاس آیئے ان کی شرح سب سے اچھی ہے۔دوکان میں ایک باریش بوڑھا کاونٹر پر کھڑا تھا اور ایک نسبتاً جوان کالی داڑھی والا آدمی زمین پر پڑی چٹائی پر لیٹا تھا۔دونوں نے میری طرف نظر تک نہ اٹھا کر دیکھا۔میں نے پاؤنڈ اور ڈالر کی شرح پوچھی۔دوکاندار نے مشین پر انگلیاں ماریں اور سر اٹھائے بغیر کاغذ میرے آگے کر دیا۔مجھے ایک پاؤنڈ کے عوض 5.75 ریال ملے۔واپس بنگالی کی دوکان پر آ کر مکہ کی ڈھیروں سوغاتیں لیں۔

حجام کی دوکان کے سامنے ہی بس سٹاپ تھا۔ایک ویگن کو ہم نے ہاتھ دیا۔محمد کلیم اللہ نامی سعودی کی ویگن میں بیٹھے۔میں نے اس سے تمام زیارات دیکھنے کا معاہدہ کیا نیز شعبِ ابی طالب

اور مسجد عائشہ جانے کا معاہدہ بھی 100 ریال کے معاوضہ میں طے ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ درجہ حرارت اوسط 25 درجے رہا۔شہر سے نکلے سڑک بالکل خالی تھی۔ دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہ آتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا سارا شہر سو رہا ہو یا پھر دوپہر کو باہر نکلنے کا رواج ہی نہ ہو۔شہر سے نکلتے ہی ڈرائیور نے دائیں طرف اشارہ کیا بے آب و گیاہ پہاڑیوں پر سوکھی ہوئی نہر زبیدہ کی عظمتوں کے نشان باقی تھے۔ چوڑی اینٹوں اور بھاری پتھروں سے بنائی گئی یہ نہر میل ہا میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی یہ نہر ہزاروں انسانوں کی بھلائی کا سبب تھی۔ اس خاتون کا عزمِ صمیم، اس وقت کی تاریخ کا سنہری کارنامہ تھا۔ جلد ہی ہم نے اس کو پیچھے چھوڑ دیا اور دوسرے راستے کی طرف مڑ گئے۔ ہماری پہلی منزل مکہ سے پانچ میل دور جبلِ ثور تھا۔ ہم بلند سنگلاخ لیکن اس برکتوں والے پہاڑ کے دامن میں کھڑے تھے جس پر میرے دُلارے نبی اور صدیقِ اکبر نے 3 دن تک پناہ لے کر جان بچائی تھی۔ غارِ ثور اسی کی چوٹی پر واقع ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے میل سے زیادہ چڑھائی ہے۔ چڑھتے وقت تقریباً ایک گھنٹہ جبکہ اترتے وقت نصف ساعت درکار ہے۔ اُن تلخ یادوں نے دل اداس کر دیا۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہجرت کے وقت پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے اے مکہ کی وادی تُو مجھے بہت پیاری ہے مگر تیرے باسی مجھے رہنے نہیں دیتے۔ شب کی تاریکی میں کیسے خوف کی حالت میں محبوبِ خدا اور حضرت ابوبکر گرتے پڑتے چڑھتے ہوں گے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دشمن سر پر آ پہنچا تو اسی غارِ ثور کے منہ پر اللہ کے حکم سے بُنا ہوا مکڑی کا جالا اور کبوتری کے انڈے دیکھ کر دھوکہ کھا گیا اس عظیم پہاڑ کا ایک ایک پتھر اپنی داستان خود بیان کرتا ہے۔ یہاں ہم نے تصاویر کھینچیں ہمیں مصروف پا کر ڈرائیور نے مٹی پر ہاتھ مارے اور وہیں پتھروں پر نماز پڑھ لی۔ سعودی کی گھٹی میں نماز کا قیام ہے۔ اس کے بعد وہ گلیوں کے بیچوں بیچ گاڑی چلاتا ہمیں جبلُ النور کی طرف لے چلا جس پر غارِ حرا واقع ہے۔ پہاڑ کی بلندی دیکھ کر عقل مفلوج ہو کر رہ گئی۔ کس طرح حبیب خدا چڑھتے ہوں گے۔ صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی نہیں بسا اوقات بی بی خدیجہؓ بھی آپؐ کی معیت میں عبادت کیا کرتی تھیں۔ میں

پُرجلال و پُرشوکت پہاڑ پر ٹکٹکی لگائے ورطۂ حیرت میں ڈوبی ہوئی دیکھتی رہی اور تصاویر کھینچتی رہی۔ تاکہ ان روح پرور نظاروں کی یادگاریں محفوظ کرسکوں۔ دور بہت دور اقراء باِسمِ ربکَ الذی خَلَق کی صدا میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے خوب حق ادا کیا۔ اس کھوہ سے قرآن کا نور نکلا اور دنیا کے کناروں تک پھیل گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر مجھے رینگتی ہوئی گڑیاں دکھائی دیں۔ غور سے دیکھا، یہ ہماری طرح کے زائرین تھے۔ ہم نے اپنے میزبان ڈرائیور کو بارہا کہا کہ ہمیں دوسری طرف لے چلو جہاں سے غار تک پہنچا جاسکتا ہے مگر وہ اللہ کا بندہ ما معلوم، ما معلوم، کی رٹ لگائے رہا۔ دراصل وہ ہمیں پہاڑ کی پچھلی طرف سے لے کر آیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ غارِ حرا تک جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں اور یہ سفر آدھے گھنٹے کا ہے۔ اس کو اتنا چلنا منظور نہ تھا۔ بدو صاحب چکمہ دے گئے۔ اوپر نہ جانے کا افسوس آج بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتے ہوئے واپس ہوئے۔ اس کے بعد ہم مزدلفہ اور عرفات کے میدان میں بھی گئے۔ پانچ رویہ خوبصورت خاموش سڑکیں حاجیوں کی راہ تک رہی تھیں۔ یہ جگہیں صرف حج کے دنوں میں آباد ہوتی ہیں۔ میدانِ عرفات کے نزدیک ایک ٹیلہ ہے جس پر اوپر جانے کو سیڑھیاں ہیں۔ چوٹی پر جاکر شہر کا نظارہ کیا اور تصاویر کھینچیں۔ وہیں سے وسیع و عریض مسجدِ نمرہ دیکھی جو صرف عیدالاضحیٰ کے وقت آباد ہوتی ہے فقط نمازِ عید پڑھی جاتی ہے۔ باقی سارا سال بند رہتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں محمد ﷺ نے حج کے دن ظہر اور عصر کی نماز پڑھائی تھی اور حجتہ الوداع کا مقدس خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ پہاڑی پر ایک پیشہ ور فوٹو گرافر گاہکوں کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس پہاڑ کا نام جبل الرحمت ہے اور حضرت آدم و حوا یہیں ملے تھے۔

واللہ علم۔ دراصل بات یہ ہے کہ پہاڑوں کے نام لوگوں کو معلوم نہیں۔ یا یوں سمجھ لیجئے تاریخ محفوظ نہیں۔ ہم جیسے متجسس مسافر جب سوال پر سوال کرتے تو عربوں کو جو بن پڑتا جواب دے دیتے۔ اسی ٹیلے کے دامن میں بدو اپنے اونٹوں کو سجائے روزی کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ آتشی گلابی، سبز، زرد، شوخ سرخ رنگوں کے دھاگوں، کپڑوں، پھندنوں، اور شیشوں سے

سجے ہوئے کجاوے ان اونٹوں پر دھرے تھے۔ چند ریال کے عوض اونٹوں کی سواری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد ڈرائیور ہمیں آگ سے محفوظ خیموں کے قریب لے آیا۔ اور کہنے لگا، ھذا مقامِ ابرہہ۔ ھذا مقامِ فیل۔ چشمِ تصور میں مَیں نے دیکھا کہ ابرہہ غرور و تکبر سے سر بلند کئے اپنے عظیم الشان ہاتھی پر سوار چلا آ رہا ہے۔ اچانک اس مقام پر اس کا ہاتھی آ کر رک گیا۔ ہزار جتن کے باوجود نہ اس کو چلنا تھا نہ وہ چلا۔ ربِ کعبہ نے اپنے گھر کو اس کے ناپاک ارادوں سے بچا لیا۔ اسی جگہ فلک سے ابابیلیں اتری تھیں۔ ابرہہ کا لشکر یہیں صحرا کا لقمۂ اجل بنا تھا۔ یہاں الم یجعل کیدھم فی تضلیل پر کی نوید اتری تھی۔ اب یہاں فائر پروف خیمے قطار در قطار کھڑے ہیں۔ ہم تاریخ دہراتے ہوئے۔ پرانے واقعات یاد دلاتے ہوئے اللہ تعالی کو یاد کرتے ہوئے مکہ سے مشرق کی طرف تین میل کے فاصلہ پر منیٰ کے میدان میں آئے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں شیطان نے حضرت ابراہیم کو تین مرتبہ اکسایا تھا۔ ان جگہوں پر تین ستون بنا دیئے گئے ہیں جنکے نام جمرۃ الاولیٰ، جمرۃ الوسطیٰ، اور جمرۃ العقبہ ہیں۔ حج کرنے والے ان جمرات کو کنکریاں مارتے ہیں حاجیوں کی کثرت کے باعث ان ستونوں کو بلند کر کے دو منزلہ کر دیا گیا ہے۔ باجی نے کہیں سے کنکریاں ڈھونڈ لیں۔ یوں ہم نے سنت پوری کی اور استغفار کیا۔

راستے میں ایک پہاڑ کی بلندی پر عالیشان عمارت نظر آئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ سعودی حکمران کا محل ہے۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ ہمیں مکہ شہر سے باہر تعیم جانا تھا۔ یہ مکہ میں رہنے والوں کے لئے میقات ہے۔ عمرہ کرنے کے لئے یہ شرط ہوتی ہے کہ مکہ سے باہر جا کر عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہوا جائے تا کہ ایک گونہ سفر کی شرط پوری ہو جائے کیونکہ حج اور عمرہ کی عبادت کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی خاطر سفر اختیار کرنا بھی ہے اور اپنے شہر سے باہر نکلنا بھی ہے۔ اس جگہہ مسجد بنا دی گئی ہے جس کا نام مسجد عائشہ ہے۔ شاید وہ اس حدیث کی یادگار رہے۔ کہ حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے تنعیم سے عمرہ کا قصد کیا۔ واللہ اعلم، (ترمذی

کتاب الحج) سفید سنگِ مرمر سے بنائی گئی خوبصورت صاف ستھری مسجد ہے۔ہم نے وہاں دونفل ادا کئے۔خاموشی میں ہر کوئی عبادت میں مصروف تھا۔مگر دو خواتین باتوں میں مصروف تھیں جو کہ میری ہم وطن تھیں۔ان کی کہانی سننا گوارا نہ تھا لیکن ان کو خاموش کروانا میرے بس کی بات نہ تھی۔کڑھتے ہوئے ہم باہر آ گئے۔آ کر دیکھا کہ ڈرائیور میاں مشتعل تھے۔شاید ہمارے نفل لمبے ہو گئے تھے۔میں اس سے مخاطب ہوئی کیا تم عورتوں سے ، اخوات سے خفا ہو گئے۔فوراً شرمندگی سے بولا ، لا ، لا ،ضیف ،ضیف ، مہمان کی عزت عربوں کا شیوہ ہے۔

ہم دوبارہ عمرہ کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔تلبیہ کرتے ہوئے ہم نے مسجدِ حرام کا رخ کیا۔آج بہت رش تھا۔صبح سے ہی ہماری قیام گاہ کے سامنے کئی بسیں زائرین سے بھر کر آئیں تھیں۔خانہ کعبہ کے گرد مطاف کی جگہ بھر چکی تھی۔ہم بھی طواف میں مصروف تھے۔اپنے رب کے حضور خشوع وخضوع کرتے ہوئے کعبہ کے غلاف کو پکڑ کر در دِ دل سے خیر الراحمین کو پکارا کئے۔اس جمِ غفیر میں حجر اسود تک پہنچنے کی کوشش بے سود تھی۔استلام پر ہی اکتفا کیا۔طواف سے فارغ ہو کر حطیم میں آئے اور بھیڑ میں پھنس گئے۔بڑی مشکل سے میں نے اور باجی نے نماز کے لئے جگہ بنالی۔ہم سجدے میں پڑے رہے اور پہرہ دار چلاتا رہا۔باقی لوگ اسکی اطاعت میں جلد باہر نکل گئے۔ہم دونوں ہی وہاں رہ گئیں۔جب ہم نے سلام پھیرا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حطیم سعودی فوجیوں سے بھر چکا ہے۔کسی اور کو اندر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ہم سعی کرنے کے لئے چل دیئے۔ہم آدھا فریضہ ادا کر چکے تو اچانک میری نظر کعبۃ اللہ پر پڑی جس کے چاروں طرف لوگ ہی لوگ تھے ہزاروں کی تعداد میں۔شام کا دھندلکا تھا۔وہ اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے خانہ کعبہ کے کھلے در کو چھونا چاہتے تھے۔دروازے کے آگے سیڑھی تھی اور فوج کا پہرہ تھا۔خانۂ خدا میں شاہانِ عرب داخل ہو رہے تھے۔صرف سلاطین ہی نہیں انکی برقعہ پوش بیبیاں بھی ساتھ تھیں۔بعض نے ننھے منے بچے بھی اٹھا رکھے تھے۔یوں تو مسجدِ حرام میں اتنی روشنیاں ہیں کہ رات کو بھی دن کا سماں ہوتا ہے۔مگر خانہ کعبہ کے اندر بالکل اندھیر ہے۔ایک پہریدار کے ہاتھ

میں جیبی ٹارچ تھی جس سے وہ معزز مہمانوں کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ میرے دل میں رشک وحسد کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ کاش ہم بھی یہ اعزاز پا جاتے۔ دل میں طلاطم برپا تھا۔ یہ شعبان کی پندرہ تاریخ تھی یعنی شبِ معراج اور یہ مہمان ملک الکویت کے حکمران تھے۔ ہم دیر تک یہ نظارہ دیکھتے رہے اور اپنی آہوں سے اللہ کی رحمتوں کو سمیٹتے رہے۔ رات بھیگ چکی تو ہم نے تھکے قدموں کے ساتھ اپنی قیام گاہ کا رُخ کیا۔

ان چند دنوں میں ہمیں کئی مرتبہ طواف کا موقعہ ملا۔ پاکستانی ہوٹلوں سے تازہ، لذیذ کھانا، گرم گرم تنوری روٹیاں، چٹنی، ہری مرچیں لے آیئے۔ نوش فرمایئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے۔ محمد ﷺ کی وادی میں ساری نعمتیں میسر ہیں۔

بابُ العزیز کے دائیں طرف بسوں کا اڈہ تھا۔ ہم وہاں ویگن بک کروانے کے لئے گئے۔ وہاں کبوتروں کے لئے دانہ بک رہا تھا۔ زائرین ان کو دانہ ڈالتے۔ کبوتر نہایت بے تکلفی سے سیر ہو کر مسجد کے میناروں پر جا بیٹھتے اور فرصت میں گلابی باتیں کرتے۔ مسجدِ حرام کا بیرونی صحن دھوپ میں بہت گرم ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر نکلے تو یاسر میاں کی جوتی گم ہو گئی۔ صحن کے اختتام پر دیوار کے سایے میں ایک عرب چادر بچھائے جوتیاں فروخت کر رہا تھا۔ ۴ ریال کے عوض چپلیاں لے لیں۔ چند لمحوں میں یہ پریشانی بھی دور ہو گئی۔ جتنے دن بھی ہم وہاں رہے بار بار طواف کرنے کا موقعہ ملا۔

خانہ کعبہ سے تقریباً 50 میٹر کے فاصلے پر زمزم کا کنواں ہے۔ کنویں کے اوپر لمبا سا ستون بنا ہوا ہے۔ اب وہ کنواں تو باقی نہیں ہے۔ تہہ خانے میں وضو کے لئے انتظام ہے۔ یہی وہ بابرکت مقام ہے جہاں نیم مردہ اسمائیل نے ایڑیاں رگڑی تھیں۔ اسی چشمے کے اردگرد بی بی حاجرہ نے پتھر رکھ کر منڈیر بنا دی تھی اور پانی کو سنبھال لیا تھا۔ اسی کنوئیں کو دیکھ کر حضور ﷺ نے مسلمانوں کو اہلِ مصر کے ساتھ نیک سلوک روا رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اور حضرت حاجرہ کے احسان کو یاد رکھنے کی تاکید کی تھی۔ اسی چشمے کے باعث شہر مکہ آباد ہوا۔

ایک شام ہم مقام مولود کو چل پڑے۔ اگر آپ باب السلام سے باہر نکلیں تو تقریباً 200 میٹر کے فاصلے پر مسجد کا بیرونی صحن پار کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی عمارت نظر آئے گی۔ جس پر (مکتبہ مکۃ المکرمہ، تاءسست عام ۱۳۷۰ ھ) کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ جس کو لائبریری بنا دیا گیا ہے۔ اندر چھوٹا سا کمرہ ہے۔ الماریوں میں قرآن پاک کے نسخے رکھے ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے اور دعا کرنے کی اجازت ہے۔ یہی مقام مولود ہے۔ ہاں یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں حضرت آمنہ کے بطن سے نور نکلا تھا جس کی روشنی نے ایک عالَم کو منور کر دیا۔ اس یتیم نے اسی حجرے میں جنم لیا جو شاید اس وقت کھجور کی چھت اور کھجور کے تنوں پر مشتمل تھا۔ اندر مرد تو جا سکتے تھے مگر ہم عورتوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ مردوں کی حاکمیت و فوقیت کا تجربہ یہاں بھی ہوا۔ میرا دل پھٹ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بی بی آمنہ نے جنم دیا تھا۔ ہم بھی اسی آمنہ کی ماننے والیاں ہیں۔ اس بابرکت گھر میں مرد داخل ہو سکتے ہیں۔ عورتوں پر ہی پابندی ہے۔ دروازے پر باوردی سپاہی مقرر تھا۔ میں نے روتے ہوئے دکھی دل کے ساتھ اندر جھانک کر درود پڑھ لیا۔

ایک رات میں نے اور باجی نے دیر تک مسجد میں قیام کیا۔ اس وقت بس نہیں چلتی۔ ہمیں راستہ بھول گیا۔ مکہ کی گلیوں میں گھومتے مختلف چیزوں کا مشاہدہ کرتے رہے۔ بند دوکانوں کے باہر سے گزرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ دوکان کے باہر اندرونی چھتوں کے ساتھ کپڑے، بیگ اور دیگر سامان لٹک رہا تھا۔ یہاں چوری کا ڈر نہیں۔ ننھے ننھے ۳ عدد چوہے کے بچے گلی میں پھر رہے تھے۔ قریب ہی مہربان بلی بھی پھر رہی تھی۔ اکا دکا دُوکان کھلی تھی۔ ایک راہ گیر مقامی عرب سے راستہ پوچھا۔ گرتے پڑتے گھر پہنچے تو رات کے ۲ بج چکے تھے۔

پانچویں دن ہمیں کوچ کرنا تھا۔ ہم طوافِ وداع کرنے چل دیئے۔ گرمی کی حدت زیادہ تھی۔ مطاف میں لوگ کم تھے۔ ایسے وقت میں باجی کو بھی حجر اسود کو بوسہ دینے کا موقعہ مل گیا۔ چلتے وقت دل بہت اداس تھا۔ نہ جانے پھر دوبارہ آنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ ہم الٹے پاؤں

چلتے ہوئے کعبہ کو دیکھتے رہے اور سلام کرتے رہے۔ دل پھٹ رہا تھا۔ خانہ کعبہ سے نظر نہ ہٹتی تھی۔ دوبارہ آنے کی تمنا دعا کی صورت میں دل سے نکلتی رہی۔ قدم بھاری تھے۔ وقت بھی کم تھا۔ جتنے قدم آگے کو اُٹھتے تھے اتنا ہی شوقِ وصل پیچھے کو کھینچتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بابرکت گھر چھوڑنا پڑا۔

ڈرائیور حسین بشرالی مقررہ وقت پر آ پہنچا اور یوں ہم ایک پیارے گھر کو چھوڑ کر دوسرے حسین در کی طرف چل دیئے۔ بالکل نئی اور جدید آسائشوں سے لیس بڑی اور آرام دہ ویگن میں ہم سوار تھے۔ دوپہر 12 بجے ہم نے سفر شروع کیا۔ جتنی عربی ہمیں آتی تھی شاید اس سے زیادہ ہی بول لی ہوگی۔ بشرالی ہر تھوڑی دیر کے بعد سگرٹ سلگا لیتا۔ گرمی میں اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ چھوٹی بہن ذرا زیادہ ہی بزدل واقع ہوئی ہے۔ وہ سارا وقت خطرے کی گھنٹیاں بجاتی رہی کہ ڈرائیور سو رہا ہے۔ کافی دیر وہ برداشت کرتا رہا آخر کار وہ بول اٹھا۔ کہ اتنی دوپہر میں کیوں چلے ہو۔ میں نے کہا۔ نحن احمقاء، (ہم نہایت احمق ہیں) سفر کے دوران میری آنکھ بند ہونے لگی تو ڈرائیور نے فوراً ٹوکا۔ لانوم لانوم (سونا منع ہے) شہروں کی آبادیاں گزر جانے کے بعد لق و دق صحرا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں، مقام استراحۃ، دوکانیں وغیرہ تھیں۔ یہ راستہ آبادی سے ہٹ کر تھا۔ چمکتی ہوئی سڑک پر ہماری ہی گاڑی کا راج تھا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی روکی۔ یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اور ہمیں بتائے بغیر اندر جا کر سو گیا۔ گاڑی کا انجن چلتا چھوڑ دیا تاکہ ہم ایئر کنڈیشن میں بیٹھے رہیں۔ سعودی عرب میں پٹرول ایک ریال فی گیلن ہے۔ ہر مقام استراحۃ پر مسجد بنائی گئی ہے۔ تقریباً گھنٹہ بھر انتظار کرنے کے بعد دوبارہ سفر شروع ہوا۔ جوں جوں مدینہ قریب آتا جاتا درخت نظر آنے شروع ہوئے۔ کچنار اور کھجور کے درخت نظر آئے۔ مکہ سے مدینہ کا فاصلہ تقریباً 400 کلومیٹر ہے۔ شام ۷ بجے ہم مسجد قبا کے سامنے دو نفل ادا کرنے کے لئے رکے۔ مسجد قبا اسلام کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کے وقت مدینہ سے اڑھائی میل کے فاصلہ پر آپؐ نے قبیلہ عوف کے

پاس چند دن قیام کیا۔ یہ زمین دو یتیم لڑکوں کی تھی جو آپ ﷺ کو نذرانے کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے مگر رسول خدا کی حکمتِ عملی نے یہ گوارا نہ کیا۔ آپ نے قیمت ادا کر دی۔ یوں آپ اور صحابہ نے گارے اور پتھروں سے یہ مسجد تعمیر کی۔ رات کا وقت تھا ہم نفل پڑھ کر باہر ڈرائیور کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مسجد کے کسی کونے میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ نیند پوری کر کے وہ آیا اور ہم نے پھر سفر شروع کیا۔ ڈرائیور انجان تھا۔ سارے شہر کے چکر لگاتے اور راستہ پوچھتے ہوئے ہم رات کے 8 بجے مسجد نبوی کے عین سامنے مطلوبہ ہوٹل میں پہنچے۔ مگر یہ جان کر اوسان خطا ہو گئے کہ فنی خرابی کی وجہ سے ہمارا نام کمپیوٹر میں نہیں۔ اب کیا کریں، اللہ کے حضور دعا ہی کر سکتے تھے۔ یہاں ہماری عربی کی بیساکھیاں گر پڑیں۔ ہم نے ایجنٹ سے رابطہ کیا اور ساری بپتا سنائی۔ پھر ہوٹل والوں نے ایجنٹ سے رابطہ کر کے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہمیں اس سے بھی عمدہ ہوٹل میں بھجوا دیا۔ یہ ہوٹل بھی مسجد نبوی سے ۲ منٹ کے فاصلہ پر تھا۔ مدینہ کی فضا نہایت ٹھنڈی اور میٹھی تھی۔ محبت کی چاشنی لئے، خلوص کے پھول نچھاور کر رہی تھی۔ یہاں اللہ کے محبوب نے پناہ لی تھی۔ یہیں آپ نے اپنی زندگی کے آخری دس سال گذارے تھے۔ یہیں آپ ﷺ کا جسمِ مبارک مدفون ہے۔ یثرب کے باسیوں نے جس وفا کا نمونہ دکھایا تاریخ اس کو رہتی دنیا تک یاد رکھے گی۔ موجودہ مسجد نبوی ترکوں کے جذبہ محبت کی عظیم یادگار ہے اس کی تعمیر ۱۲۶۵ء سے ۱۲۷۷ء کے درمیان مکمل ہوئی۔ اس کے مینار اور گنبدِ خضرا ترکوں کی عظمت تعمیر کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کی توسیع سعودی حکومت کا کارنامہ ہے۔ اس مسجد کے چالیس دروازے ہیں۔

صبح سات بجے سے لے کر گیارہ بجے تک عورتوں کا وقت تھا۔ ہجوم، بھیڑ، حبس، سسکیاں، دعائیں، آہیں، عجب سماں تھا۔ میرے تصور میں یہ تھا کہ جالی کے پیچھے قبرِ مبارک نظر آئے گی۔ چاروں طرف ڈھونڈنے کے بعد جب کچھ بھی سمجھ نہ آئی تو سعودی پہریدار سے پوچھا۔

اینَ القبر النبی اس نے اشارہ کیا، درمیان والی محراب کے پیچھے محمد عربی ﷺ کُل عالَم کے بادشاہ ہیں اور دائیں بائیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ مجھ پر جیسے سکتہ طاری

ہو گیا، دل کی کیفیت بیان کرنا مشکل ہے۔ تصور مجھے بہت دور لے گیا۔ یہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھر تھا۔ حضرت عائشہ کے اسی حجرے میں آپ نے کئی برس گزارے تھے۔ یہیں آپؐ نے جوان بی بی عائشہ کی گود میں سر رکھے ہوئے اللّٰھم بالرفیق الاعلی کہتے ہوئے آخری سانس لیا تھا۔ یہیں سے آپؐ بخار کی حالت میں صحابہ کے سہارے مسجد میں نماز پڑھانے آتے تھے۔ میں آپؐ کے گھر کے سامنے کھڑی تھی جہاں میرا محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رفیقوں کے ساتھ سو رہا تھا۔ قریب ہی دوسری امہات کے حجرے تھے۔ اسی مقدس سرزمین پر حضرت جبرائیل نازل ہوا کرتے تھے۔ جتنی توفیق تھی دعا کر ڈالی۔ بائیں طرف اصحابِ صفہ کا چبوترہ تھا۔ یہ وہ جاںنثارانِ اسلام تھے جو دین سیکھنے کے لئے دن رات وہیں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اس جگہ بھی نفل پڑھنے کا موقعہ ملا۔ اسی مسجد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔ اسی چھت کے نیچے آپ جبرائیل کے ساتھ قرآن کے دور کیا کرتے تھے۔ اسی سرزمین پر گھاس پھونس کے جھونپڑوں تلے خیرُ البشر اسلام کی فتوحات کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ اسی جگہ مالِ غنیمت آتا تھا تو ڈھیر لگ جاتے تھے اور شام سے قبل رحمۃ للعالمین غربا میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ قبر مبارک کے سامنے کا کچھ حصہ سبز رنگ کے قالینوں سے مختص کیا گیا ہے۔ اس کو ریاض الجنتہ کہتے ہیں۔ یعنی جنت کا ٹکڑا۔ اس کے بائیں طرف منبرِ نبوی ہے۔ جس پر کھڑے ہو کر حضرت بلال اذان دیا کرتے تھے۔ حضور اسی جگہ بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ یہیں آپؐ نے انسانیت کو غلامی سے نجات دلائی۔ وصالِ حضورؐ کے بعد حضرت بلال نے اذان دینی چھوڑ دی۔ مگر جب شام کی فتوحات کی خبر حضرت عمر کو ملی تو آپ نے بلالِ حبشی کو اذان دینے پر مجبور کیا۔ وہیں اذان دی گئی۔ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ اتنا روئے کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ اور پھر ایک دن جب حضرت بلالؓ کی وفات ہوئی تو بادشاہِ وقت حضرت عمر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حسین تعلیم کی روشنی میں فرمایا۔ کہ آج مسلمانوں کا سردار گذر گیا۔ دین کے پھیلانے کا سرچشمہ مدینہ بنا۔ خیالات کہیں کے کہیں بھٹک گئے۔ ضمیر نے جھنجوڑا کہ یہ وقت تو درود شریف پڑھنے، حضور کے دائمی فیضان کیلئے اللہ کے حضور

دعا کرنے کا ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دین کی غیرت عطا فرمائے۔ان کے اختلافات دور فرمائے اوران کومتحد کردے آمین۔

روضۂ مبارک کی زیارت کے بعد ہم نے بازار کارخ کیا۔اوراپنے عزیزواقارب کے لئے سوغاتیں جمع کرنی شروع کردیں۔مدینہ کی وادی میدانی علاقہ ہے۔مسجد کے اردگرد کا علاقہ خوبصورت ہوٹلوں اور دوکانوں پر مشتمل تھا۔ایک آواز جواس سکوت کوتوڑ رہی تھی۔وہ قرآنِ پاک کی تلاوت کی کیسٹ تھی جو کتابوں کی دوکانوں پر لگی ہوئی تھی۔اس خوبصورت اور دل موہ لینے والی آواز سے سرورطاری ہورہاتھا۔مکہ اور مدینہ کی فضاؤں میں ہم نے کہیں ریڈیو یا گانے کی آوازنہیں سنی۔مدینہ میں اردو کتابیں عام مل جاتی ہیں۔یادگاری تصاویرخَریدئے۔قسم ہاقسم کے تحائف اٹھائیے۔مکہ کی طرح یہاں بھی پاکستانی ریستوران اور دنیا جہان کے پکوان نظر آئے۔قیمت بھی وہی تھی۔مدینہ میں مختلف پاکستانی لوگ زیارتیں کروانے کے لئے زائرین کو تلاش کرتے ہیں۔ان کا روزگارکمانے کا ایک یہ بھی ذریعہ ہے۔ایسے ہی ایک صاحب نے ہمیں بھی گھیرلیا یہ اچھی تاریخ جانتے تھے۔اگلے دن صبح سویرے ہم مدینہ کی سیر کو نکلے۔شاہراہ عبدالعزیز پرہم نے اپنا سفرجاری رکھا۔راستے میں نخلستان ہی نخلستان نظرآئے۔سڑک کے ساتھ ساتھ ہریالی،کھجوراوردوسرے درخت دیکھنے کو ملے۔مسجدزرہ کے پاس سے گزرے،یہ وہ جگہ ہے جہاں حضورؐ نے صحابہ میں اسلحہ تقسیم کیا تھا،فوج کی درستی کی تھی اورکچھ دیرقیام فرمایا تھا۔یادگار کے طور پر یہاں مسجد بنادی گئی۔اس کے بعد ہم نے مسجد استراحتہ دیکھی۔آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب احد کے شہداء کی زیارت کو جاتے تو یہاں استراحت فرماتے۔اب ہم مدینہ سے 3 میل دورشمال کی جانب احد پہاڑ کے دامن میں آگئے یہ دورتک پھیلا ہوا پہاڑی سلسلہ ہے۔جبلِ احدصدیوں سے شان وتمکنت سے کھڑا ہے۔احد کی وادی خونچکاں داستان لئے آہیں بھرتی ہے۔اس وادی میں تین طرف پہاڑ ہیں۔اور ایک طرف وہ درّہ ہے جس کا نام جبلِ رماۃ ہے۔جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 50 تیرانداز کھڑے کئے تھے۔ہم اس چھوٹے سے ٹیلے کے اوپر چڑھے تاریخ کا

یہ کربناک واقعہ یاد آ رہا تھا۔اسی ٹیلے کو خالی پا کر بہادر جرنیل خالد بن ولید کی عقابی نظروں نے پیچھے سے حملہ کیا تھا۔ ایسی بھگدڑ مچی تھی کہ 70 صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا تھا۔اسی جنگ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو دانت بھی شہید ہو گئے تھے اسی عظیم جبل احد پر آپ نے پناہ لی تھی۔ یہیں ہندہ کے غلام وحشی نے عقب سے جنگ کی روایات کے خلاف شیر عرب حضرت حمزہ کو بے خبری میں شہید کر دیا تھا۔ اسی میدان میں ہندہ نے آپ کا مثلہ کیا تھا۔ آپ کا کلیجہ اور اعضائے تناسل کا ہار پہن کر جنگ بدر میں مرنے والے باپ اور بھائی کا انتقام لیا تھا۔تاریخ کا یہ باب آج بھی خون کے آنسو رلاتا ہے۔ یہاں آ کر دل بہت اداس ہوا،اس ٹیلے سے کچھ فاصلے پر پتھروں سے بنائی گئی اونچی فصلیں تھیں۔ بہت اونچا لوہے کا گرد آلود ٹوٹے ہوئے شیشوں والا دروازہ تھا۔ان دیواروں کے پیچھے ۷۰ شہداء ابدی نیند سو رہے تھے۔ہم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ایک گپلا سا بدو بچہ تیزی سے قریب آ کھڑا ہوا اور سلام پڑھنا شروع کیا۔ یا عباس سلام۔ یا مصعب سلام۔ یا عبد اللہ سلام یا حمزہ سلام۔ہمیں کچھ سمجھ نہ آئی۔ہم نے توجہ نہ کی۔ دراصل وہ ہماری طرف سے سلام پڑھ کر ہم سے پیسے وصول کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گیا۔جبل احد کے دامن میں بازار لگا ہوا تھا یہاں ہر چیز شہر مدینہ سے سستی تھی۔ ان سوداگروں میں عربی اور عجمی بھی تھے جو نہایت اطمینان سے تیز دھوپ میں بغیر کسی چھتنار کے زندگی کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ وہاں سے اداس دل کے ساتھ واپس ہوئے۔ جگہ جگہ نخلستان تھے۔ پھر ہم حضرت عثمانؓ کے اس کنوئیں کے کھنڈرات کے پاس آئے جو آپ نے ایک یہودی سے خَرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ نشان اپنی عظمتوں کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم نے مسجد قبلتین (یعنی دو قبلوں والی) دیکھی یہ وہ جگہ ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز کے دوران وحی کے ذریعہ خانہ کعبہ کی طرف رخ پھیرنے کی بشارت ملی۔اس سے قبل مسلمان مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔اس مسجد کے قریب باغات ہی باغات تھے۔ وہاں سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر پہاڑیوں پر بہت خوبصورت مصنوعی آبشار بنائی گئی ہے۔

وہاں سے ہوتے ہوئے ہمارا راہنما ہمیں شارع قبا پر مسجد قبا میں لے آیا۔ہم مدینہ آتے وقت اس مسجد میں پہلے بھی آ چکے تھے۔دوبارہ آنا بھی بہت بڑی خوش نصیبی تھی۔ایک دفعہ پھر ہمیں یہاں نفل پڑھنے کا موقعہ ملا۔مسجد قبا کے قریب بئر خاتم کے نشان ہیں اس مقام ہر تین بڑے بڑے پتھر رکھے گئے تھے۔یہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگوٹھی گم ہوئی تھی جو حضرت عثمانؓ نے پہن رکھی تھی۔اس تعلق سے اس کنوئیں کا نام بئر خاتم پڑ گیا۔یہاں سے ہم جنگ خندق والے مقام پر آئے۔اس مقام پر سات مساجد تعمیر کی گئیں۔اس سڑک کا نام شارع خندق ہے۔مدینہ میں چاروں خلفاء کے نام پر بنائی گئی مساجد دیکھیں۔قدیم وقتوں میں ان خلفاء نے مہمان خانے بنا کر وقف کر دیئے تھے۔ترکوں نے ان کو یادگار کے طور پر مساجد بنا دیا۔صرف یہی نہیں بلکہ یہ مکتب بھی ہیں۔مسجد عمامہ دیکھی،اس جگہ عید کی نماز پڑھی جاتی تھی۔وہاں سے ہم اس مقام پر آئے جہاں پہلا جمعہ ادا کیا گیا تھا یہ مسجد جمعہ کہلائی۔اس کے بعد ہمارا تاریخ دان راہنما بائیں طرف ہمیں ایک احاطے میں لے گیا۔یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام استقبال تھا جہاں قبیلہ نجار کے لوگ ہر روز انتظار کیا کرتے تھے۔واللہ اعلم۔پھر ہم بئر عرس پر آئے دوستون اور کھنڈرات باقی تھے۔اس کنوئیں کا پانی کھارا تھا۔رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا لعاب دہن ڈالا تو پانی میٹھا ہو گیا۔ایک نخلستان کے پاس سے گزرے جہاں حضرت سلمان فارسی ایک یہودی کے ہاں ملازم تھے۔صحابہؓ کرام نے ایک سو درخت لگانے کے عوض حضرت سلمانؓ کو آزادی دلائی۔اس کے بعد ہم ایک نالے کے پاس سے گزرے۔کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے یہاں کی مٹی منگوائی اس میں لعاب لگایا۔جس سے شفا ہوئی۔لوگ یہاں سے مٹی بھر بھر کر لے جاتے تھے۔سعودی حکومت نے شرک کے ڈر سے وہاں نالہ کھود دیا اور پانی چلا دیا۔اب ہمیں جنت بقیع کی جالی نظر آئی جس میں سینکڑوں صحابہ حضرت عثمانؓ اور ازواجِ مطہراتؓ دفن ہیں۔آخر میں ہم نے مسجد اجابہ دیکھی۔اب ہم شارع الملک فہد پر پہنچ گئے۔یہیں ہماری قیام گاہ تھی۔شام کے وقت ہمیں اس بابرکت قبرستان میں جانے کا موقعہ ملا۔خواتین کا وقت شام سات بجے تھا جبکہ اندھیرا پھیل

چکا تھا۔ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے اور دعا کرتے ہوئے واپس آ گئے۔

مدینہ کے لوگوں کو ہم نے بہت با اخلاق پایا۔مہمانوں سے ادب اور احترام ان کو ورثہ میں ملا ہے۔مکہ اور مدینہ کے لوگوں کا عام لباس ایک لمبا کرتہ ہے۔ڈھیلا ڈھالا سفید چوغہ نما کرتہ جو پاؤں تک ہوتا ہے۔سر پر تین تکون والا سفید رومال یا پھر سرخ وسفید رومال پہنا جاتا ہے جس کو کالے چھلے کے ساتھ سر پر مضبوطی سے رکھا جاتا ہے۔سعودی عورتیں کھلا ، پاؤں تک لمبا برقعہ پہنتی ہیں سکارف سے سر بہت اچھی طرح ڈھانپتی ہیں ۔میں نے مکہ یا مدینہ میں کسی سعودی عورت کے بال نہیں دیکھے۔بعض خواتین نقاب سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہیں ۔اس گرمی میں ہم نے خواتین کو کالے دستانے بھی پہنے ہوئے دیکھا۔ بچوں کا اسکول کا یونیفارم بھی ایک لمبا کرتہ ہے۔سعودی خواتین گھر میں کھانا پکانا پسند نہیں کرتیں، عام طور پر کھانا بازار سے آتا ہے۔

مدینہ کے چپہ چپہ پر حضورﷺ کی یادیں بکھری ہوئی تھیں ۔26 اکتوبر کو ہماری روانگی تھی۔صبح سویرے ہم ایک مرتبہ پھر روضہ مبارک پر گئے۔ بجھے ہوئے اداس دل کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے واپس لوٹے۔دوپہر کے کھانے کے بعد ہم جدہ کے لیے روانہ ہو گئے۔محمد کلیم اللہ ڈرائیور مقامی نہیں تھا۔ وہ تین مرتبہ راستہ بھولا۔بار بار ایک جگہ گاڑی روک لیتا جہاں سے گنبد خضراء نظر آ رہا تھا۔ہم شدت جذبات سے بے چین ہو رہے تھے۔

بہت سی تصاویر کھینچ ڈالیں۔گاڑی میں بیٹھتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ یہ جان کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ہم جس سڑک پر تھے وہ وہی راستہ تھا جو حضورﷺ نے ہجرت کے وقت چنا تھا۔اسی کو طریق ہجرت کہا جاتا ہے۔ہم ایئر کنڈیشن گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے اور تاریخ دُہرا رہے تھے مگر آج سے کئی صدیاں پہلے آنحضورﷺ چھپتے چھپاتے، دشمنوں سے جان بچاتے بغیر رکے دن رات چلتے ہوئے 8 دن کا سفر طے کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے۔سڑک کے کنارے مختلف دعاؤں کے بورڈ نظر آئے۔مدینہ کے اردگرد پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔مدینہ کے بعد دوسرا شہر میم پڑتا ہے۔صحرا، پہاڑیاں۔کہیں پہاڑیوں کے دروں سے گاڑی گزرتی۔کئی مقامات پر

الیتیمہ (یتیم خانے) نظر آئے۔ ٹیلے اور پتھریلی چٹانیں ہم سے دوستی کا ہاتھ بڑھاتی رہیں۔ اَ یک کے جھنڈ، خودرو جھاڑیاں اور بکریاں چرتی دکھائی دیں۔ مجھے یاد آیا اسی راہ پر آنحضورؐ ایک پتھر کے سایہ میں سو رہے تھے تو حضرت ابوبکرؓ نے ایک چرواہے سے دودھ لیا تھا۔ اللہ کے محبوب کو دوران سفر بکری کے دودھ کی نعمت ملی۔ مگر ہمیں پیاس محسوس ہوئی تو استراحۃ ساسکو میں گھس گئے ٹھنڈے مشروب اور آئیس کریم سے پیاس بجھائی۔ یہ نعمتیں بھی پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہی فیضان تھے۔ شہر اور گاؤں گذرتے رہے۔ مختصر آبادیوں کے بعد پھر تا حد نظر پتھریلے میدان آتے رہے۔

سارا راستہ ان کلمات کے بورڈ نظر آتے رہے۔ اللہ اکبر۔ لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ سبحان اللہ۔ اذکر اللہ۔ محمد رسول اللہ۔ اللّٰھم صَلِّ علیٰ محمد۔ تَوَکَّلْ علی اللہ۔ الحمد للہ۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔

جدۃ الحمنہ کے قریب باغ نظر آیا اس کا نام مزرعہ ہجرہ ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے دوران قیام پذیر ہوئے تھے۔ دل کی کیا حالت ہوئی مت پوچھئے۔ ہم ایک دوسرے کو تاریخ یاد دلاتے محو سفر تھے۔ اب وادی ارن کا بورڈ نظر آیا۔ دائیں طرف پہاڑی پر نہایت موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ مسکن خالد بن ولید۔ ہم نے چیخ چیخ کر ڈرائیور کو گاڑی کھڑی کرنے کو کہا۔ قف۔ قف کا شور مچایا۔ گاڑی 160 سے 200 کی رفتار پر بھاگ رہی تھی۔ وارننگ لائٹ متواتر جل رہی تھی، وہ روک نہ سکا سورج ڈھل رہا تھا۔ افسوس ہم اس جگہ تصاویر نہ اتار سکے۔ شہر المسماۃ کے قریب نہ جانے کب کی حادثے کی نذر شدہ گاڑیاں الٹی پڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر ڈرائیور نے کچھ دیر کے لیے رفتار آہستہ کر لی۔ اب ہمارے سامنے وادی ستارہ تھی۔ یہاں گھاٹیاں اور نشیبی علاقہ تھا۔ کھلے صحرا میں ڈوبتا ہوا نارنجی سورج بہت حسین لگ رہا تھا۔ ہم استراحۃ پر رکے۔ یہ وادی گدید تھی۔ یہاں 30 کے قریب انگیٹھیاں لگی ہوئی تھیں۔ بچوں کی کھیل کی جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ چند منٹ ٹھہر کر ہم وادی الظبیہ میں داخل ہو گئے اور 26 اکتوبر کا سورج سرمئی

پہاڑیوں کے عقب میں ڈوب گیا۔ ہمارے دل خوشی و غم کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے۔ ڈرائیور سے ہم نے بے شمار سوالات کر ڈالے۔ ہمارا جذبہ شوق دیکھ کر اس نے کیسٹ لگا دی۔ صحرا کی خاموشی کو حسین نعت نے توڑ دیا۔

طلع البدر علینا ۔ من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ۔ ما دعیٰ للہِ داع

ڈرائیور جھوم جھوم کر آواز ملا رہا تھا۔ اور انگلیاں اٹھا اٹھا کر ہمیں بھی ترغیب دے رہا تھا۔ چشم تصور میں ہم بھی دف بجا بجا کر مدینہ کی بنات کے ساتھ گا رہے تھے۔ ہم پر رقت طاری تھی۔ اس نے کیسٹ کو ۷۔ ۸ دفعہ سنایا۔ یہ منظر ہم کبھی نہ بھلا سکیں گے۔ ڈرائیور کی طبیعت میں مزاح بھی بہت تھا۔ اس کا گھر جدّہ کے قریب ہی تھا۔ ہاتھ میں موبائیل تھا۔ اس دوران اس نے کئی افراد کو فون کر ڈالے۔ اپنی بیگم کو بھی بلا لیا۔ اس کا بھائی سڑک کے کنارے چھوڑ گیا۔ خود ڈرائیور صاحب 12 جماعتیں پڑھے ہوئے تھے لیکن بی بی نے اسکول کا منہ نہ دیکھا تھا۔ مسلمان امیر عرب ملکوں میں عورت کا ایک یہ بھی روپ ہے۔ یہاں کی حکومت کو تعلیم کی طرف توجہ نہیں۔ ہم نے بیگمات کی تعداد پوچھی۔ جواب ملا۔ اللہ واحد۔ زوجہ واحد۔ آج کا عام عرب تعدادِ ازدواج کا قائل نہیں۔ مگر کئی سلاطین کے حرم بہت سی دوشیزاؤں سے سجے ہوئے ہیں۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ہم جدہ ایئر پورٹ المطار عسفان کے سامنے آ رُکے۔ ان دونوں ہمسفروں کو خدا حافظ کہتے ہوئے دل اُداس تھا۔ تیزی سے چھوٹے سے ایئر پورٹ کا جائزہ لیا۔ ریستوران سے 90 ریال کے عوض دو عدد پیزے لیے۔ حالانکہ عرصہ قیام میں ہم ایک کھانا 7 یا 10 ریال میں کھاتے چلے آئے تھے۔ میں نے گوشت والے پیزے کا آرڈر دیا تھا 35 منٹ کے بعد پیزا ملا۔ میرے پاس خوردبین نہیں تھی کہ میں گوشت کے ٹکڑے تلاش کر پاتی ، بہرحال اللہ کا شکر کرتے ہوئے کھایا ، کچھ نہ بچایا۔

رات 2 بجے ہماری پرواز کا وقت تھا۔ ایئر پورٹ کی دوکانوں پر چکر کاٹتے ٹہلتے ، گرتے

پڑتے وقت گزر گیا۔ ایک ہی دعا تھی کہ اے ارحم الراحمین یہ عمرہ قبول فرما اور اپنے فضلوں سے ہمیں یہاں دوبارہ بھی آنے کی توفیق دینا۔ آمین۔

جہاز میں بیٹھے، جہاز وقت پر اڑا۔ ہم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دھرتی کو خیر باد کیا، مگر دل اسی طلسماتی ماحول میں کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا یا پھر روضہ مبارک پر آنسو بہا رہا تھا۔

اس سفر نامے کی تحریر میں باوجود کوشش کے کئی الفاظ مجبوراً انگریزی کے لکھنے پڑے، جس کیلئے معذرت خواہ ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم احمدیوں کے حال پر رحم فرمائے اور ان فرمانرواؤں کو نیک ہدایت دے، جو اللہ کے گھر کی زیارت سے روکتے ہیں ان کو اس ظلم سے روکے اور ہمیں بار بار اپنے کعبہ کی زیارت کی توفیق دے۔ آمین۔

دنیا کے فرمانرواؤں کو نیک ہدایت دے اور ہمارا حج بھی کھول دیں۔ کتنی بدنصیبی ہے کہ ہم ان نوروں سے محروم ہیں۔ ہر جگہ ہر ممکن دعائیں کیں۔ میرا سمیع و مجیب خدا قبول فرمائے۔ آمین۔

۞ چند الفاظ ۞

اپنے پیارے بچوں کے لئے

۞

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیاری رافعہ، باسط رحمان، رمیز شافی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ

میرے اس مضمون کے لکھنے کا مقصد اپنے بزرگوں کی باتیں آپ تک پہچانا ہے۔ وہ ہستیاں جو مر کر امر ہو گئیں اور اپنے پیچھے وہ نشان چھوڑ گئیں جو ہم سب کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں سے جو چیز سب سے پہلے مَیں نے سیکھی ہے وہ ہے لا الٰہ اِلاَّ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ میرے لئے سب کچھ ہے وہ علیٰ کُلِّ شیئٍ قدیر ہے (وہ ہر چیز پر قادر ہے) اس کے پاس ہر ایک طاقت ہے وَ کَانَ اللّٰہُ علیٰ کُلِّ شَیئٍ مُقتَدِراً ۔

(اللہ تعالیٰ کو ہر شے پر قدرت حاصل ہے) ہر شے اللہ تبارک تعالی کے احاطہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مانگتے وقت مَیں یہ سوچتی ہوں وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُواً اَحَدٌ کوئی اس کی صفات میں برابری نہیں کر سکتا اس کی ہر صفت افضل ہے۔ وہ اَرۡحَمُ الرَّاحِمِیۡنَ ہے سب کائنات کی مخلوقات سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ رحمن ہے رحیم ہے۔ جب سے مَیں پیدا ہوئی ہوں اپنے اردگرد لاکھوں نعمتوں کے انبار دیکھے ہیں جن کو مجھے مانگنے کا شعور نہ تھا جو رحمان خدا نے میرے لئے سجا رکھی ہیں مگر کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کی مجھے خواہش ہوئی اور اس خیال کو مدنظر رکھ کر مانگا کہ وہ بے حد دینے والا ہے وھابؔ ہے رزاق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے بننے کے لئے اس نے ہمیں خود ہی راہ سُجھا دی ہے اور وہ ہے

نماز جس کا حساب روزِ قیامت سب سے پہلے ہوگا۔ابھی سے نماز کی عادت ڈالیئے اگر دیر کر دوگے تو پھر یہ عادت نہیں پڑے گی۔اسی لئے نماز اور قرآن باقاعدگی سے پڑھنے پر زور دیتی ہوں یاد رکھیئے جس نیکی کو باقاعدہ کیا جائے جس نیکی پر استقامت اختیار کی جائے وہی افضل نیکی ہوتی ہے۔جوانی میں اچھی عادتیں ڈالنے کی کوشش کیجیئے۔پھر یہی عادتیں زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں اور محسوس بھی نہیں ہوتا۔

جب میرے ذہن میں یہ براخیال آتا ہے کہ فلاں مشکل کام کیسے ہوگا تو مجھے اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں بَلٰٓی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر ۔(سنو،خبردار وہ ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے)اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ بھی خوب میرے دل کو مضبوط کر دیتا ہے کہ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر (کیا تم نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ کی قدرت ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے)خدا تعالیٰ پر یقین نہ ہوتو انسان مایوس ہوجاتا ہے اور دوسروں کو معبود بناتا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ اپنی عقل کو اپنی الٹی سیدھی تدبیر کو یا کسی انسان کو معبود بنالیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ فلاں اس کا کام سنوار دے گا۔اللہ تعالیٰ پر اگر یقین کم ہوجائے اور غیروں کی طرف توجہ ہوجائے تو یہ شرک کہلاتا ہے۔اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔اس بات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہو اور سمجھو کہ ہلے بغیر ہر کام ہوجائے گا۔قویٰ کا استعمال نہ کرنا تکبر ہے مجھے امامِ وقت حضرت مسیح موعودؑ کے یہ الفاظ بہت یاد رہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو مت آزماؤ۔پوری تدبیر کرو اور پھر اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔

ہر کام کے شروع کرنے سے پہلے دعا کرنی چاہئے دین و دنیا کے علوم سیکھنے کی تمنا اور پوری کوشش کرنی چاہئے اور یہ بھی تمنا اور دعا ہو کہ نفع دینے والا علم ملے۔ہر چیز محنت کرنے سے ملتی ہے پھر اگر کسی چیز کو پانے کے لئے بہت کوشش کی گئی ہو اور وہ نہ ملے تو یہی سمجھنا چاہئے کہ اسی میں خدا تعالیٰ کی کوئی بہتری ہوگی۔

ہر اہم فیصلے اور کام سے پہلے سورۃ الفاتحہ، درود شریف، لاحول، استغفار، پڑھتے ہوئے اللہ

تعالیٰ سے توفیق مانگنی چاہیئے۔ حضرت موسیٰ کی یہ دعا میری آزمودہ ہے۔ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْر (اے میرے رب جو بھی تو کوئی اچھی چیز مجھے عنایت کرے میں اس کا محتاج ہوں) ہم انسان گناہ کے پُتلے ہیں۔ اس نیت سے گناہ نہیں کرنا چاہیئے کہ اللہ بخش دے گا بلکہ گناہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر حُسنِ ظن رکھتے ہوئے معافی مانگنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ تواب ہے توبہ قبول کرنے والا ہے غَافِرُ الذَّنْبِ ہے، خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ ہے سب سے بڑھ کر گناہ کو معاف کرنے والا ہے سمیع و مجیب ہے انسان کی پکار کو سننے والا ہے اور ہم سے بے انتہا محبت کرنے والا ہے۔ خیر الراحمین ہے غفور ہے ودود ہے۔ غلطی ہو جائے تو صدقہ دینا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی صفات سے پکارنا چاہئے۔ یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ انسان کی پیدائش کے دو مقاصد ہیں۔ ایک ہے حقوق اللہ یعنی ہم سچے دل سے اللہ کے حضور جھکیں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ دوسرا حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق ہیں۔ اس میں صرف اپنا خاندان نہیں آتا بلکہ ہمارے اردگرد رہنے والے سب لوگ شامل ہیں۔

جب ہم کسی کو دینے لگیں تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ امی ابو بہن بھائیوں کے علاوہ دوسرے قریبی عزیز بھی ہیں پھر اس کے بعد دور کے رشتہ دار ہیں پھر ضرورت مند، غریب، محتاج، بیمار، مسکین اور مسافر کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ مدد صرف پیسہ دینے سے نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ کسی کے ساتھ باتیں کرنے سے اس کا دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی خدمات بھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔ کسی کا سامان اٹھانا، لفٹ دینا، سودا سلف لا کر دینا، جتنی خدمتِ خلق ہم کر سکیں اتنا ہی خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے ہر نیکی خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے ہو اور ہر گناہ سے بچنا اللہ کے ڈر سے ہو۔ اس زمانہ میں اسلام بہت غریب ہے۔ جو چندہ ہم ادا کرتے ہیں وہ اسلام کی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رستہ میں مال خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہر کراؤن کے بدلہ میں دس گنا زیادہ ملتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

ایک بات جس کی میں اپنے پیارے بچوں کو تاکید کروں گی وہ ہے وقت کا صحیح استعمال

کرنا۔آج کل ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ایک کے بعد دوسری دلچسپی تیار ہوتی ہے۔سائنس کی ان ایجادوں کے بہت فوائد بھی ہیں لیکن ان کا بہت زیادہ استعمال کئی لحاظ سے نقصان دہ ہوتا ہے۔ آنکھیں، کندھے، کمر میں عام طور پر درد ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ نیند نہیں آتی۔جب زیادہ دیر کمپیوٹر پر بیٹھو گے تو نینداڑ جاتی ہے۔تھکاوٹ اور طبیعت چڑ چڑی ہو جاتی ہے الارم لگا کر کچھ دیر کے لے کمپیوٹر پر بیٹھنا چاہیئے۔

ہر ایک کا احترام ضروری ہے۔جیسے ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارا احترام کریں ہمیں بھی اس بات کا خیال رکھنا ہوگا۔بڑوں کا ادب، والدین کی عزت، ہر استاد کا احترام، نیز اپنے دینی بھائیوں کی عزت بھی بہت ضروری ہے۔کوئی مصیبت یا مشکل میں گھر جاؤ تو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم کہاں غلط ہیں؟ بجائے اس کے کہ دوسروں کو الزام دو۔اپنی غلطی کو مان لینا بہادری ہے۔اپنے قصور پر فوراً معذرت کر لینی چاہیئے اسی میں آپ کی عزت اور بڑائی ہے۔کسی کا دل کبھی نہیں دُکھانا کبھی آپ سے دوسرے پر ظلم نہ ہو۔مظلوم کی آہ اور بددعا سے بچنا چاہیئے۔

اچھے، صالح اور نیک شریف لوگوں سے دوستی رکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔یہ دعا کرتے رہیئے

اَللّٰھُمَّ اجْلِسْنِی جَلِیساً صَالِحاً۔

(اے اللہ مجھے نیک دوست عطا کر) اگر آپ کو محسوس ہو کہ آپ کے دوست کسی بُری عادت میں مبتلا ہیں فوراً ان سے خاموشی سے علیحدہ ہو جائیں۔ان دوستوں کو کبھی بھی دشمن نہ بنائیں۔

دوسروں کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے خلاف مذہبی، اور قومی اختلافات بہت زیادہ ہیں۔یہاں مذہب کا احترام یا قدر نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔لوگوں کو کھلی آزادی ہے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ہمیں ان کے پیچھے نہیں چلنا۔

ہم وہ خوش قسمت ہیں جن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امت میں شامل ہونے کی توفیق ملی پھر امامِ وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے کی بھی توفیق ملی اور اس کے بعد ہم خلافت سے جُڑ گئے۔یہ تعلق بہت پیارا اور بابرکت ہے۔ساری عمر آپ کی یہی کوشش رہے کہ خلافت سے

جُڑے رہیں اور اپنی نسلوں کے دلوں میں بھی خلافت کی محبت قائم کریں ۔ جہاں بھی آپ رہیں ایک اچھا احمدی بن کر رہیں ۔کبھی اپنی جماعت کے لئے بدنامی کا باعث نہ ہوں ۔کوئی غلطی ہو جائے توفوراً معذرت کرلینی چاہیئے ۔دین کا ہر کام خوشی سے کیجئے ۔

آپ سب بہن بھائی آپس میں بھی دوستی اور پیار سے رہیئے ۔درودشریف پڑھنے کی طرف بہت توجہ دیجئے ۔دوسری دعاؤں کے علاوہ اپنے ایمان کی حفاظت اور ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیئے ۔آپ کا ہر دن اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اور دین کو فائدہ پہنچاتے ہوئے گذرے ۔تمام عمر علم حاصل کرنے کی تمنا کیجئے ۔کتابیں آپ کی دوست ہوں ۔ اپنی تنہائیاں مطالعہ سے دور کیجئے ۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے امی ابو کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے بنائے اور آسمانِ احمدیت کے ستارے بنائے ۔

ہمیشہ آپ کے لئے دعا کرنے والی

آپ کی امی

21فروری2012

دعا--(اپنے پیارے بچوں کے نام)

(شاہدہ متین)

الٰہی خلافت کو رکھنا سلامت
ہم میں یہ نعمت رہے تا قیامت
الٰہی ہمیں طاعتِ دیں سکھا دے
غلامِ مسیحا کا پیارا بنا دے

الٰہی کریں نہ کوئی کام مندا
کہ جس سے ہو اسلام کا نام گندا
علوم و معارف سے جھولی تُو بھر دے
حکمت ،فراست نصیبوں میں کر دے

اپنے فضل سے وہ طاقت عطا کر
کہ جس سے ہوں اسلام کے سچے خادم
مصائب میں ثابت قدم ہوں ہمیشہ
وفا دے، غنا دے، اورتقویٰ عطا کر

سلیقۂ تبلیغ ہم کو سکھا کر
ہر عُقدہ وا کر، بصیرت عطا کر
گر کوئی نہ زباں میری سمجھے
اے قادر تُو لکھنے کی طاقت عطا کر

خلیفہ ہمارا فخر اس جہاں کا
محافظ بنا احمدِ گلستاں کا
تسلط ہو تیرا ہمارے دلوں پر
بنا ہم کو ناصر تو اس پاسباں کا

مسیح آیا مدفوں خزانے لُٹانے
علوم و معارف لگا پھر بتانے
پیام محبت بھرے یہ ترانے
یہ گیت اور نغمے ہمیں ہیں سنانے

گناہوں کی توفیق نہ دے اے مالک
مِٹا دے میرے سیاہ دل کی کالک

اندھیرے نفس کو اُجالا بنا دے
ہمارے دلوں کو مصّفا بنا دے

۞

صلوٰۃ و نوافل سے ہو پیار ہم کو
دعاؤں کا ہم کو سلیقہ سکھا دے

قرآنی معارف کا دریا بہا دے
پھر آخرِ شب بھی اُٹھنا سکھا دے

۞

اِلٰہی مطہر بنا دے، تو صالح بنادے
تو اپنی راہِ رضا پہ چلا دے

مقدر ہمارا بہشت بریں ہو
الٰہی تو شیطاں سے ہم کو پناہ دے

۞۞

امن کا گیت (ہندو پاک کی حکومتوں کے نام)

(شاہدہ متین)

آشتی کی چھاگل میں بھر کے پنج آب
چاہتوں بھری چاشنی کٹورہ ہے گلاب
امن کی گگریا میں شربت عناب
پیار کی صراحی میں گنگا کی شراب
آشتی کی چھاگل میں بھر کے پنج آب ۞ لائی ہوں یہ گیت ہند و پاک کی جناب

دھرتی کے بچھڑے بیٹے ملنے کو ترساں
پتھرائی آنکھیں ڈھونڈیں ساعت نایاب
ایٹم کی دوڑ ہے اور زندگی رباب
پوچھتی ہے جنتا کیا امن ہے نایاب
آشتی کی چھاگل میں بھر کے پنج آب ۞ لائی ہوں یہ گیت ہند و پاک کی جناب

مردہ ہوئی روحیں مگر زندہ رہے خواب
درد کی چوکھٹ سے لپٹا رہا بوڑھا شباب
پوچھتی ہے جنتا کتنا لمبا ہے عذاب
امن کی پکار دو ہے یہ کارِ ثواب
آشتی کی چھاگل میں بھر کے پنج آب ۞ لائی ہوں یہ گیت ہندو پاک کی جناب

بھرم انا کا رکھا برسا کے ہم پہ عتاب
خونی جنگوں میں کتنے لٹ گئے سہاگ
ماؤں نے لعل کھوئے اور بچوں نے باپ
بہنیں ویروں کو روئیں آنگن نے کھوئی آب
آشتی کی چھاگل میں بھر کے پنج آب ۞ لائی ہوں یہ گیت ہندو پاک کی جناب

میرے پیارے نہ جانے کہاں کھو گئے؟..........

افریقہ کے گھنے جنگلوں اور صحراؤں میں ستائیس برس گذارنے والے ایک مجاہد کی داستان..........

اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ بیس فٹ کے فاصلے پر ایک لمبا تڑنگا نائیجیرین نوجوان نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں ایک تیز خنجر تھا..........

صحرا کا سورج پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ریت تپ رہی تھی اور راہ بھولے ہوئے اِن تھکے ہوئے پیاسے مسافروں پر آگ برس رہی تھی..........

درویشوں کے حالات............ کیسے محاصرہ ٹوٹا؟

ایک غیر مسلم معزز دوست کی ایک تکلیف میں آسمانی رہنمائی..........

سیالکوٹ کی خواتین نے کیسے تاریخ رقم کی؟..........

اور ایک ایسے عالم کی کہانی پڑھیے جن کے علمی کاموں کا سلسلہ آخری دم تک جاری رہا..........

نوری چادر اوڑھے چھپ گئے وہ کہاں
کتھا ان کی کیسے ہو مجھ سے بیاں
دشت وصحرا و جنگلات میں ہوں سرگرداں
ابدی مسافر کے نقشِ پا ڈھونڈوں کہاں

Tracing the Footprints of My Ancestors

by

Shahida Mateen Sajjad